تمدنِ اسلام

حصہ اوّل

مترجم
محمد حلیم انصاری ردولوی

مصنف
علامہ جرجی زیدان

جس میں اسلامی سلطنت کی یوماً فیوماً وسعت پذیر ترقی کے ساتھ انتظامِ ملکی، مالی اور فوجی کی تاریخ اور اسکے تموّل تمدن اور شان و شوکت کی تفصیل محققانہ طور سے درج ہے

شیخ شوکت علی اینڈ سنز تاجرانِ کتب
بندر روڈ۔ کراچی

قیمت:- آٹھ روپے پچھتر پیسے

طبع اوّل:- شیخ شوکت علی اینڈ سنز کراچی اکتوبر ۱۹۶۴ء

ناشر:- بلقیس اقبال
پروپرائٹر شیخ شوکت علی اینڈ سنز، تاجرانِ کتب، بندر روڈ، کراچی

مطبوعہ
ایجوکیشنل پریس کراچی

فہرست عنوانات تمدن اسلام حصہ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ (مؤلف)

دنیا کی تاریخ میں اسلامی تاریخ کا اہم ہونا مسلّم ہے۔ کیونکہ اس سے وہ تاریخ مراد ہے جو قدیم زمانہ کے حالات کو موجودہ ایام کے حالات سے مسلسل کرتی ہے، اور زمانہ متوسط (مڈل ایجز) میں جو متمدن دنیا گذری ہے اس کے حالات کا پتہ دیتی ہے۔ اسلامی تاریخ قدیم تمدن کا خاتمہ اور جدید تمدن کا دیباچہ ہے۔ نئی تہذیب اور "موجودہ ایام کے تمدن" کی کرنیں اسی تاریخ سے پھوٹی ہیں۔ ہم برسوں سے اس تاریخ کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ اور رسالہ "الہلال" کے کاموں سے فراغت حاصل کرنے کے اوقات اسی کی سیر میں صرف کرتے تھے اس حالت میں جہاں ہمیں کوئی مناسب موقع نظر پڑتا فوراً اسے نوٹ کر لیتے اور فرصت کے منتظر رہتے کہ موقع ملے گا تو اسلامی تمدن پر اس قسم کی ایک مطوّل تاریخ لکھیں گے جو اس کے تمام حالات پر حاوی ہو۔ ہم نے اپنے اس ارادہ کو اس وقت کے پہلے بھی کئی مرتبہ پبلک کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ خدا کے فضل سے ہمارا یہ عزم برابر قائم رہا۔

ہمارا خیال تھا کہ عربی زبان کے پڑھنے والے اگرچہ وہ مختلف مذہبوں اور مشربوں کے ہیں۔ پھر بھی وہ ایک ایسی تاریخ کے محتاج ہیں۔ اس لئے کہ یہ ان کی زبان۔ ان کی قوم اور ان کے ملک کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ان کے آداب اور ان کے عادات کی تاریخ ہے۔ اس لئے ہم موقع بہ موقع اس تاریخ کے متعلق ایسے مضامین کا سلسلہ نکالتے رہے جن کو لوگ شوق کی نگاہ سے دیکھیں۔ اور اس طرح ہم ان کے ذہنوں کو "الہلال" میں اسلامی تاریخ کے ساتھ تعلق رکھنے والے ناول متواتر شائع کرتے رہنے سے اس تاریخ کے مطالعہ کے لئے تیار کرتے رہے

اگرچہ لوگ مختلف طبقوں متفاوت درجات علم وفضل اور عقل وفہم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا تھے، ہماری اس کارروائی کا مبنیٰ اور اصول یہ تھا کہ محض تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں پر بار گذرتا ہے اور خاص کر ہمارے ملک میں کیونکہ یہاں علم وفن کا چرچا کم ہے اور اس کی ترقی گویا ابھی صرف اپنے عہد طفلی میں ہے۔ لہذا ہمارے لئے کوئی طرز ایسا اختیار کرنا ضروری تھا جس کے ذریعہ سے لوگ دلچسپی لیں۔ اور اس غرض کو پورا کرنے کے واسطے ناولوں کا پیرایہ اختیار کرنا سب سے بہتر ذریعہ تھا۔

تمدنی تاریخ کی اہمیت

اسلامی تاریخ کے اس سلسلے میں ہم نے اب تک چھ کڑیاں پوری کی ہیں جن میں اس تاریخ کے اہم واقعات عبداللہ بن زبیر کے قتل تک درج ہیں جس کے بعد سے خلافت کی باگ بے غل وغش عبدالملک بن مروان کے ہاتھ میں آئی اور ہم نے اس بات کو دیکھ لیا ہے کہ عام ناظرین کی طبیعتوں میں اس تاریخ کو وسعت دینے کا شوق اور اسلامی تمدن کی حقیقت معلوم کرنے کا ذوق نشوونما پا رہا ہے نیز اپنے فاضل نامہ نگاروں کے خیالات میں ایک طرح کی بلند پروازی کو بھی معائنہ کر لیا ہے جیسے وہ لوگ اس تمدن کی حالت سے بحث کرتے ہوئے جدید تمدن یورپ کے ساتھ اس کا تعلق دریافت کرنے کے اشتیاق میں عیاں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے اصحاب علم و فضل نے اس معاملہ میں ہم سے خط وکتابت کر کے اس امر کے متعلق ہماری ذاتی رائے دریافت کی ہے، ان امور پر لحاظ کر کے ہمیں مناسب معلوم ہوا کہ الہلال کے دسویں سال کے خاتمہ پر ہم ایک ایسی کتاب شائع کریں جس میں اسی موضوع پر بحث کی گئی ہو۔ اور اس میں اس تمدن کی تاریخ بیان کر کے جدید یوروپین تمدن کے ساتھ اس کا تعلق ظاہر کیا جائے کسی قوم کی اصلی تاریخ اس کے تمدن اور آبادکاری کی تاریخ ہوا کرتی ہے۔ نہ کہ اس کے جنگی کارناموں اور فتوحات کی جس امر کی اسلامی تاریخ لکھتے ہوئے عرب مورخوں کو خصوصاً عادت پڑ گئی ہے وہ صرف واقعات کو جیسے کا تیسا بیان کر دیتے ہیں اور ایسے اسباب کی جانب بہت کم اشارہ کرتے ہیں جن سے ان واقعات کا باہمی تعلق سمجھ میں آ سکے اور ایک دوسرے سے مرتبط ہو سکیں، تا کہ عقل ان کی علت دریافت کر سکے اس میں غور کر سکے اور سب سے بڑھکر اس قسم کی حقیقت سمجھ میں آ سکے مگر ہم انھیں اس بارے میں معذور بھی سمجھتے ہیں۔ ان بیچاروں کو جیسا موقع ملتا تھا اور

جس حالت کے مطابق لکھنا پڑتا تھا اُس میں ایک بڑی دقت یہ تھی کہ ان کو واقعات کے اسباب پر غور کرنے سے پہلو تہی کرنا پڑتا تھا۔ اور اکثر اوقات وہ کسی ایک جانب کی طرفداری کرتے ہوئے لکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ یا ممکن ہے اُنھیں کوئی اور عذر بھی ہو تا رہا ہو۔

بہر حال آج ان معاملات پر غور کرنے سے ہمیں کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ بہت سے مشرقی علماء اور یوروپین عالموں نے اس مضمون پر تصانیف کرنے کا قصد کیا ہے۔ لیکن ان کو مسلمانوں کی لکھی ہوئی تواریخ میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکی جو ان کی آتش شوق کو فرو کر دیتی۔ کیونکہ ایسی باتیں اگر ان کتابوں میں ہیں بھی تو پراگندہ طور پر واقع ہیں اور دشواری سے ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے جب گزشتہ سال ہم نے اپنا یہ خیال شائع کیا تو یوروپین علماء کے ایک گروہ نے ایسے سخت کام کے لئے ہمارے مستعد ہو جانے پر بہت مسرت ظاہر کی تھی اور حق یہ ہے کہ گو ہم نے ارادہ کا اظہار کر دیا تھا، لیکن باوجود بے حد تلاش و جستجو کے خود ہمیں بھی یہ اُمید نہ تھی کہ ایسے سخت مضمون کے متعلق ہم کو اس قدر مصالح مل جائے گا جو (۶۰۰) صفحوں پر بھی لکھا جا سکے کیونکہ ضمیمہ سال دہم کی ضخامت اتنی ہی ہوتی تھی۔ مگر ہم نے کمر ہمت باندھ کر تا امکان کوشش کی اور اہل عرب کی لکھی ہوئی تاریخی، سیاسی، اور دیگر علوم کی کتابیں دیکھنی شروع کیں جو ہم کو مطبوعہ اور قلمی دستیاب ہو سکیں۔

تمدنی تاریخ کے ماخذ

تاریخ فتوح اور تقادیم کی کتابوں میں سے ابن اثیر، ابن خلدون، ابن خلکان، مقریزی، بلاذری، ابی الفدا، تاریخ خمیس، مسعودی، مقری، فخری، سیوطی، ابن خرداذبہ، یاقوت اور اصطخری وغیرہ لوگوں کی کتابیں مطالعہ کیں۔ ادب میں آغانی، عقد الفرید، ابن عبدربہ، کشکول، مستطرف اور سراج الملوک وغیرہ کتابوں پر نظر ڈالی۔ تفسیر و حدیث اور فقہ کے متعلق تفسیر رازی، تفسیر زمخشری صحیح بخاری، مشکوٰۃ المصابیح اور ہدایہ وغیرہ کتابوں کی سیر کی، ملکی اور مالی انتظام کی کتابوں میں سے ابو یوسف کی کتاب الخراج۔ قدامۃ بن جعفر کی کتاب الخراج۔ وصنعۃ الکتابتہ، ماوردی کے احکام السلطانیہ، ملک سعید کی عقد الفرید، اور ابن خلدون کا مقدمہ وغیرہ، اس کے علاوہ بہت سی کتابیں دیکھیں جو مذکورہ مضامین کی ہیں، جن کے دیکھنے والے

کو اس بات کا وہم و گمان بھی نہ ہو کہ وہ ان سے اس مضمون کے متعلق کوئی فائدہ اخذ کر سکے گا اور ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ان کتابوں میں ہمیں بہت سی مفید باتیں دستیاب ہوئیں۔ ان کتابوں میں سے چند یہ ہیں۔ حیوٰۃ الحیوان مصنفہ دمیری۔ عجائب المخلوقات مصنفہ قزوینی اور ان کے علاوہ معجمات اور فہرستوں کی دوسری کتابیں مثلاً تھانوی کی کتاب، کشاف اصطلاحات الفنون[1] اور کتاب کشف الظنون، کلیات ابی البقاء وغیرہ، کتابیں صرف عربی زبان میں ہیں۔

مغربی کتب

اس کے علاوہ ہم نے مؤلفین یورپ کی بھی وہ تمام کتابیں پڑھیں جو اسلام، اسلام کی تاریخ اور اس کے آداب پر انگریزی فرانسیسی یا جرمن زبان میں لکھی گئی تھیں اور ہمیں دستیاب ہو سکیں۔ مثلاً فرانس کے عالم لیبون کی کتاب تمدن عرب پر، لیبو کی تاریخ سلطنت رومانیہ شرقیہ؟ فرانس کے مشہور رسالہ "ایشیا" کے مضامین تمدن مشرق کے بیان میں، فون کومر کی کتاب جرمنی زبان میں میکس مولر علامہ جرمنی کی کتاب تاریخ الاسلام اسٹینلی لین پول انگریزی کی تصنیف دول اسلامیہ کے بیان میں اور گبن کی روم ایمپائر وغیرہ۔

تمدن اسلام کی جامع تاریخ

غرضکہ مختلف زبانوں اور مضامین کی عام لغتوں اور اخباروں کے علاوہ عربی اور یوروپین زبانوں کی جو کتابیں ہم نے مطالعہ کی ہیں ان کی تعداد دو سو جلدوں سے زائد ہے اور یہ سب اس مواد کے علاوہ ہے جو برسوں مشرق کی تاریخ دیکھتے رہنے سے ہمارے ذہن میں جمع ہو رہا تھا۔ ان امور کے بعد ہم کو اس قدر سرمایہ بہم پہنچ گیا جو اس عجیب تمدن کے سیاسی، انتظامی، علمی، ادبی اور اخلاقی پہلوؤں سے فلسفیانہ بحث کرتے ہوئے مطلوبہ کتاب کے ایسے کئی حصے پُر کر دے۔ پس ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اس موضوع کو ہم کئی حصوں تقسیم کر دیں جن میں سے پہلا حصہ اس وقت شائع کریں اور باقی حصوں کو انشاء اللہ آئندہ الہلال کے سالانہ تمموں کی شکل میں شائع کرتے رہیں۔

---

[1] یہ کتاب ہندوستان کے ایک عالم مولوی شیخ محمد تھانوی کی تصنیف ہے جو بارھویں صدی ہجری میں گذرے ہیں اور اس کو ایشیاٹک سوسائٹی بنگ

پہلے حصے کے مضامین

پس یہ کتاب کا پہلا حصہ اور آئندہ حصوں کی بنیاد ہے۔ ہم نے اس کو تمہیدی مقدمات سے شروع کیا ہے جن میں عرب اور تمدنِ اسلام سے پہلے عرب کی حالت اور اُن کا کچھ عرصہ قبل از اسلام ترقی کے لئے آمادہ ہوتے جانا۔ زمانہ جاہلیت کا طرزِ حکومت۔ آغاز دعوت اسلام تک کعبہ اور قریش کا حال۔ پھر ظہورِ اسلام۔ اس کی اشاعت۔ اسلامی فتوحات۔ دولت بنی امیہ وعباسیہ کا قیام اور ان کے بعد اُندلس کی اور پھر بنو فاطمہ کی حکومتوں کا قائم ہونا وغیرہ تمام باتیں بیان کردی ہیں اور ان پر ایک کھوٹا کھرا پرکھنے والے شخص کی طرح نظر کی ہے۔ ہم نے کوئی حادثہ یا واقعہ ایسا نہیں لکھا جس کے اسباب اور وجوہات کو نمایاں طور پر نہ دکھایا ہو اور پھر اُن سے کوئی نتیجہ نہ نکالا ہو۔ بلکہ اس کے بعد ہونے والے واقعہ سے اس کا تعلق بھی عیاں نہ کردیا ہو۔ خصوصاً اس بات کے بیان کرنے پر ہم نے بہت زور دیا ہے جس نے روم وفارس کی زبردست عظیم الشان سلطنتیں فتح کرلینے پر اہلِ عرب کو جرأت دلائی، ان کی ہمت بندھائی اور اعانت کی۔ باوجودیکہ وہ بہت قلیل التعداد اور بالکل بے سروسامان تھے۔ یہ اس قسم کی فلسفیانہ بحث ہے جسے ہماری دانست میں اب تک کسی شخص نے کسی زبان میں پوری طرح بیان نہیں کیا۔ تصانیف فرنگ میں اس کے متعلق کہیں کہیں کچھ نظر آتا بھی ہے تو وہ نہایت مختصر اور غیر تسلی بخش ہے مگر ہم اس بارے میں یوروپین مصنفوں کو الزام دینا نہیں چاہتے کیونکہ یہ مضمون اُن کی رسائی فہم اور پرواز خیالات سے بالاتر ہے۔ اسے نہ ان کے مذہب سے کوئی علاقہ ہے نہ ان کے حالات و آدابِ تاریخ کے ساتھ کوئی لگاؤ۔ اور جو ذرا ظہور تعلق ہے تو وہ نہ ہونے کے برابر، البتہ خود ہم ہی قابلِ ملامت ہیں کیونکہ یہ زبان ہماری مادری زبان تھی۔ اس پر بھی اہلِ یوروپ ہماری قوم اور ہمارے بلاد اور آدابِ اخلاق کی تاریخ سے بحث کرنے میں سبقت لے گئے۔

مذکورہ بالا مقدمات کے بعد ہم نے اسلامی سلطنت کے کمال اور عروج کے زمانہ میں اس کی حالت پر غور کیا ہے اس کی تعداد و مقدار بیان کی ہے۔ اسلامی حکومت اور اس کی مصلحتوں (کاروباری شعبوں اور اس بات پر نظر ڈالی ہے کہ اس کی بنیاد کیونکر پڑی؛

پھر مختلف ضرورتوں کی وجہ سے اس کے کاروبار میں بہت سی شاخیں کیونکر پیدا ہوئیں مثلاً خلافت اور اس کے توابع، وزارت: ولایت اعمال، بیت المال (خزانہ عامرہ) فوج اور تمام دفاتر ملکی و مالی۔ اس کے بعد ہم نے ان تمام صیغوں اور محکموں کی تاریخ بیان کی ہے اور ان کی فروعات و ملحقات کا ذکر کیا ہے۔

تاریخی واقعات کی تحقیق

واقعی امر یہ ہے کہ اس تاریخ کی خاطر تصانیف عرب کی چھان بین میں ہم نے جیسی دقت و زحمت اُٹھائی ہمارا ہی جی خوب جانتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ہم نے بڑی بڑی ضخیم کتابیں تمام و کمال دیکھ ڈالی ہیں اور ان میں سے ہمیں اپنے مفید مطلب صرف ایک یا دو فقرے ملے ہیں۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ بغیر دو یا تین جلدیں دیکھ چکنے کے صرف ایک بات بھی پوری نہیں ہوئی ہے۔

تاریخی تحقیق کی مثال

مثلاً جب ہم نے اسلامی حکومت کے اندر ولایت اعمال اور عہدہ قضاء کی تاریخ لکھی تو اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ بھی ارادہ ہوا کہ خلفائے راشدین کے عہد میں عاملوں اور قاضیوں کی تنخواہوں کی شرح بھی بیان کر دیں۔ اس کے متعلق کتاب فتوح البلدان بلاذری میں ہم کو اتنی عبارت ملی کہ عمر بن الخطاب رضؓ نے عمار بن یاسر کو شہر کوفہ کی فوج کا افسر اور وہاں کے مسلمانوں کی نماز کا امام مقرر کیا تھا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کو وہاں کا قاضی اور ناظر بیت المال بنایا تھا۔ اور عثمان بن حنیف کو پیمائش اراضی کا مہتمم قرار دیا الخ۔ لیکن مصنف نے یہ نہیں لکھا کہ ان لوگوں کی تنخواہیں کیا تھیں۔ اس کے بعد ہم نے طرطوشی کی کتاب سراج الملوک کے اس باب میں جس میں اس نے یہ بیان کیا ہے کہ سلطان وقت بیت المال میں سے کن طریقوں پر خرچ کرتا تھا، اور عاملوں کا کیا اصول تھا، دیکھا کہ عمر بن الخطابؓ نے سب سے اوّل عمارؓ کو ولایت کوفہ کا حاکم بنانے وقت عاملوں کی تنخواہ کی شرح مقرر کی۔ اس سے

قبل خلیفہ ممدوح نے کسی حاکم یا افسر کی کچھ تنخواہ متعین نہیں فرمائی تھی۔ خلیفہ موصوف نے عمار رضؓ کا مشاہرہ چھ سو درم قرار دیا اور ان کے ماتحت حکام محرروں اور موذنوں کی تنخواہیں علیحدہ علیحدہ قرار دیں؛ اور عبداللہ بن مسعودؓ کا وظیفہ سو درم ماہوار متعین فرمایا الخ۔ مگر مصنف مذکور نے اس مقام پر نہ عمار کا منصب بیان کیا ہے؛ اور نہ یہ بتایا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کا کیا عہدہ تھا؛ لیکن ہم نے فتوح البلدان اور سراج الملوک دونوں کتابوں کی روایتیں یکجا کر کے اُن سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فوج کے افسر اور امام نماز کی تنخواہ عمرؓ کے عہد میں چھ سو درم ماہوار تھی اور قاضی کا مشاہرہ سو درم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر قرائن سے اس بات کا سراغ لگا یا کہ عمارؓ عمرؓ کی طرف سے کوفہ کے عامل مقرر ہوئے تھے پھر ان سب اُمور میں باہم مطابقت دینے سے ثابت ہو گیا کہ عمرؓ کے عہد میں عامل کی تنخواہ چھ سو درم ماہوار تھی اور قاضی کی سو درم ماہوا۔ اسی پر اندازہ کرنا چاہیئے کہ کتنی دقتوں سے ایک ایک ذرا سی بات کا پتہ ملا ہوگا۔

دوسرا حصہ دوسرے حصہ میں ہم اسلامی سلطنت کی دولت مندی اور اس کی رعایا کی خوشحالی اور خوشباشی کا ذکر کریں گے۔ اور یہ بات دکھائیں گے کہ اسلامی سلطنت کے تعلقات اپنی ہمعصر مملکتوں کے ساتھ کیسے تھے۔ خلفا کی مجالس و بزم اور مشاغل تفریح کے حالات علم اور علماء شعر اور شعرا کے ساتھ اُن کا اہتمام۔ دربارداری کے اصول اور حاضری دربار کے طریقے؛ ان کے محلات اور حریم، ان کی شان و شوکت، سواری کا جلوس اُن کی ضیافت اور سخاوت کا ذکر۔ اسلامی عمارتیں اور اسلامی شہروں کا حال یہ سب باتیں بیان کریں گے۔

تیسرا حصہ علوم و آداب اور شعر و صناعت کے بیان میں ہوگا جس میں یہ دکھایا جائے گا کہ اسلام سے قبل ممالک شام و عراق میں ان چیزوں کی کیا حالت تھی۔ اور مسلمانوں نے اس میں کیا ترقی کی؛ اس ترقی کی تاریخ اور مقدار وغیرہ سب کا ذکر ہوگا؛

چوتھا حصہ اس میں اس زمانہ روشن کے آداب معاشرت سے مناسب موقع بحث

کی جائے گی ؛ پھر اسلامی تمدن کے ساتھ جدید یورپی تمدن کا تعلق بیان کرکے یہ بحث انشاءاللہ ختم کردی جائے گی اور اسلامی تمدن کے آثار کا سابقہ حصوں میں بہ تفصیل ذکر ہو چکنے کے بعد اس بارہ میں جو کچھ لکھا جائے گا وہ بہت صاف اور واضح ہوگا۔

یہاں تک ہم نے جس قدر امور بیان کئے ہیں ان سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ مضمون زیر بحث نہایت دشوار اور ٹیڑھا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تصنیف و تالیف کی دنیا میں ایک نیا کام ہے۔ حالانکہ اس معاملہ میں خود ہم بہت ہی قاصر ہیں ؛ یہ تمہید اس معذرت کی بنا ہے جو اس کتاب میں نقائص واقع ہونے پر بالآخر ہم کو پیش کرنی ہوگی لہذا تمام اہل فضل و کمال حضرات سے ہم اس بات کی درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات اور آراء سے ہماری امداد فرماویں تاکہ ہم آئندہ حصوں میں ان سے انشاءاللہ فائدہ اُٹھائیں ؛

تمہیدی مقامات

کسی قوم کے تمدن سے بحث کرتے وقت اُس کی عظمت، ثروت اور ملکی وسعت پر بھی غور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ نیز یہ بیان کرنا پڑتا ہے کہ شہری زندگی کے اسباب و نتائج میں سے کن چیزوں نے اس کے تمدن کا ساتھ دیا تھا۔ اس میں علم و ادب اور صنعت و حرفت اور اس کے لوازمات مثلاً مدرسوں، مکتبوں اور انجمنوں کی تاریخ، سلطنت کے حالات کا مفصل بیان، اس کے مناصب اور وہ اسباب جن سے یہ سلطنت خوشحالی کی انتہا کو پہنچی۔ اور اس بات کا بیان کہ اس کے طرز معاشرت میں اُس کا کیا اثر تھا، سب امور کو ذکر کرنا ہوتا ہے اور پھر یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس قوم کے حالات اور طرزِ معاشرت بیان کرتے ہوئے ان باتوں کی نسبت ان کے اسباب و بواعث کی طرف کی گئی ہو۔

اس کے علاوہ جب تک اس قوم کے زمانہ بداوت (وحشت) کے حالات مع اس امر کے بیان نہ کردیئے جائیں کہ وہ شہری زندگی کی جانب کس طرح بڑھی؛ اور اس ترقی کے اسباب کیا تھے جنھوں نے اس امر میں اُس کی مدد کی؛ اس وقت تک اس تمدن کا بیان پورے طور پر واضح نہیں ہو سکتا۔ یہ بحث یوں تو عام طور پر ضروری ہے؛ مگر اسلامی تمدن کی تاریخ میں خاص طور پر اس کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں چند خاص اسباب اور ذریعے ایسے موجود ہیں جن کا وجود دوسری قوموں کے تمدن میں نہیں ہے۔

بنا بریں ہم کو سوا اس کے کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ ہم اس کتاب کو چند تمہیدی مقدمات سے شروع کریں جن میں اسلام سے قبل عرب کی حالت اور تمدن کے ساتھ ان کی مناسبت اور جو امور اس قوم کے حالات سے اسلامی دعوت کے قبل گزرے، ان سب کا مفصل بیان ہو، ساتھ ہی یہ امر بھی دکھایا جائے کہ اسلامی دعوت کے ظاہر ہونے کے وقت جزیرہ نمائے عرب کی کیا کیفیت تھی۔ روم اور فارس کے باشندے ان دنوں کس رنگ میں تھے اور وہ کونسی بات تھی جس نے اہل عرب کو باوجود قلیل المقدار اور بے سروسامان ہونے کے ان سلطنتوں کو فتح کر لینے میں امداد پہنچائی۔ اسلامی سلطنت کس طرح قائم ہوئی اور اس نے خلفائے راشدین کے زمانہ میں دینی حیثیت رکھنے کے ساتھ بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں دنیوی حکومت اور سیاسی حالت کی طرف کیونکر ترقی کی؛ اس بحث سے فراغت پاکر ہم ان شاء اللہ اسلامی حکومت کی وسعت اور اس کے کاروبار کی تاریخ پر گفتگو کریں گے۔ لہٰذا ہم تمہیدی مقدمات کو آغاز کرتے ہیں۔:

عَرب اور تمدّن

بعض یوروپین وقائع نگاروں کا بیان ہے کہ عرب والوں کو اسلامی تمدن قائم کرنے کے بارے میں کوئی فضیلت نہیں حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے اس تمدن کی بنیاد رومانی (یونانی) اور فارسی تمدن کے کھنڈروں پر قائم کی تھی۔ ان لوگوں کی رائے میں اسلامی تمدن سے وہ تمدن مراد ہے جو مذکورہ بالا دونوں قوموں کی تمدنوں سے مل ملا کر ایک عطر مجموعہ کی صورت میں بنا لیا گیا۔ اور ضرورت وقت کے لحاظ سے اُن میں کسی قدر تغیر اور تبدّل بھی کر دیا گیا۔

ان کا قول ہے کہ اہل عرب اپنی اصل فطرت کے لحاظ سے شہری زندگی سے دور پڑے تھے۔ وہ لوگ اپنے اس قول کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اہل عرب نے جاہلیت اور اسلام کے زمانوں میں اپنی جانب سے خود کسی تمدن کی بنیاد نہیں قائم کی۔ لیکن ہمارے نزدیک عرب والے دوسری قوموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ کاروبار کو فروغ دیتے اور ملک کا انتظام کرنے کی استعداد رکھتے تھے۔ وہ ان قوموں سے کسی طرح کم نہ تھے، جنھوں نے قدیم یا جدید زمانہ کے اندر تمدن میں ترقی کی ہے۔ اور اس بات کی تمہید میں ہمارا حسب ذیل بیان قابل غور ہے۔

عرب کے دو بڑے قبائل

جزیرہ عرب کے باشندے دو بڑی قسموں پر منقسم ہیں۔

(۱) قحطانی یعنی ملک یمن اور اس کے آس پاس کے رہنے والے جو اپنا نسب قحطان یا یقطان سے ملاتے ہیں، اور یہ سلسلہ نسب ارفخشاد کے ذریعہ سے سام بن نوح پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

(۲) اسمٰعیلی یا عدنانی: یہ لوگ حجاز، نجد، اور ان کے قرب وجوار کے باشندے ہیں۔ اور اپنے نسب کا سلسلہ ابراہیم خلیل اللہ کے بیٹے اسمٰعیل سے ملاتے ہیں جو "بی بی ہاجرہ" کے بطن سے تھے۔ ان لوگوں کو عدنانی بھی کہتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اجداد میں

ایک شخص عدنان گزرے ہیں۔ اور اسی قسم کی وجہوں سے ان کو مُضری اور معدی بھی کہا جاتا ہے۔ اس دوسری قسم کے لوگ زیادہ تر جزیرہ عرب کے اس حصہ میں سکونت رکھتے تھے جو بالکل بے آب و گیا ہے اور وسطِ ملک میں واقع ہے۔

قحطانی عربوں نے اسمٰعیلی عربوں سے بہت پہلے تمدن میں اپنی ترقی عیاں کی تھی اس لئے کہ بہ نسبت اسماعیلی عربوں کے ان کا ملک سرسبز اور شاداب زمینوں سے قریب تھا۔ قحطانیوں کی یہاں قدیم زمانہ میں بہت سی حکومتیں قائم ہوئیں جو فراعنہ مصر اور شاہان بابل و اشور کی معاصر تھیں، اُن میں سب سے زیادہ مشہور حمیر کہلان اور سبا کی حکومتیں ہوئی ہیں جن کے نامور شہر مآرب صنعا اور سبا وغیرہ تھے۔

اسمٰعیلی عربوں کی بھی ولادت مسیح سے قبل اور بعد میں کئی نامور حکومتیں گذر چکی ہیں۔ مثلاً فلسطین کے اطراف میں نبطی حکومت اس کے علاوہ اُن متمدن قوموں کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے جو بائدہ عرب کے گروہ میں نہایت اعلےٰ ترقی کر چکی ہیں۔ مثلاً عاد، ثمود، طلسم اور جدیس وغیرہ ان قوموں کے کاروباری فروغ کا عہد اقوامِ عرب میں سب سے قدیم ہے اور ان کا نسب غالباً لاوذ بن سام بن نوح سے ملتا ہے۔ نیز عمالقہ کا مشہور و پر شوکت اور صاحبِ طاقت گھرانہ بھی ان ہی بائدہ عرب کے زمرہ میں سے تھا جن کا ذکر قدیم تاریخ میں پایا جاتا ہے اور اس کا مفصل بیان سالِ پنجم کے الہلال نمبر ۲۰ میں بھی کیا گیا ہے۔

عرب کی تجارتی اہمیت

اس تمہید کے بعد یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اسلامی تمدن اہلِ عرب کے کاروباری فروغ دکھانے کا نیا زمانہ نہیں تھا؛ بلکہ اس سے قبل بنو حمیر، کہلان اور سبا کے خاندان بھی ممالک مشرق اور مغرب کے مابین عقدِ تجارت کا واسطہ رہ چکے ہیں، کیونکہ یمن کا ملک اس زمانہ کے متمدن ممالک کے وسط میں واقع ہوا تھا۔ ہندوستان کا تجارتی مال بحرِ ہند کی راہ سے یمن اور حضرموت کو جایا کرتا تھا اور یمن کے لوگ اسے حبش، مصر اور فنیقیہ کو لے جاتے تھے، بلکہ اس سے بھی آگے؛ ادومی، عمالقہ، اور مدینی قوموں تک پہنچاتے تھے، اور بلادِ عرب میں بھی اس کی تجارت کرتے تھے؛ اسمٰعیلی عربوں نے آباد دنیا کے انتہائی کناروں تک

خشکی کے راستے اپنی تجارت کا سلسلہ بڑھا رکھا تھا اور وہ اس زمانہ کے آباد ملکوں میں عقدِ تجارت کا واسطہ بنے ہوئے تھے۔

عربی کی مرکزی حیثیت

علاوہ اس کے کہ عرب کا ملک ان دونوں کے متمدّن ملکوں کے وسط میں واقع تھا تجارت کے کاروبار بڑھانے اور تمام ممالک سے تجارتی رابطہ پیدا کرلینے میں اہلِ عرب کو اس بات نے اور بھی مدد پہنچائی کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جو اس عہد کی اکثر متمدن قوموں کی زبانوں سے مشابہ تھی۔ اس لئے کہ ان دنوں سامی زبانیں تلفظ اور معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ تقریباً ملی ہوئی تھیں، گویا کہ عربی، کلدانی، اشوری، عبرانی، حبشی، اور فنیقی لوگ اُن ایّام میں بلاکسی ترجمان کے باہم گفتگو کرسکتے۔ اور ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے تھے، اس لیے کہ ان کو ایک اصل زبان سے نکل کر الگ الگ زبانیں بنے ہوئے بہت کم مدّت گذری تھی اور ان کی وہی حالت تھی جو آج کل کی بازاری عربی اور فصیح زبان عرب کی ہے کہ ان میں نسبتاً بہت تفاوت نہیں۔ اسی وجہ سے اگر کوئی عرب قبیلہ حمیر یا مضر کا ملکِ عراق میں وارد ہوتا تو اس کو کلدانی۔ بابلی اور اشوری لوگوں سے بات چیت کرنے میں کسی ترجمان کی حاجت نہ ہوتی تھی اور اسی طرح جب وہ فنیقیہ یا حبشہ میں داخل ہوتا تو وہاں کے باشندوں کی زبانیں بھی بخوبی سمجھ لیتا۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ اس زمانہ میں ملکِ شام کا رہنے والا آدمی مصر والوں کی زبان بہت خوبی سے سمجھتا ہے اور ہم اپنے اس بیان کی تائید میں وہ واقعہ پیش کرتے ہیں جو کتابِ مقدس توراۃ میں حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی بابت مذکور ہے۔ کہ آپ ولادت مسیح سے تقریباً دو ہزار سال قبل کلدان کے ملک سے نکل کر سوریا فنیقیہ اور عرب کے ملکوں میں سیر کرتے پھرے، وہاں کے لوگوں سے ملے اور ان میں رہے۔ لیکن اُنھیں وہاں کے رہنے والوں سے بات چیت کرنے میں کسی ترجمان کی حاجت نہ ہوئی۔ اور اسی طرح پندرھویں صدی قبل مسیح کے قریب

بنی اسرائیل اپنی بیابان نوردی کی حالت میں چالیس برس تک جزیرہ عرب کے بالائی حصوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ مگر ان کو بھی وہاں کے رہنے والوں سے گفتگو کرنے میں کسی ترجمان کی ضرورت نہ پڑی۔

عربوں کی نسلی قابلیت

اب یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اہلِ عرب اصل فطرت اور نسب کے اعتبار سے بھی حضارت اور تمدن کے اہل تھے۔ اس لیے کہ وہ اشوریوں، کلدانیوں، فینیقیوں کے بھائی اور ہم نسل تھے۔ اور ان کو بھی وہ اہلیت و استعداد حاصل تھی جو ان قوموں کو حاصل تھی، مگر بات صرف اتنی ہے کہ اقوامِ مذکورہ کے لوگ ایسے ملکوں میں آباد ہوئے جو زرخیز اور سیر حاصل تھے۔ اور اہلِ عرب نے اس قسم کے جزیرہ میں سکونت اختیار کی جس کے اکثر حصے ریگستانی اور بے آب و گیاہ تھے، نہ ان میں نہریں تھیں اور نہ بہتے ہوئے چشمے، وہ صرف مینہ کے پانی سے سیراب ہوتے تھے، اور اہلِ عرب کے دوسرے بھائی اشوری لوگوں نے عراق کے ملک میں وطن بنایا جو تمام روئے زمین کے ممالک میں سب سے زیادہ سرسبز اور زرخیز ملک ہے۔ یہاں تک کہ ملک مصر سے بھی اس کا نمبر بڑھا ہوا ہے اس وجہ سے اُن کی دولت مندی بڑھی اور مال و دولت ان کی مخفی قوتوں کو ابھار کر ان کی عقل و فہم کو بارآور کر دیا۔ ظہورِ اسلام کے بعد جب اہلِ عرب کو اس سرسبز وادی (عراق) میں بود و باش کا موقع ملا تو ان کا تمدن بھی اپنے اگلوں (اشور والوں) سے ہرگز کم نہیں رہا۔

عربوں کی قدیم تاریخ

ان سب باتوں کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ عرب والوں نے کسی ایسی بات میں جس کی توقع جزیرہ عرب کے باشندوں سے ہو سکتی تھی کوئی کمی نہیں کی۔ صرف یمن والوں کا تمدن اس قسم کا مشہور تمدن گذرا ہے جس کے آثار آج تک حضرموت۔ مہرۃ اور یمن کے ملکوں میں ریت کے ڈھیروں کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ عاد، ثمود، اور بائدہ عرب کے دوسرے قبائل کا تمدن جو نہایت اعلےٰ درجہ کا تمدن تھا اس سے ہم

اسلئے بحث نہیں کرتے کہ ان کی تاریخ اور خبروں میں سے ہمارے پاس بجز ان قصص وحکایات کے جن کو اہلِ عرب نے اِن قبائل کی بنائی ہوئی شاندار عمارتوں کے متعلق روایت کیا ہے اور کوئی مواد موجود نہیں ہے اور وہ قصے بھی خارج از بحث ہونے کی وجہ سے آج ہمارے نزدیک خرافات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر ایک قصہ وہ ہے جسے عرب والے شہر ارم ذات العماد کی نسبت یوں بیان کرتے ہیں۔

شدّاد کا قصّہ

شدّاد بن عاد نے احقاف کی سرزمین کے ایک قطعہ اراضی میں جس کی مساحت دس فرسخ (۳۰) میل مربع تھی ایک شہر تعمیر کرایا تھا۔ اس کی شہر پناہ کی دیواریں ملک یمن کے عقیق پتھر سے بنائی گئی تھیں اور ان کے اوپر تمام چاندی کے پترے منڈھے گئے تھے جن پر سنہری گنگا جمنی بیل بوٹے منقوش تھے، اس شہر کے اندر ایک ہزار محل بنے ہوتے تھے اور ہر ایک محل زبرجد اور یاقوت کے سو سو گز بلند ستونوں پر قائم تھا۔ شہر کے وسط میں متعدد نہریں جاری کی گئی تھیں، اور ان نہروں میں سے چھوٹی چھوٹی نالیاں نکال کر قصروں اور محلوں میں پہنچائی گئی تھیں۔ اس شہر کی مٹی مشک و عنبر اور وہاں کی کنکریاں سونے کے ٹکڑے اور یاقوت اور زبرجد وغیرہ جواہرات تھے۔ اس کے علاوہ اسی قسم کی اور باتیں بھی مروی ہیں جو احتمال کے قاعدہ سے باہر ہیں۔ تاہم یہ تمام باتیں کچھ نہ کچھ اصلیت کی جھلک ضرور دکھاتی ہیں، اگرچہ ہم ان کو لاکھ درجہ بے اصل و بے حقیقت سمجھیں پھر بھی ہم انھیں اس درجہ سے ہرگز نہیں گرا سکتے کہ قوم عاد کی بعض عمارتیں مرصع رہی ہوں اور ان کی کسی نہ کسی دیوار یا ستونوں میں بیش قیمت جواہرات سے پچی کاری کی گئی ہو، کیونکہ یہ صورت شان و شوکت دکھانے کی انتہائی حد ہے، اور تمدن کے زمانے کے علاوہ کسی اور وقت میں یہ بات ممکن نہ تھی۔

سبا اور حمیر کے آثار

قحطانی عربوں کے مشہور خاندان حمیر سبا اور کہلان

ہیں جن کا ذکر اوپر بھی ہو چکا۔ ان حکومتوں کا زمانہ عاد اور ثمود کے ایام سے متصل گذرا ہے اور سیاح لوگوں نے ان کے کچھ آثار کا پتہ بھی لگایا ہے جو اکثر صنعا، عدن اور حضر موت کی قدیم عمارتوں کے کھنڈر ہیں جن کے اندر مسند حمیری خط میں لکھی ہوئی تختیاں برآمد ہوئی ہیں، ان پر اکثر دینی دعاؤں کی عبارتیں یا اسی طرح کی اور باتیں منقوش ہیں، مگر محققین کو ابھی تک ان عظیم الشان دفینوں کے نکالنے پر قدرت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ جو وسط ملک کے اندر مدفون ہیں۔ کیونکہ وہاں تک کسی کی رسائی دشوار ہے۔ یہ تمام باتیں اُن شہادتوں کے علاوہ ہیں جن کو عرب مؤرخین نے ان سلطنتوں کے جاہ و جلال کے باب میں نقل کیا ہے۔ گو اسلام سے بہت پیشتر یہ حکومتیں مٹ چکی تھیں لیکن اُس زمانہ تک ان کے قصے بہت کچھ مشہور و معروف تھے اور ان حکایتوں سے اس قسم کے ایک تمدن کا سراغ ملتا ہے۔ جو اشور، مصر اور فنیقیہ والوں کے تمدن سے ملتا ہے کسی طرح کم نہیں تھا

یمن کا قدیم تمدن

ان قوموں نے شہر آباد کئے، محل اور قصر بنوائے، باغ لگائے، بت تراشی کی، صنعت کو فروغ دیا، کانیں کھودیں، فوجی نظم و تربیت قائم کی۔ ممالک فتح کئے، اور تجارت کے کاروبار کو بڑھایا، غرضکہ تمدن کی تاریخ میں بہت خوبی کے ساتھ حصہ لیا اور کاروباری زندگی کا نمونہ دکھا کر اپنے تئیں قابل تمدن ثابت کر دکھایا۔ یونان کے مشہور سیاح ہیروڈوٹس نے ولادت مسیح سے پانچسو سال قبل ان قوموں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ملک عرب کے صرف جنوبی حصہ میں بخورات، مُر، قرفہ، دارچینی، اور لادن وغیرہ چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اور سیاح مذکور کا بیان ہے کہ وہ ملک اپنے زمانہ کے تمام دوسرے ملکوں سے زیادہ مالدار تھا۔

سد مآرب کا حال

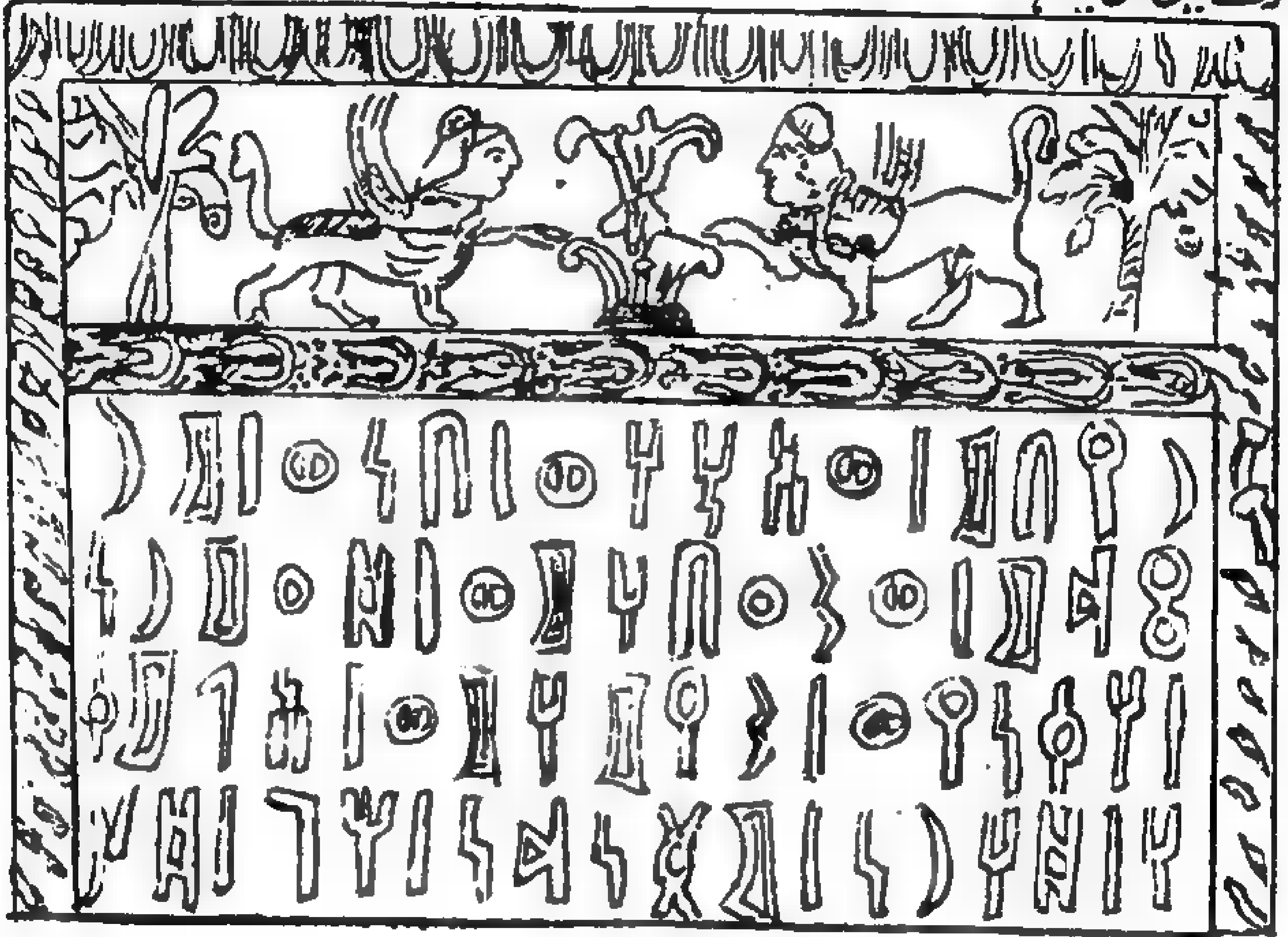
یمنی عربوں کے ان کارناموں میں جن کے ذکر سے تاریخ کے صفحے بھرے پڑے ہیں اور جن کو فن تعمیر کے عجائبات میں شمار کرتے ہیں، وہ مشہور بند بھی ہے، جس کو سد مآرب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عرب والوں نے ولادت مسیح سے تقریباً دو صدی قبل اس بند کو ایسے طریق سے تعمیر کیا تھا جس طرح پر کہ محمد علی پاشا حاکم مصر نے ڈیلٹا کے سر پر قناطر خیریہ تعمیر کرائے تھے۔ ان پلوں اور اس بند میں

صرف اس قدر فرق تھا کہ ان کے اندر در بنائے گئے ہیں اور وہ بند بے در تھا۔ اس کی صورت مثل ایک دیوار کے تھی جو دو پہاڑوں کے مابین قائم کی گئی تھی اور اس پانی کو روکنے کا کام دیتی تھی جو ان پہاڑوں کے بیچ میں بہتا تھا وہ پانی اس بند کے ذریعہ سے بلند ہو کر دونوں پہاڑوں کی چوٹیوں کو ان کے انتہائی سروں تک سیراب کر دیتا تھا مورخین کا بیان ہے کہ یہ بند ایک فرسخ لمبا اور ایک فرسخ چوڑا ۹ میل مربع بنایا گیا تھا۔ اور اہلِ عرب نے اس کے اندر بہت سی شاخیں اور نہریں بھی تعمیر کی تھیں۔ اس بند سے ستر وادیوں کو لا کر ملا دیا تھا جن کا سب پانی آ کر ایک دوسرے سے ملتا اور جمع ہوتا تھا اتنا بڑا اور عظیم الشان بند تعمیر کرنا فنِ انجنیرنگ کی کامل مہارت اور بہت بلند ہمت کا محتاج ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس بند کی بنیاد اس قدر مستحکم تھی کہ اس نے کئی صدیوں تک پانی کے صدموں کو برداشت کیا اور ہوا کی مخالفتوں کو جھیلا۔ آخر جبکہ قحطانی عربوں کی حکومت کمزور ہو گئی اور اس کی حالت ردی ہوئی تو اس میں اتنی طاقت نہ رہی کہ اس بند کو نئے سرے سے تعمیر کرائے یا اس کی پوری طرح مرمت ہی کرا سکے۔ لہذا وہ منہدم ہونے کے قریب پہنچ گیا، اہل عرب نے دیکھا کہ اب چند دنوں میں یہ بند لوٹ جائے گا تو وہ دوسری صدی عیسوی کے وسط میں اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر اور ملکوں میں آباد ہونے لگے۔ اسی پر ہیبت قوم کے یادگار گھرانے ملک شام میں بنی غستان سرزمین عراق میں بنو بند، مدینہ میں اوس، منا میں ازد، اور قرب و جوار مکہ میں بنو خزاعہ کے ناموں سے مشہور تھے۔ ان گھرانوں کے ترک وطن کر چکنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ بند بھی ٹوٹ گیا، اور اس کا پانی سارے ملک میں پھیل گیا۔ اس وقت باقیماندہ لوگوں نے بھی وطن مالوف کو خیرباد کہا اور دوسرے مقامات پر جا کر آباد ہو گئے۔ اس بند کے ٹوٹنے کو سیل ارمؓ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس عظیم الشان سیلاب کا زور اپنے ساتھ سبا کی حکومت کو بھی بہا لے گیا اور اس کا خاتمہ کر دیا۔

رومی سیّاح کی تصدیق

ملکِ روم کے مشہور سیاح استرابون نے پہلی صدی قبل مسیح ناآرب کا ذکر کرتے ہوئے

لکھا ہے کہ وہ ایک عجیب شہر تھا اس کے مکانوں کی چھتیں سنہری پتروں اور ہاتھی دانت کے ٹکڑوں سے مزین تھیں اور ان میں اعلیٰ درجے کے جواہرات بھی جڑے ہوئے تھے، وہاں بہت سے خوشنما اور بیش بہا ظروف اس قسم کے نظر آئے جنھوں نے عقل دنگ کر دی۔ اس بیان کو پڑھ کر ہمیں ان قصّوں میں بھی راستی کی بو آنے لگی ہے جن کو اہلِ عرب نے "ارم ذات العماد" کے بارے میں نقل کیا ہے۔



خط حمیری

آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کی ضرورت

ہمارے خیال میں آثارِ قدیمہ کے تلاشی اگر حمیر اور سبا کے حکمران گھرانوں کے دار السلطنتوں، مآرب اور صنعا وغیرہ کے کھنڈروں کو کھود کر دیکھتے تو یقین ہے کہ ان کو ایسے قیمتی نشانات دستیاب ہوتے جو دنیا پر ایک نئی تاریخ کا راز ظاہر کر دیتے جس طرح وادیٔ نیل کے آثار نے فراعنہ مصر کی تاریخ پر سے پردہ اُلٹ دیا ہے اور جس طرح کہ وادیٔ فرات کے آثار نے اشور اور بابل کے حکمرانوں کی تاریخ منکشف کر دی ہے۔ مگر یہ صورت اسی وقت ممکن ہے جبکہ دولت علیہ ادھر توجہ فرمائے اور علمی تحقیقات کرنے والوں کو اس ملک میں سرگرم تلاش و تحقیقات ہونے کے لئے روانہ کرے۔

نبطی قوم کا تمدّن

اسلام سے پیشتر جن عربی قوموں نے تمدّن میں نمایاں

حصہ لیا ہے انھیں میں سے ایک نبطی قوم بھی ہے، اس کی وجہ تسمیہ نبایوط بن اسماعیل کی جانب منسوب ہے۔ اور نیز ان کی نسل سے ہونا۔ یہ قوم شہر پطرا (Petra) کی رہنے والی تھی جو فلسطین اور جزیرہ سینا کے کسی قدر حصہ کے مابین واقع تھا؛ اس کی حکومت جزیرہ سینا کی اس حصہ پر جو ان کے مسکن میں داخل تھا مع آس پاس والے دوسرے حصوں کے پھیلی ہوئی تھی جو جزیرہ عرب کے ایک سرے سے اوسط ملک حجاز تک ممتد تھے؛ نبطی قوم مشرقی اور مغربی ملکوں کے اندر عقد تجارت کا واسطہ تھی؛ وہ اپنے عروج کے زمانہ میں رومن امپائر کی ہمعصر تھی اور اکثر حالتوں میں اس نے بعض رومانی جنرلوں کی قوت بازو بشکر ان کے دشمنوں سے جنگ کی ہے؛ نبطیوں کے ایک حکمران ملک حارث نام کو پہلی صدی قبل مسیح میں کچھ زمانہ کے لئے دمشق کی سلطنت بھی مل گئی تھی۔ سیرذا فر غسانی حکمرانوں کے وجود سے صدیوں قبل کا ہے۔ دوسری صدی عیسوی کے ابتدائی دور تک نبطیوں کی حکومت کا عروج اپنے کمال پر رہا۔ اور اس کے بعد رومن امپائر کی زبردست قوت نے اپنا تسلط جما کر ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس قوم کی عمارتوں کے کھنڈر آج تک بلاد مطرا میں موجود ہیں۔ جن پر نبطی خط میں لکھے ہوئے کتبے دستیاب ہوتے ہیں۔ نبطی خط بھی حمیری خط کی طرح پڑھا جاتا ہے۔

[illegible]

(خط نبطی)

عمالقہ کی قوم بھی منجملہ انہیں عربی اقوام کے ہے؛ جنھوں نے قدیم زمانہ کے اندر تمدن کے لحاظ سے اچھی ترقی کی؛ یہ قوم اپنی ہیبت اور جلال میں مشہور اور بے مثل گزری ہے؛ اور وہ مشہور ملک یعنی عاۃ (چرواہے سلاطین) اسی قوم سے تھے جن کی بابت خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مصر کا ملک فتح کر کے اس پر کئی صدیوں تک حکمرانی کی؛ ان قوموں کی حکومتوں کے علاوہ قحطانی عربوں کی وہ نو آبادیاں بھی جو ان لوگوں نے نسل ارم کے بعد دوسرے ملکوں میں قائم کیں بہت کچھ قابل لحاظ ہیں؛ جن کے بڑے بڑے مشہور شہروں میں سے غسانی خاندان کا

آباد کیا ہوا شہر بصرے حوران کے ملک میں، اور منذری گھرانے بسایا ہوا شہر حیرہ عراق کے بلاد میں واقع تھا، اور ان دونوں شہروں کی آبادی اور رونق کے تذکرے آج تک باقی ہیں؛ اب ہم ایک سوال کرتے ہیں جس کے جواب میں ہم کو اُمید ہے کہ انصاف پسندی کو ملحوظ رکھا جائے گا؛ وہ سوال حسب ذیل ہے۔

کیا اس قدر باتوں کے معلوم کر چکنے کے بعد بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اہل عرب فطرۃً تمدن سے دور ہیں۔ یا تھے؛ اور ان کو تمدن میں کسی طرح کی مداخلت نہیں تھی؛

عربی تمدن کی حیرت انگیز ترقی

ہم کو اس امر سے مطلق انکار نہیں ہے کہ اسلامی تمدن کی بنیاد رومانی اور فارسی تمدن کے کھنڈروں پر قائم ہوئی؛ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ضرور ہے کہ اس معاملہ میں اہلِ عرب کی بھی وہی حالت تھی جو یونانی، رومانی، فارسی اور تمام دوسری عظیم الشان حکومتوں کی حالت رہ چکی تھی؛ یونانیوں نے ابتداءً اپنے تمدن کے اصول مصر والوں سے حاصل کیے[1] پھر رفتہ رفتہ ان میں وسعت اور اضافہ کر کے طبعی تاثیرات کے اقتضاء سے اسے اپنا بنا لیا کہ خاص انھیں کے نام سے مشہور ہو گیا؛ رومانیوں نے اہلِ یونان سے اخذ کیا۔ لیکن اُنھوں نے بہت کم تغیر و تبدل کو دخل دیا۔ فارس والے بھی دوسروں کی شاگردی میں داخل رہے ان کے تمدن کی بنیاد اشوری؛ بابلی، اور کلدانی قوموں کے تمدن کے کھنڈروں پر قائم کی گئی جو ان سے قبل گذر چکے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی فارس والوں نے بھی اپنے تمدن میں یونانی لوگوں کا چربہ اتارا تھا، مگر ان مذکورہ بالا قوموں اور اہلِ عرب کے تمدن میں نمایاں فرق یہ ہے کہ ان قوموں نے حضارت میں کئی کئی صدیوں کے بعد کچھ نمود دکھائی اور عرب والوں کی دولت کو قائم ہوئے پوری ایک صدی بھی نہیں گذری تھی کہ ان کے تمدن کا تمام عالم میں ڈنکا بج گیا؛ دنیا پر ان کی عقلی قوتوں کا اظہار ہو چلا۔ دوسری اور تیسری صدی میں تو انھوں نے ایسی ترقیاں کیں کہ ان کے

---

[1] جس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ یونانی اور رومانی قومیں پاس پاس ملکوں کی رہنے والی تھیں اور ان کے طبائع میں ہمجنسی کی وجہ سے بہت کم فرق تھا؛؛

علوم و آداب کے سرچشموں نے سارے جہان کو سیراب کر دیا۔

جرمن قوموں کی مثال

اس قدر بیان پر اتنا اضافہ اور بھی کرنا چاہیئے کہ جرمنی قومیں جنھوں نے آج کل اس آخری زمانہ میں دنیا کی ایک بہت بڑی سلطنت قائم کر لی ہے اور اپنے تئیں بہت طاقت ور حکومت بنالیا ہے یہی قوم تھی جس نے اسلام سے قبل اور بعد بہت سی صدیاں اس حال میں بسر کی ہیں کہ رومن امپائر پر چھاپے مارتی رہتی تھی اس طریقے سے انھوں نے سلطنت روما کے بہت سے شہر بھی فتح کر لیئے اور ان میں سے بعض منچلے لوگ، خاص شہر روما میں بھی داخل ہو گئے۔ لیکن اس کی ان فتوحات کا نتیجہ بے کار لوٹ مار کے سوا اور کچھ نہیں تھا؛ ہونی لوگوں کی فتوحات کا سیلاب پانچویں صدی عیسوی میں نہایت زوروں پر رہا؛ انھوں نے رومن امپائر کا شمالی اور مشرقی حصہ بالکل پامال کر ڈالا؛ ہونکاریا؛ رومانیا؛ اور تمام یوروپین ترکی کو فتح کر کے وہاں ایک زبردست حکومت قائم کی؛ اس حکومت کا نام خاقانوں کی حکومت؛ مشہور ہوا اور یہ دو صدیوں تک پوری طرح قائم رہی۔ جس طرح عرب والوں نے مصر، عراق؛ اور شام کو فتح کر کے وہاں اپنی حکومتیں قائم کی تھیں؛ مگر کوئی نہیں بتا سکتا کہ ہونی لوگوں نے اپنی جانب سے کسی تمدن کی بنیاد رکھی ہو یا انھوں نے اسی حضارت کو باقی رکھا ہو جو ان کی فتوحات سے قبل ان کے ممالک میں پائی جاتی تھی؛ اس مقام پر یہ سوال کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ "ہونی" لوگوں نے باوجود اس کے کہ وہ لوگ عرب کی بہ نسبت یونانی تمدن کے مرکز سے قریب تر تھے، کیوں اس میدان میں قدم نہیں رکھا؛ چھٹی صدی عیسوی کے اندر سلانی قوم کے لوگوں نے رومن امپائر پر کس زور شور سے حملہ کیا؛ وہ بڑھتے ہی چلے گئے، یہاں تک کہ قسطنطنیہ کے دروازوں تک جا پہنچے؛ باوجود اس بات کے وہ جیسے گئے تھے ویسے ہی خالی واپس آئے اور تمدن کے میدان میں ایک قدم تک نہیں رکھا، اسی طرح سے اور بھی بکثرت چھوٹے چھوٹے قبیلوں اور قوموں نے تاتاری اور مغلی اقوام میں سے ایسے ہی جوش و خروش کے ساتھ فتوحات کا ڈنکا بجایا۔ "لیکن بیسود"؛ تیمورلنگ وغیرہ کی فوجوں نے عربی حکومت کو کمزوری کے زمانہ میں

زیر و زبر کر دیا؛ اپنا مطیع بنا کر وہاں کے بادشاہوں کو اپنا حلقہ بگوش کیا؛ لیکن انھوں نے کوئی تمدن قائم کیا؛ اور نہ اسی تمدن پر باقی رہے جو اُن سے پہلے رائج تھا؛ کیا یہ باتیں اس امر پر دلالت نہیں کرتیں کہ اہل عرب میں تمدن قبول کرنے کی ایک خاص استعداد تھی۔ اور وہ حضارت (شہری زندگی یا آبادکاری) کے لئے فطرۃً موزوں تھے:

حجاز میں جاہلیت کا زمانہ

جزیرہ عرب کے جنوبی اور شمالی حصّوں کے باشندوں نے تمدن میں بہت کچھ تبدیلیاں و ترقیاں کیں۔ لیکن وسطِ ملک میں رہنے والے اہلِ حجاز اپنی اسی جنگلی اور وحشیانہ زندگی میں بسر کرتے رہے، کیونکہ وہاں کی سرزمین خشک اور بے آب و گیاہ ہونے کے علاوہ ملک اس عہد کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ساتھ ٹکّر کھانے سے بھی بوجہ بُعدِ مسافت محروم تھا اس کے وسطِ صحرا میں واقع ہونے اور راستہ کے دشوار گذار ہونے کے باعث بڑے بڑے فاتحانِ دنیا بھی وہاں نہ جا سکے۔ مثلاً چودھویں صدی قبل مسیح میں رعمسیس دوم اور چوتھی صدی قبل مسیح میں اسکندر اعظم اور پہلی صدی عیسوی میں بعہد قیصر آگسٹس ایلیوس غالوس جیسے بلند ہمت فاتح بھی جزیرہ عرب کے اس صوبہ (حجاز) کا رُخ نہ کر سکے اور نیز فارس کے اولوالعزم بادشاہوں کے عروج حکومت میں بھی کوئی وہاں نہ جا سکا؛ حجازی عربوں کو اس قدرتی حفاظت نے کچھ ایسا مطمئن اور بے کھٹکے بنا دیا کہ وہ اپنی حالت میں ہی خوش رہنے کے عادی اور گدڑی میں مست کے مصداق ہو گئے؛ اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ انسان بلا کسی خطر یا بےچینی پیش آنے کے اصلاح کا خواہشمند نہیں ہوتا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ وہ فطرۃً نفسانیت رکھنے والا اور جاہ طلب پیدا کیا گیا ہے۔ اسی سبب سے خود اہلِ عرب ہی کے مابین بہت سی نزاعیں اُٹھ کھڑی ہوئیں اور ان کا ذریعہ معاش بہ صرف باہمی جنگ اور لوٹ مار بن گیا؛ اس شغل نے انھیں اپنی طرف اس قدر مائل کر لیا کہ وہ کسی دوسرے کام

کی جانب متوجہ ہونا ہی بھول گئے۔ پھر بھی وہ جاہلیت کے زمانہ سے ہی خودداری ایفائے عہد، حوصلہ مندی اور کرم کی عمدہ صفات کے ساتھ متصف تھے؛ اور ان کی یہ حالت اس امر پر دلالت کرتی تھی کہ آئندہ زمانہ میں کسی بڑی عظمت و شوکت حاصل ہونے کی ان میں استعداد و صلاحیت موجود ہے۔

اہلِ حجاز نے بے شمار صدیاں اپنی اسی بدویانہ زندگی میں بسر کیں جن کی صحیح تعداد صرف خدا ہی کو معلوم ہوگی؛ اس زمانہ میں وہ اپنی اسی فطرتی جنگلی زندگی کے عادی رہے؛ البتہ انھوں نے کسی قدر تمدن و تہذیب کی تعلیم ان لوگوں سے حاصل کی تھی جو غیر ممالک سے ترکِ وطن کر کے حجاز میں آن بسے تھے، یہ جلاوطن لوگ یہودی تھے جو حضرت موسیٰ کے زمانہ سے لے کر بعد کے زمانہ تک خاص کر اخیر قرون قبل از مسیح اور پہلی عیسوی صدیوں میں اپنے رومانی حکام کے جور و ظلم سے بھاگ کر عرب کے خشک صحراؤں میں پناہ لینے آئے تھے اور بالخصوص بیت المقدس کی تباہی کے بعد اور بھی زیادہ آ گئے تھے۔ اور اسی طرح بسا اوقات کچھ نبطی لوگ بھی حجازیوں کے ملک میں آتے رہے۔ جو متمدن دنیا کے رہنے والے تھے۔ ان تارکِ وطن لوگوں نے اپنے رومانی حکام کے ظلم و ستم سے دق ہو کر گھر بار چھوڑ دینے کے بعد مکہ، مدینہ اور طائف کو اپنا مسکن بنایا۔ لیکن یہودیوں کی بابت غالب گمان یہ ہے کہ وہ اکثر مدینہ ہی میں رہتے تھے؛ کیونکہ اس میں اوس اور خزرج کے نامی قبائل ان کے ہم مذہب تھے؛

یہودیوں کے اثرات

حجازی عربوں پر طرزِ معاشرت اور دین کے لحاظ سے یہودیوں کا بہت کچھ اثر پڑا۔ چنانچہ عربوں نے ان سے بہت سی ایسی باتیں سیکھیں جن کو وہ پہلے مطلق نہ جانتے تھے؛ مثلاً حج، قربانیاں، نکاح، طلاق، کہانت اور تہواروں کے دن جلسے کرنا وغیرہ یہودیوں نے ان کو توراۃ کے چند قصے بھی پڑھا دیئے۔ اور تلمود کی کچھ فصلیں بھی تعلیم کیں۔ اور ان میں اپنی عادات و رسومات بہت کچھ پھیلا دیں۔ علاوہ بریں سیلِ ارم کے واقعہ کے بعد یمن کے بھی بہت سے لوگ عرب میں ہجرت کر آئے تھے؛ پس اس خلط ملط

12164

کی وجہ سے عربوں کے دو گروہ بن گئے؛ ایک تو اہل بادیہ جو اپنی نیچرل سادہ زندگی پر قانع رہے؛ یہ عرب رحل؛ یعنی خانہ بدوش کہلاتے تھے۔ اور دوسرا گروہ شہریوں کا جو مکہ، مدینہ، اور طائف میں رہتے تھے؛ یہ لوگ حضر یعنی شہری عرب کے نام سے مشہور ہوئے؛

مکہ معظمہ کی اہمیت چونکہ مکہ میں حج ہوتا تھا اور لوگ دور دراز ممالک سے کعبہ کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے؛ اس لئے وہ حجاز کے شہروں میں سب سے زیادہ مشہور تھا۔ متواتر صدیاں گذرنے کے بعد وہ تجارت کی منڈی بھی بن گیا؛ کیونکہ ہر سال خاص خاص موسموں میں وہاں حجاج کا ہجوم ہوتا تھا؛ اور خرید و فروخت بکثرت ہوتی تھی؛ لہذا جتنے زبردست قبائل کے سرداران قوم تھے۔ ان سب کی نگاہیں اس پر پڑنے لگیں اور وہ اسے اپنے قبضہ میں کرنے کے خواہشمند ہوئے؛ اپنے ابتدائی دور میں یہ شہر خاص حجاز کے باشندوں (بنو اسماعیل) کے قبضہ میں تھا اور وہی لوگ کعبہ کے خادم یعنے حاجب[1] تھے؛ مگر جبکہ دوسری صدی عیسوی میں سیل ارم کے بعد ملک یمن سے ہجرت کرکے بنو خزاعہ مکہ میں آئے تو انھوں نے اس شہر پر بھی قبضہ کرلیا اور حجاز کے اصلی باشندوں کو اپنا محکوم بنالیا، کیونکہ ان کے دماغوں میں تو ابھی حکومت یمن کے زمانہ سے بوئے سرداری سمائی ہوئی تھی؛ ان دنوں اسماعیلی (یا عدنانی) لوگ بہت کمزور تھے تاب مقابلہ نہ لاسکے؛ مگر تاریخ عالم کے اصول نے ان پر بھی اسی طرح اپنا حکم جاری کیا جیسا کہ اور قوموں پر ہوتا رہا ہے؛ پس چند صدیوں کے بعد بنو خزاعہ پر گردش زمانہ کا اثر ہوا۔ ان میں کمزوری آئی اور عدنانیوں کا زور ہوا؛ ان کی تمام قوم میں سے ایک گھرانہ کنانہ کا علیحدہ اور ممتاز ہوگیا اور کنانہ کے گھرانے میں سے قبیلہ قریش برآمد ہوا؛

قریش اور خدمت کعبہ تقریباً پانچویں صدی عیسوی میں اہل قریش کا سردار اور رئیس قصیّ بن کلاب بن مرہ نامی ایک شخص حکیم دانا۔ صاحب تدبیر و رائے تھا؛ اس لئے متولی کعبہ کی بیٹی سے شادی کی؛ جو قبیلہ خزاعہ میں سے تھا۔ قصیّ کی آرزو اس شادی کرنے سے سدانۂ کعبہ کا حاصل کرنا تھا؛ قصیّ

[1] حاجب کعبہ کا منصب جس کا مفصل ذکر آگے آتا ہے۔

کے بہت سے بیٹے پیدا ہوئے۔ جن کی وجہ سے اس کی عزت اور رعب داب میں ترقی ہوئی۔ نیز اُس نے تجارت کا کاروبار پھیلا کر مال بھی خوب جمع کر لیا۔ جس وقت اس کے خسر کی موت کا زمانہ قریب آیا تو اس نے اپنی لڑکی یعنی قصیٰؓ کی بی بی کے واسطے خدمتِ کعبہ ملنے کی وصیت کی۔ مگر اس عورت نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ میں عورت ذات ہوں کعبہ کے دروازہ کا کھولنا اور بند کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔ (خادم خانہ کعبہ کی ان کے یہاں خدمت تھی) اس پر اس نے اپنے ایک بیٹے کو جس کا نام محترش تھا خدمت سپرد کئے جانے کی وصیت کی۔ محترش نہایت کمزور اور منحنی سا آدمی تھا۔ اب قصیٰؓ کو خاصہ موقع مل گیا اور اس نے ایک مشک شراب کے بدلے میں وہ معزز منصب محترش سے خرید لیا۔

قبیلہ خزاعہ کو یہ خبر ملی تو اُنھیں بہت ناگوار گزرا اور بالآخر قبائلِ قریش و خزاعہ کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ بہت سی میدان داریوں کے بعد انجام کار دونوں قبیلوں نے صلح اور فیصلہ پنچایت پر رضامندی ظاہر کی، اور قریش ہی کے ایک معتبر شخص کو پنچ بنالیا۔ اس نے قصیٰؓ کے حق میں فیصلہ دیا۔ جس کے بعد سے ظہورِ اسلام اور فتح مکہ تک خدمتِ کعبہ قریش ہی کے گھرانے میں رہی

ہاشم اور اُمیّہ

کعبہ کی خدمت گویا مکہ کی سرداری ہوتی تھی۔ قصیٰؓ نے میدان خالی پاکر اپنے عزیزوں اور قریبوں کو جو قریش ہی کے قبیلہ سے تھے۔ مکہ میں اکٹھا کر لیا اور خاص شہر اور قرب و جوار میں مقیم کیا۔ قریشیوں نے قصیٰ کو جملہ امور میں اپنا سردار بھی تسلیم کر لیا۔ قصیٰ نے مکہ کے چار ٹکڑے کر کے اپنے برادروں کو بانٹ دیئے۔ اور سبھوں نے اپنی اپنی ملک میں مکانات تعمیر کر کے سکونت اختیار کی۔ اب گویا مکہ قریشیوں سے ہی آباد ہو گیا۔ اور ہر ایک معاملہ میں قصیٰؓ ان کا سردار و امیر بن گیا۔ قصیٰ کے بعد اس کا جانشین اُسی کا بیٹا عبدمناف ہوا۔ عبدمناف کے لڑکوں میں دو لڑکے ہاشم اور عبدشمس نامی تھے۔ عبدِمناف کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے خدمتِ کعبہ کی وصیت ہاشم کے

لئے کی، عبد شمس کا ایک لڑکا (اُمیّہ نامی بنو اُمیّہ کا جد) تھا؛ اُسے اپنے چچا کی ریاست پر رشک آیا اور اس حسد کا انجام یہ ہوا کہ باہم جدائی ہونی قرار پائی۔ ہاشم اپنے بھتیجے سے جدائی پسند نہ کرتا تھا؛ مگر قریشیوں نے اسے دق کر کے مجبور کر دیا۔ جس کی وجہ سے آخر کار اس نے پچاس اونٹنیاں دینے اور بیس سال تک مکہ سے باہر رہنے کی قید پر باہم جدائی منظور کی اُمیّہ نے اس پر رضامندی ظاہر کی اور خزاعی کاہن کو حکم قرار دیا جو صفا میں رہتا تھا۔ دونوں نے اس سے فیصلہ چاہا؛ تو اس نے ہاشم ہی کے حق میں فیصلہ دیا؛ ہاشم نے شرط کے مطابق اونٹوں کو لے کر قربانی کی اور دعوتِ عام دی؛ اُمیّہ ناکام ہو کر وہ بیس سال کے لئے ملک شام کو چلا گیا؛ یہ پہلی عداوت تھی جو ہاشم اور اُمیّہ کے مابین واقع ہوئی۔ اور ان دونوں کی اولادیں عہدِ اسلام تک اس کو بطور وراثت قائم رکھتی رہیں۔ ہاشم کے بعد اس کے فرزند عبدالمطلب متولی کعبہ ہوئے جو پیغمبر اسلام کے جد تھے،

قریش کی برتری

عرب کے قبائل میں قریش کے گھرانے کا رتبہ ایسا تھا جیسا بنی اسرائیل میں لادیوں کا مرتبہ تھا؛ انھیں بھی وہی امتیازات حاصل تھے جو ان کو اپنی قوم میں تھے یہ اختیارات و مراتب عیسائیوں کے یہاں کے کاہنوں کے مراتب سے ملتے جلتے تھے؛

وہ سب پر حکمران تھے اور ان پر حاکم بالادست کوئی شخص نہ تھا؛ جس گھرانے میں چاہتے شادی بیاہ کرتے، اور اس بارہ میں انھیں کسی شرط کا پابند ہونا نہ پڑتا اور اپنی لڑکیاں کسی غیر گھرانے والے سے اس وقت بیاہتے جبکہ اس پر پکے اور کٹر دیندار بننے کی شرط لگا دیتے؛ فرائض ارکانِ حج کا تقرر انہوں نے ہی کیا اور اُسے لوگوں کے لئے لازم انھیں نے ہی بنایا تھا؛ اور انھیں ہر امر میں خاص اختیارات و حقوق حاصل تھے؛

جاہلیت میں عرب کی حکومت

عرب سے ایک خاص صورت پر ہماری مراد حجاز کے باشندے ہیں اور ان میں سے مخصوص طور پر قبیلہ قریش کے لوگ کیونکہ ان میں ہی اسلام کا ظہور ہوا جس کی وجہ سے تمدن اسلامی کی بنیاد پڑی جسے ہم بیان کرنا چاہتے ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں تمام اہل بادیہ (صحرائی عربوں) کے یہاں حکومت کا انداز یکساں تھا جو ضرورتیں متمدن دنیا کے رہنے والوں میں بیسیوں شخصوں سے پوری ہوتی ہیں۔ صحرائی قوموں میں وہ سب تنہا ایک ہی سردار کی ذات میں جمع ہوجاتی ہیں۔ وہی امیر یا بادشاہ بھی ہوتا ہے۔ وہی قاضی وہی صاحب خزانہ اور سردار فوج وغیرہ غرضکہ تمام کاروبار اسی شخص واحد کی ذات سے وابستہ ہوتے تھے۔ اہل عرب کے یہاں جو شخص ان میں سب سے زیادہ طاقتور عقیل اور سب سے بڑھکر صاحب تدبیر و رائے ہوتا تھا بلا کسی قسم کی سازشوں اور تعمد کے اُسی کو امیر بناتے تھے اور اگر ان میں سے کئی شخص عقل و تدبیر اور زور و قوت میں برابر ہوتے تو اس وقت ان سب میں سے زیادہ عمر والے اور صاحب جاہ شخص کو منتخب کرلیا کرتے تھے۔ اور جب کئی قبائل کے لوگ متفق ہوکر کسی لڑائی پر آمادہ ہوتے اور انھیں ایک ایسا سردار درکار ہوتا جو اُن سب لوگوں پر افسری کرے اس وقت یہ تدبیر کرتے کہ سب سرداروں کے نام قرعہ ڈالتے تھے جس کے نام چٹھی نکلتی اس کو بلا عذر افسر عام مان لیتے اس صورت میں خوردی اور بزرگی کا بھی لحاظ نہ کرتے تھے۔ مذکورہ بالا حالت صحرائی اور خانہ بدوش عربوں کی تھی جو جنگ و جدل اور لوٹ مار کے عادی تھے۔ باقی رہے شہری عرب اور وہ اہل مکہ تھے جن کے یہاں خانہ کعبہ کا خادم سرداری کا مستحق ہوتا تھا اور جب خدمت بیت اللہ قریش کے گھرانے میں آگئی تو اسی وقت سے وہ ہر معاملہ میں سردار و افسر

شمار ہونے لگے۔



(کعبہ)

کعبہ، تجارت اور قریش

جیساکہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں، قریشی لوگ شہر کے رہنے والے اور تجارت پیشہ تھے؛ ان کی تجارت کا قیام و بقا ان حاجیوں کی آمد پر تھا جو تہواروں اور موسموں میں مکہ آیا کرتے تھے؛ لہذا ان کے لیے مقتضائے مصلحت یہی تھا کہ وہ آمد و رفت کی راہ کو آسان بنانے اور لوگوں کو حج کی رغبت دلانے میں کوشش کرتے رہیں۔ جن امور نے قبائل عرب کو زیارت کعبہ پر آمادہ کیا تھا ان میں سے ایک سبب اور بڑا سبب یہ تھا کہ ہر قبیلہ کا ایک خاص بت ہوتا تھا۔ جس کی زیارت اور اس پر قربانی چڑھانے کے لیے وہ قبیلہ مقررہ موسم میں آیا کرتا تھا؛ یہاں تک کہ خانہ کعبہ میں بتوں کی تعداد تین سو سے بڑھ گئی تھی جن میں چھوٹے بڑے ہر قسم کے بت تھے؛ کوئی آدمی کی صورت کا تھا اور کوئی جانوروں کی شکل کا۔ اور چند نباتاتی اشکال کے تھے؛

عکّاظ کی مرکزیّت

طائف سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بازار تھا جس کے اندر ماہ ہائے حرام کے زمانہ میں لوگوں کا جماؤ ہوتا تھا، لوگ وہاں کھجوروں کے جھنڈوں میں اپنے اپنے خیمے ایستادہ کرکے خرید وفروخت اور تبادلۂ مال میں مصروف رہتے، یہ بازار مشہور سوق عکّاظ تھا۔ اس کے علاوہ دیگر مقامات پر عربوں کے اور بھی میلے ہوا کرتے تھے، لیکن ان میں صرف قرب وجوار کی بستیوں کے باشندے اکٹھے ہوتے، مگر عکاظ میں ہر جانب سے جوق جوق باشندگان عرب آتے تھے، اور ہر قبیلہ و حصّہ ملک کے رہنے والے شریک ہوتے تھے، قریش والوں نے عکّاظ میں لوگوں کے بکثرت آنے کے اسباب میں اتنی اور بھی زیادتی کردی تھی کہ انھوں نے اُسے ادب (لٹریچر) اور شاعری کا اکھاڑا بنا دیا تھا، جہاں پر عرب کے قبیلے اپنے اپنے باکمال شاعروں اور مقرروں کو پیش کرتے جو اشعار پڑھتے اور مباحثہ و مناظرہ کرکے اپنا فخر جتایا کرتے تھے اور جس کا کوئی عزیز یا برادر قیدی ہوتا وہ اس کے لئے فدیہ دینے کی کوشش کرتا، اگر کسی کو حق حکومت حاصل ہوتا اور وہ اپنے حق کو نہ پاتا تو اس موقع پر وہ بھی اپنے استحقاق کو عیاں کرتا۔ جس کی وجہ سے اُسے حکومت حاصل ہو سکے۔ ایام موسم یعنے میلے کے دنوں میں ایک خاص شخص کو عکّاظ کا والی (حاکم) بنا لیتے تھے جو باہمی اختلاف اور جھگڑوں کا فیصلہ کرتا۔ یہ حاکم اکثر بنی تمیم کے گھرانے سے ہوتا تھا۔ لوگ عکّاظ کے میلے سے فراغت پاکر عرفات میں ٹھہرتے تھے اور وہاں سے مکّہ جاکر ارکانِ حج ادا کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے تھے۔

تجارتی سفر

قبیلہ قریش کے لوگ تجارت کے لئے سال میں دو سفر کرتے تھے جاڑوں کا سفر یمن کی جانب اور گرمیوں کا بصرہ کی جانب جو صوبہ حوران ملک شام کا ایک عمدہ شہر اور تجارتی منڈی تھا، گویا کہ مکہ، یمن اور شام کے درمیان قیام تجارت کا ذریعہ تھا، تجارت کے راستے یوں تو نہایت خطرناک رہتے تھے۔ اقوام عرب کی لوٹ مار سے بچنا مشکل بلکہ محال تھا۔ لیکن اہلِ قریش اس سے محفوظ تھے۔ کیونکہ بوجہ خادمِ کعبہ ہونے کے لوگ ان کی عزت اور توقیر

کرتے تھے انھیں نقصان کیونکر پہنچاتے۔ اہلِ قریش اکثر اوقات فارس اور حبشہ کا سفر بھی کیا کرتے تھے؛ وہ ملک شام سے کپڑے اور غلّہ فارس سے شکر اور موم وغیرہ اشیائے تجارت لایا کرتے تھے۔"

قریش کا اقتدار

بیانِ بالا سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اہلِ مکہ کا ذریعہ معاش اور سرچشمہ گزران خانہ کعبہ تھا، اگر وہ نہ ہوتا تو اہلِ مکہ کے لئے اس وادی میں رہنا جس میں نہ کھیتی ہو سکتی تھی اور نہ پانی میسّر تھا غیر ممکن ہوتا بکثرت سفر کرتے رہنے اور اطراف عراق و شام کی متمدن دنیا سے ملتے جلتے رہنے کی وجہ سے اہلِ قریش تمام باشندگان عرب میں سب سے زیادہ عالم اور صاحب فہم ہو گئے تھے۔ اور چونکہ خانہ کعبہ کو ان کے بسر اوقات کے اسباب سے بہت کچھ تعلق تھا، لہٰذا انھوں نے اس کی حالت درست رکھنے میں خوب توجہ سے کام لے کر لوگوں کے لئے وہاں کا آنا آسان بنا دیا تھا؛ اہلِ قریش نے خانہ کعبہ کے آس پاس پانی کی سبیلیں لگا رکھی تھیں اور کھانا کھانے کے لئے مکانات بنائے تھے۔ نیز اس زمین کو جو خانہ کعبہ کے جوار میں تھی حرم (قابل عزت) بنا کر اس کی حدود میں جنگ و قتل کو حرام کر دیا تھا؛ اور اپنے خاندان میں سے کسی کو سبیل کا متولی مقرر کیا؛ اور کسی کو کھانا کھلانے کا مہتمم؛ غرض اسی طرح سے تمام خدمات اپنے آدمیوں کے سپرد کر رکھی تھیں؛ یہ خدمتیں اور منزلتیں روز بروز بڑھتی ہی گئیں یہاں تک کہ اسلام سے پہلے پہلے پندرہ سولہ خدمتیں معیّن ہو چکی تھیں جس سے اس زمانے کی حکومت اور سلطنت کے کاروبار مراد ہیں جو قبیلہ قریش کے کنبوں نے آپس میں تقسیم کئے ہوئے تھے؛ قریش کے زیادہ تر مشہور کنبے یہ تھے۔

فرائض کی تقسیم

ہاشم، امیہ، نوفل، عبدالدار، اسد، تیم، مخزوم، عدی، جمح، اور سہم، ان میں سے ہر ایک کے واسطے ایک ایک خدمت یا زائد مقرر تھی جو ذیل میں درج ہوتی ہیں۔

(۱) سدانتہ؛ جسے حجابتہ بھی کہتے تھے، اس خدمت کا والی کعبہ کا حاجب ہوتا تھا خانہ کعبہ کی کنجی اسی کے پاس رہتی تھی، لوگوں کے اندر جاتے وقت کعبہ کا دروازہ

کھولتا تھا اور پھر اُسے قفل لگا دیتا۔ اس منصب کو اُن کے نزدیک اوّل درجے کی عزت حاصل تھی؛ یہ طریقہ خدمت عربوں نے یہودیوں سے سیکھا تھا؛ کیونکہ ان کے یہاں ایک خاص کاہن ہیکل کی حفاظت پر مقرر ہوا کرتا تھا جسے وہ "دربان" کہتے تھے؛ اور عقد فرید کے مصنف نے "سدانۃ" اور "حجابۃ" کو دو علیحدہ خدمتیں بتایا ہے؛ واللہ اعلم

(۲) سقایۃ، (سبیل) اس خدمت کا متولّی مکہ میں پانی کے کمیاب ہونے کی وجہ سے حاجیوں کو پانی پلانے کی فکر رکھتا اور آب رسانی کے اہتمام میں مصروف رہتا ــــ وہ چمڑے کے حوض بنا کر کعبہ کے آس پاس رکھتا اور کنوؤں سے میٹھا پانی مشکوں اور پکھالوں میں بھروا کر اونٹوں پر بار کرکے منگواتا اور ان حوضوں میں ڈلواتا، یہ صورت اس وقت تک قائم رہی جبکہ زم زم کا کنواں کھودا گیا اس کے بعد وہ اسی کے پانی کی سبیل لگوانے لگے؛ سقایۃ کی خدمت بنی ہاشم کے کنبہ میں تھی؛

(۳) رفادۃ؛ یہ ایک رقم ہوتی تھی جسے قریش کے لوگ اپنے مالوں میں سے نکال کر صاحبِ رفادۃ کے پاس جمع کر دیتے تھے؛ وہ اُسی آمدنی سے کھانے پکوا کر حاجیوں کو کھلاتا تھا، سب سے پہلے جس نے رفادۃ کا حکم جاری کیا وہ شخص قصیؓ تھا جس کا بیان اوپر آچکا ہے؛ پہلے رفادۃ کا اہتمام بنی نوفل کے گھرانے میں تھا اور کچھ عرصہ بعد بنی ہاشم کے گھرانے میں آگیا؛

(۴) عقاب؛ یہ قریش کے جنگی نشان کا نام تھا۔ جب وہ کسی لڑائی پر تیار ہوتے تو اُسے نکالتے اور جس شخص کو باتفاقِ باہمی نشان بردار بناتے اس کے سپرد کر دیتے تھے ورنہ وہ اسی شخص کے پاس رہنے دیتے تھے جس کے یہاں نشان کا رہنا مقرر تھا اور وہ مستقل علمبردار بنو اُمیہ میں سے تھا؛

(۵) ندوہ؛ یہ ایک گھر تھا جسے قصیؓ نے کعبہ کے ایک پہلو میں تعمیر کیا تھا اس میں اہلِ قریش کے نامی لوگ جمع ہو کر مشورہ کرتے تھے؛ اس گھر میں وہ شخص داخل

نہ ہو سکتا تھا جس کی عمر چالیس سال سے کم ہو۔ یہ بھی شرط تھی کہ کوئی عورت یا مرد اس گھر کے سوا اور کہیں شادی نہ کرے۔ دولہا اور دولہن دونوں کو اس میں لیجا کر عقد باندھتے تھے، اور لڑائی پر چلنے کے لئے فوج کا نشان بھی اسی گھر میں مرتب کیا جاتا تھا، بالغ لڑکیوں کو زنانہ لباس بھی اسی گھرانے میں پہنایا جاتا۔ مالک مکان اپنے ہاتھ سے اس کے کپڑے قطع کرتا اور اُسے پہناتا تھا۔ جب اُن (قریش کی) لڑکیاں سن تمیز کو پہنچتی تھیں تو یہ رسم ادا کی جاتی تھی۔ دارالندوہ بنی عبدالدار کے قبضہ میں تھا۔

(۶) **سپہ سالاری**: امیر قافلہ کا یہ بھی عہدہ تھا اس قسم کا عہدہ دار تجارت اور جنگ کے سفروں میں سواروں کے آگے آگے چلا کرتا تھا۔ سپہ سالاری کی خدمت بنی اُمیہ کے گھر میں تھی اور آغاز اسلام میں اس خدمت کی ذمہ داری ابوسفیان رضؓ معاویہؓ کے والد کے سپرد تھی۔

(۷) **مشورہ**: یہ خدمت جس کے سپرد ہوتی تھی اس سے تمام اہم کاموں میں رائے لی جاتی تھی، یہ عہدہ بنی اسد کے کنبہ میں تھا اور جب تک قریش کسی بات کو ان کے سامنے پیش کر لیتے اس پر ہرگز متفق نہ ہوتے تھے۔

(۸) **اشناق**: خون بہا اور تاوان کی وصولی کا نام تھا۔ جب کوئی شخص کسی خون بہا یا تاوان کو برداشت کرکے اس معاملے میں قریش سے رائے دریافت کرتا تو وہ اس کی تصدیق کرتے، اور اس خدمت کا تعلق "تیم" کے کنبہ سے تھا۔

(۹) **قبہ**: یہ ایک خیمہ تھا، جب لڑائی کو نکلتے تو اسے ایستادہ کرکے اس میں وہ سامان جمع کرتے جس کی ضرورت فوج کی آراستگی کے لئے ہوتی تھی اور جو ہمارے یہاں کے اس امر سے بہت کچھ مشابہ ہوتا تھا جس کو ہم اپنی اصطلاح میں "مہمات حربیہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ (کمسریٹ یا میگزین)۔

(۱۰) **اعنہ**: گھوڑوں کی باگوں کو کہتے ہیں، اس منصب کا مالک حالت جنگ میں قریش کے گھوڑوں کا نگراں ہوتا تھا اور ان کی ضروریات کی فکر کرتا تھا۔

(۱۱) **سفارت**: یہ اس قسم کی خدمت تھی کہ جب اہل قریش کسی دوسرے عربی قبیلے سے جنگ کرتے اور اس سے صلح کی گفتگو کرنا چاہتے تو کسی سفیر کو بھیجتے تھے؛ اور اگر کوئی خاندان کسی قسم کا فخر جتانے کے ساتھ ان سے منافرہ کرتا تو سفیر ہی کو منافر بناتے اور اس کے حکم کو تسلیم کرلیتے تھے،

زمانہ جاہلیت میں قریش کے سب سے پچھلے سفیر عمر بن الخطاب (اسلام لانے سے قبل تک) تھے؛

(۱۲) **ایسار**: فال کے تیروں سے استخارہ وغیرہ کے طور پر باہم تقسیم کرنے کے عمل کا نام تھا، جب وہ جنگ یا سفر کے واسطے کسی اہم کام کی بابت تقسیم کرنا چاہتے تو ان ہی جوئے کے تیروں سے کرتے جیسا کہ آج کل چٹھی یا لاٹری ڈالنے کا طریقہ جاری ہے؛ اس خدمت کی تولیت بنی جح کے گھرانے میں تھی؛

(۱۳) **حکومت**: یہ ان کے یہاں لوگوں کے مابین واقع ہونے والے جھگڑوں اور اختلافوں کے فیصل کرنے کا نام تھا؛ جو اسلامی عہدہ قضا یا تحکیم (پنچایت) کے مشابہ تھی؛

(۱۴) **اموال محجرۃ**: یہ اس قسم کے مال ہوتے تھے جنہیں وہ لوگ اپنے دیوتاؤں کے نام پر نامزد کر دیتے (چڑھا دیتے تھے) اس میں نقد اور زیور سب کچھ شامل ہوتا تھا اور بسا اوقات بیت المال کے مشابہ ہوتا تھا، اس کی ولایت بنی سہم کے گھرانے میں تھی؛

(۱۵) **عمارۃ**: اس سے یہ مراد ہوتی تھی کہ خانہ کعبہ کی (مسجد بیت الحرام میں) کوئی شخص گالی یا بری بات زبان سے نہ نکالے اور وہاں چیخنے چلانے نہ پائے

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ ان ضرورتوں میں سے بعض ضرورتیں ایسی بھی ہیں جو عموماً مفید یا اہم نہیں ہیں؛ لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قریشیوں نے ان ضرورتوں کی تعداد عمداً بڑھا دی تھی تاکہ ایک ایک خدمت سب کے سپرد کرنے سے قریش کے تمام کنبوں کو راضی رکھیں؛ انہیں ڈر تھا کہ مبادا ان میں باہم رشک اور عداوت

پیدا ہو جائے جو باعث تباہی ہے نیز خانہ کعبہ کی کمال بزرگی و تعظیم کے لحاظ سے بھی ایسا کیا تھا اس لئے کہ خانہ کعبہ کی عزت و عظمت اُن کے لئے باعثِ منفعت تھی اس کی وجہ سے لوگ وہاں بکثرت آتے تھے جن سے وہ ہر قسم کا فائدہ اُٹھاتے تھے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اہلِ قریش نے ان خدمتوں میں انتظام ملک اور دین، نظمِ حکومت اور جنگ وغیرہ باتوں کو اکٹھا کر لیا تھا، لیکن انہیں اپنے ہی قبیلہ میں تقسیم کر کے ایک جمہوری حکومت کی صورت بنالی تھی۔ یا وہ ایک خاص قسم کی حکومت تھی جس کی نظیر متمدن اقوام میں نظر نہیں پڑتی۔ البتہ وہ بسا اوقات بعض وجوہ سے حکومت شوریٰ (گورنمنٹ باجلاس کونسل یا پارلیمنٹ) سے مشابہ تھی، مگر اس پارلیمنٹری حکومت میں ایک افسر ہوا کرتا ہے جو بادشاہ یا شہنشاہ ہوتا ہے، اور اس قریشی طرزِ حکومت میں بجز اس کے دار الندوہ کے مالک یا خانہ کعبہ کے خادم کو کوئی سی ریاست حاصل ہوتی تھی اور کوئی ایسی وجہ مشابہت نہ تھی۔

اسلام سے پہلے عربوں کا دورِ ارتقا

اسلام سے پیشتر کی تاریخ عرب اگرچہ مبہم اور پیچیدہ ہے، لیکن اُسے بغور دیکھا جائے تو بہت سے ایسے امور واضح ہوتے ہیں جو غور و فکر کی جولانگاہ بن سکتے ہیں۔ انھیں اُمور میں سے جنھیں سوچ سمجھ کر کسی بات کا اعتبار کرنے کی گنجائش ہو سکتی ہے ایک بات یہ تھی کہ باوجود عرب کے مختلف قبیلوں اور گھرانوں پر منقسم ہونے کے پہلی صدی قبل ہجرت سے آگے آگے ان میں بہت کم کوئی مشہور شاعر یا خطیب یا حکیم یا کاہن پیدا ہوا۔ اس بارہ میں یہ اعتراض بھی نہیں ہو سکتا کہ جو نامور لوگ پہلے گذرے ہیں، ممکن ہے کہ ان کے حالات بوجہ فنِ تاریخ کے مدوّن نہ ہونے کے تلف ہو گئے ہوں گے، کیونکہ اہلِ عرب کو بہت سی صدیوں پہلے کے حالات مثلاً قومِ عاد و ثمود کے قصے تو یاد ہیں۔ اور جو لوگ دو ایک صدی قبل از ہجرت مشہور ہو گزرے ہوں ان کے حالات بالکل بھول جائیں؟ لہٰذا اگر اسلام سے پہلے اخیر کی صدیوں میں کوئی شاعر یا خوش بیان شخص گزرا ہوتا تو اس کے اخبار بالکل ضائع نہیں ہو سکتے تھے؟

منتشر اور مخلوط عقائد

اسلام سے ایک صدی پہلے نامور شاعروں اور خوش بیان لوگوں کا پیدا ہونا اور یکایک اہلِ عرب کا میلانِ خاطر اس جانب ہو جانا ہم نے اسی کا نام اسلام سے پہلے عربوں کا ترقی کی جانب اُبھر چلنا رکھا ہے، علاوہ بریں وہ اُٹھان صرف شاعری اور زبان دانی تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ اُن دنوں عرب میں ایک قسم کا دینی خیال بھی موجزن تھا، جس کی وجہ سے لوگوں کی فکریں منتشر اور عقائد خلط ملط ہو رہے تھے، اہلِ جاہلیت یہ بھی نہ جانتے تھے کہ ہم کس کی نماز پڑھتے ہیں (دعا مانگنا) اور کس سے وسیلہ پکڑنا چاہتے ہیں ان میں سے کوئی ایک شخص ایسا بھی ہوتا تھا جو قربانی بت پر چڑھاتا اور نام خدا کا لیتا تھا، پتھروں، آگ اور بتوں کے پوجنے والے بھی ان میں موجود تھے اور توحید کے ماننے والوں

اور مشرکوں کا بھی وجود تھا؛ اس کے علاوہ اور بہت سی ملی جلی عبادتوں کے طرز تھے؛ اسی بیچینی کے دوران میں شراب کے حرام ہونے اور بتوں سے بدعقیدہ ہونے کے خیالات کا ظہور ہو گیا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ نبوّت کی جانب سے کوئی بہتری حاصل ہونے کے لئے اُمّید وار ہو رہے تھے اور ان کی مجلسوں میں اس قسم کے تذکرے ہوا کرتے تھے مختلف قبیلوں کے کئی شخصوں نے نبوت کا جھوٹا دعوٰے بھی کر دیا تھا اور بعضوں نے دعوٰی کرنے کا قصد کیا تھا؛ یہ سب باتیں ایسی ہیں جو لوگوں کے ذہنوں کے دینی معاملہ کی جانب سے متنبہ ہو جانے پر صاف صاف دلالت کرتی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ لوگ انجام کار کی فکروں میں مبتلا تھے؛

ترقی کے اسباب (اس اٹھان کا سبب کیا تھا؟) اس سے پہلے ہم عدنانی عربوں کے ترقی کے لئے مستعد ہونے کی کیفیت اور ان کی قابل تمدّن ہونے کی حیثیت بیان کر چکے ہیں؛ اس ذہانت اور تیز فہمی ہونے کی وجہ سے جو فطرۃً انھیں عطا ہوئی تھی، ان میں اس قسم کی استعداد موجود تھی جو انھیں ادنیٰ توجہ ہونے کے ساتھ ہی ترقی یافتہ اور متمدّن قوم بنا دے، مگر چونکہ وہ لوٹ مار میں مصروف اور عزت و شان کی طلب سے بوجہ متمدن دنیا کے دور ہونے کے قاصر تھے لہٰذا ان قوتوں کو کام میں نہ لا سکتے تھے؛ قاعدہ کی بات یہ ہے کہ انسان کی قوتیں اُسی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں جبکہ وہ مصیبت کے شکنجے میں کسا جاتا ہے اور گردش زمانہ کے پنجوں میں پھنستا ہے۔ اور یہی تمام فطری اور طبعی قوتوں کی کیفیت ہے۔ اس لئے ایک تنہا شخص غالباً اس وقت تک عزت اور ناموری کا خواہاں نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو فقر و فاقہ کی مصیبت تنگ نہ کر دے؛ یا کوئی اس کا ہمچشم اس سے کسی ایسے معاملہ میں لاگ ڈانٹ نہ کرے جس میں اُسے اپنے اس ہمسر سے بڑھ جانے کا خیال پیدا ہو؛

قوموں کی ترقی کی جانب مائل ہونے کے اسباب خارجی لڑائیاں اور باہمی خانہ جنگیاں ہوتی ہیں؛ مگر اوّل الذکر صورت یعنی غیر اقوام سے جنگ و جدل کا چھڑ جانا اس معاملہ میں زیادہ مؤثر ہے، کیونکہ اس صورت میں انھیں دوسری قوموں سے ملنا جلنا

پڑتا ہے اور یہ باہمی میل ملاقات تبادلہ خیالات کا ذریعہ بنکر ان کو دوسروں کے اخلاق وعادات سے فائدہ اُٹھانے کا موقع اور غیروں کے مقابلے میں اپنی برتری دکھانے کا جوش دلاتا ہے تاریخ عالم میں اس کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔

حملۂ حبش کے اثرات

اسلام سے قبل کی دو صدیوں میں حبش والوں میں یمن پر حملہ آور ہونے اور اُدھر سے پلٹ کر ان کے ایک صدی ہجرت سے قبل کے وسط میں حجاز پر فتح مکہ کی نیت سے چڑھ آنے اور کعبہ پر قبضہ کرنے کی کوشش سے حجازی عربوں کو جس مصیبت اور دقت کا سامنا کرنا پڑا، وہ بالآخر کار ان کی ترقی کی طرف توجہ کرنے کا ذریعہ بن گیا اور غیر قوم کی بیجا مداخلت ان کے غیر متمدن دلوں کو چوٹ دے گئی۔ اُسی وقت سے ان میں ترقی کی روح پھک گئی، جس حالت میں حبش والوں نے مکہ پر فوج کشی کی ہے اور خانہ کعبہ کو گرا دینے کا ارادہ کیا ہے ان دنوں خانہ کعبہ کی خدمت اور قریش کی ریاست نبی عربی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے جدّامجد عبدالمطلب کو تفویض تھی۔ حبشیوں کا ٹڈی دل لشکر اور سامانِ جنگ، ان کے زبردست ہاتھیوں کی قطار یہ سب ایسی چیزیں تھیں جن کو اہلِ مکہ دیکھنے کے عادی نہ تھے۔ کیونکہ قبائلِ عرب کے دلوں میں خانہ کعبہ کی جو قدر و منزلت تھی وہ ان کو اغیار کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک مستحکم قلعہ کا کام دیتی تھی۔ مکہ والوں کو کبھی اس کا خیال بھی نہ گذرتا تھا کہ ہم پر کسی دشمن کی چڑھائی ہوگی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ حبشی فوجیں سر پر ہی آگئیں تو ان کو اس خطرہ کی صورت دکھائی پڑی جو درپیش تھا اور انہیں اتحادِ باہمی کی جانب اپنا محتاج ہونا محسوس ہو گیا تاکہ متفقہ قوت سے بیرونی دشمن کی مدافعت کر سکیں۔ انھوں نے آپس میں اتحاد قائم کیا اور آخر کار حبشیوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ مگر اس واقعہ نے انہیں غفلت کی گہری نیند سے بھی اُٹھا دیا۔ ان کے ہوش درست ہو گئے اور اس وقت سے ان کی فطری قوتیں اور خوبیاں نمایاں ہونے لگیں۔ مکہ والوں کے دلوں میں اس حملہ کا سخت اثر ہونا اس بات سے پایا جاتا ہے کہ انھوں نے اس سے بعد کے زمانہ میں اس حادثہ

صعب کو بطور سنہ کے استعمال کیا اور اسی کا نام "عام الفیل" (ہاتھیوں کا سال) رکھا تھا۔ زمانے کی اسی ایک گردش اور رگڑ نے جو عرب والوں کو پہنچی تھی، ان کے کان کھول دئیے تھے اور اس کا نتیجہ صرف یہی نہ ہوا کہ انھوں نے محض کسی قدر دینی اور ادبی (لٹریری) ترقی پر بس کیا ہو؟ نہیں، بلکہ اس حادثہ نے عرب کے ملک میں بہت سے ایسے آدمی پیدا کر دیئے جو سپہ سالاری، انتظامی قوت اور حکمرانی میں نامور ہوئے اور بعد میں اسلام کے نہایت تیزی کے ساتھ پھیلنے میں ان کے وجود کا بہت کچھ اثر ہوا۔ اس کی بھی وہی صورت ہے جیسے کہ ملک فرانس کی بدامنی نے نپولین بونا پارٹ اور اس کے قوتِ بازو افسروں کو پیدا کیا۔

اس کے علاوہ کچھ "عام الفیل" ہی میں ان کے اٹھان کی ابتدا نہ ہوئی تھی بلکہ یہ ترقی اور اصلاح کی حالت اسی وقت سے شروع ہو چلی تھی جبکہ حبش والوں نے یمن پر حملہ کیا ہے اور ان کے حجاز کی جانب پیش قدمی کرنے پر وہ ترقی کی صورت کامل طور پر جلوہ گر ہو گئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ کچھ ہی سبب کیوں نہ ہو مگر یہ ضرور ہے کہ عرب کے ملک میں اسلام سے کچھ زمانہ قبل سے ایک قسم کی لٹریری اور دینی ترقی کا اقدام (آغاز) ہو رہا تھا اور یہ صورت گویا قبولِ اسلام کی تمہید تھی اور اس کی امداد پر آمادگی عیاں کرنے کا مقدمہ۔ اور اس قسم کی تحریکیں اکثر حالتوں میں دینی دعوتوں سے پہلے پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ تاکہ لوگوں میں اس مذہبی اور روحانی دعوت کے قبول کر سکنے پر آمادگی و صلاحیت پیدا ہو جائے۔ یہ ایک قدرتی قانون ہے!

دعوت اسلام

جس وقت نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) صاحب شریعت اسلامی نے ظاہر ہو کر لوگوں کو توحید کی جانب بلایا ہے اس وقت حجاز کی یہ حالت تھی جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ نبی موصوف نے ۶۰۹ء میں جبکہ ان کی عمر چالیس سال کی تھی اس دعوت کا اعلان کیا۔ اس موقع پر اُن کے تمام اوصاف وعادات بیان کرنیکی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ ہم صرف اس قدر حالات بیان کئے دیتے ہیں جن کا تعلق اس مضمون سے ہے کیونکہ ہمیں ایسے اسباب کا بھی ذکر کرنا پڑے گا جنھوں نے اس دعوت کے ظہور کا ساتھ دیا اور اس کی اشاعت میں امداد کی۔

صاحبِ دعوت اسلام اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے۔ اور جس وقت آپ کی عمر صرف چھ سال کی تھی، والدہ ماجدہ نے بھی دنیا سے رحلت کی۔ اس کے بعد آپ کی کفالت آپ کے دادا عبدالمطلب نے کی۔ کعبہ شریف کی خدمتوں میں سے، سقایۃ (سبیل) اور رفادۃ کی خدمت عبدالمطلب ہی کے سپرد تھی، اور قریش کے گھرانے میں ان کا بڑا مرتبہ تھا۔ لیکن دو ہی سال کے بعد انھوں نے بھی وفات پائی۔ ... اور نبی اسلام کی پرورش اور برداخت ان کے چچا ابوطالب نے اپنے ذمہ لی۔ ابوطالب وجیہہ اور معزز آدمی تھے۔ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم ان کے گھر میں مثل ان کے ایک بیٹے کے پرورش پاکر جوان ہوئے۔ ابوطالب بھی اور قریشی لوگوں کی طرح تجارت پیشہ تھے اس لئے جب وہ بغرض تجارت کہیں سفر کو جاتے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ چنانچہ آنحضرت تھوڑی ہی عمر کے زمانہ سے نیک چلنی، سمجھداری اور عمدہ عادتوں اور سچی خوبیوں کے ساتھ مشہور عام ہو گئے۔ جس کی وجہ سے اہلِ قریش نے انھیں "امین" کا لقب دیا تھا، وہ تمام مکہ میں اس

لقب کے ساتھ مشہور و معروف ہوئے۔ تو بی بی خدیجہ بنت خویلد کو جو صاحبِ مال و منال اور بڑی تاجرہ تھیں۔ اُن کے حالات کی اطلاع ہوئی، انھوں نے آپ کو بلوا کر اپنا مال بغرض تجارت سپرد کیا، انھوں نے اپنی خوش معاملگی سے تھوڑی سی مدت میں بہت سا نفع حاصل کیا۔ بی بی خدیجہ کو ان کی دانائی اور کارگذاری بہت پسند آئی۔ اور انھوں نے آپ سے نکاح کا پیغام دیا؛ آنحضرت نے ان سے نکاح کر لیا۔ اور ان کی دولت سے فائدہ اٹھا کر اطمینان حاصل کیا۔ اب وہ خوشحال ہو گئے تھے، اور مکہ کے تمام لوگ ان کو عزیز رکھتے اور ان کی حرمت کرتے تھے

نبوت کا آغاز جس وقت آپ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو وہ لوگوں سے کنارہ کش اور گوشہ نشینی کی جانب مائل ہوئے، پہاڑوں کے غاروں میں جا کر عبادت کرنے لگے، جیسے تارک الدنیا گوشہ نشینوں کی عادت ہوتی ہے۔ اسی حال کے ماہِ رمضان میں وہ مکہ سے تین میل کے فاصلے پر کوہِ حرا کے غار میں رہتے تھے، اور بی بی خدیجہؓ بھی ان کے ہمراہ تھیں کہ اسی مہینے میں اُنھوں نے پہلا خواب دیکھا اور جلد جلد اپنی بیوی کے پاس آکر ان سے کہا کہ انھیں جبرائیلؑ دکھائی دیئے، اور اشارہ کیا کہ یہ آیت پڑھیں؛ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ الآیۃ جس کو انھوں نے پڑھا اور یہ صورت بھی پیش آئی کہ جب وہ غار سے باہر نکل کر پہاڑ کے وسط میں آئے تو انھوں نے ایک آسمانی آواز کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ "اے محمدؐ تم خدا کے رسول ہو اور میں جبرائیل ہوں"۔ اس آواز کو سن کر وہ لرزنے لگے اور خوفزدہ ہو کر دوڑے ہوئے خدیجہؓ کے پاس گئے اور انھیں اس واقعہ کی خبر دی؛ خدیجہؓ کے ایک چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل نامی کتبِ سماوی کے بڑے عالم اور اہلِ توراۃ و انجیل کی صحبت کا فیض اٹھائے ہوئے شخص تھے؛ مکہ میں مذہب اور نبوتوں سے متعلق ان کے جید عالم ہونے کا شہرہ تھا؛ بی بی صاحبہ ان کے پاس گئیں اور واقعہ مذکورہ کی اطلاع کی؛ ورقہ بن نوفل نے کہا جس کے ہاتھ میں ورقہ کی جان ہے اُسی کی (خدا کی قسم)، کہ اگر اے خدیجہ تو مجھ سے سچی بات کہہ

رہی ہے تو بلاشبہ وہ ناموس اکبر آیا تھا جو موسیٰ کے پاس آیا کرتا تھا اور کوئی شک کہ محمد اس امت کا نبی ہے۔

تبلیغ اسلام

بی بی خدیجہ حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس واپس آئیں اور ورقہ کی گفتگو سے انھیں مطلع کیا، جسے سُنکر ان کا دل مطمئن ہوا اور شہر مکہ میں واپس آگئے۔ مگر حالت یہ تھی کہ انھیں اپنی دعوت کا اعلان کرنے کی جرأت نہ پڑتی تھی؛ اولاً وہ جانتے تھے کہ ایسا کرنے میں چونکہ قریش کے معبودوں اور ان کے بتوں کے عیب بیان کرنے ہوں گے، اور ان بتوں کی وقعت کے جانے سے ان کی تمام عزت وحرمت دولت وتجارت خاک میں ملجائے گی اور ان کی ساری امیدوں کا خون ہو جائے گا جس کی وجہ سے وہ تباہی میں مبتلا ہوں گے؛ اس لئے چاہتے تھے کہ اظہار دعوت کریں مگر ہمت نہ بندھتی تھی؛ ثانیاً انھیں یہ بھی توقع نہ تھی کہ اگر وہ قریشیوں یا اہل مکہ کو اپنا نبی مرسل ہونا جتائیں گے تو وہ لوگ ان کو سچا سمجھیں گے؛ اس وجہ سے انھوں نے خفیہ طور پر اندر ہی اندر اپنی دعوت پھیلانے کا قصد کیا اور اپنے سب سے زیادہ نزدیکی لوگوں میں اس کی ابتدا کی؛ تین سال اسی صورت پر گزارے؛ اس مدت میں بہت تھوڑے لوگ ان کے گرد جمع ہوئے۔ منجملہ ان کے ایک علی بن ابی طالب ان کے چچا کے بیٹے تھے جو اس وقت بچے ہی تھے؛ اور ابو بکر صدیق رضؓ جو قریش کے وجیہہ لوگوں میں سے تھے اور ابو عبیدہؓ بن الجراح وغیرہ۔ پھر انھوں نے کھلے بندوں لوگوں کو اسلام کی جانب لانے کا ارادہ کیا اور اس شکل کی ابتدا خاص اپنے کنبے سے کی؛ اپنے چچیرے بھائی علی بن ابی طالب کو حکم دیا کہ خاندان کے لوگوں کی دعوت کریں اور اپنے چچاؤں اور ان کی اولادوں کو بلائیں جو تقریباً چالیس شخص تھے، علی رضؓ نے ان لوگوں کو اپنے والد ابی طالب کے گھر میں بلایا، جب وہ سب کھانا کھا چکے تو حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اُن سے کچھ کہنا چاہا ان کے کنبہ والوں کو ان کے خفیہ طور پر ہدایت اسلام کرتے رہنے کا حال معلوم ہو چکا تھا اور وہ سب اُنھیں بہ نگاہ حقارت دیکھتے تھے، جب آپ کچھ فرمانے پر

آمادہ ہوئے تو وہ سمجھ گئے کہ یہ اب ہم لوگوں کو بھی بتوں کے چھوڑ دینے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے کی ہدایت کریں گے؛ اس لئے ان کے چچا ابولہب نے جو ان کا سخت مخالف اور تکلیف دینے والا تھا جلدی سے انھیں چپ کرا دیا اور وہ خاموش ہو گئے؛ اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے؛ حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کچھ کہہ نہ سکے؛ لیکن وہ بددل نہیں ہوئے، اور ان کے استقلال میں کچھ کمزوری نہ آئی، بلکہ انھوں نے دوبارہ اور دعوت دی اور دل میں ٹھان لیا کہ اس دفعہ اپنا خیال ضرور ظاہر کریں گے۔ جس وقت سب مہمان کھانے سے فارغ ہو چکے تو آنحضرت نے فرمایا "میں نہیں جانتا کہ عرب میں کوئی آدمی اپنی قوم کے لئے اس چیز سے بڑھکر سوغات لایا ہو جو میں تمہارے لئے لایا ہوں؛ اس میں شک نہیں کہ میں تمہارے لئے دین و دنیا کی بھلائی لایا ہوں اور خدا نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں تمھیں اس کی جانب بلاؤں؛ اب تم لوگوں میں سے اس معاملے میں کون شخص میری مدد کرے گا تاکہ میں اُسے تم میں اپنا بھائی اور وصی اور خلیفہ بناؤں"؛ بنو عبدالمطلب یہ گفتگو سنکر چپ بیٹھے رہے۔ ان کا یہ تمام سکوت بخیالِ حقارت تھا؛ لیکن علی رض آگے بڑھے، اور انھوں نے کہا؛ "اے نبی اللہ میں ان پر آپ کا وزیر ہوں گا"؛ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے علی رض کی گردن پکڑ کے ارشاد فرمایا؛ "تمھاری جماعت میں یہ میرا بھائی اور وصی اور خلیفہ ہے اس کی بات مانو اور اس کی اطاعت واجب جانو"؛ یہ کلام سننے کے بعد بنو عبدالمطلب ہنستے ہوئے اُٹھے اور ابی طالب سے کہنے لگے؛ "لیجئے آپ کے بھتیجے صاحب آپ کو حکم دیتے ہیں کہ اپنے بیٹے کی اطاعت اور فرماں برداری کیجئے!!" یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے، مگر ان کے اس حقارت آمیز برتاؤ نے (حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم) کے ارادہ ل میں کوئی کمزوری نہیں آنے دی اور نہ ان کو اپنی قوم سے الگ ہونے کی ترغیب دی بلکہ بجائے اس کے کہ وہ ڈر کر اور پہلو بچا کر یہیں تک بس کرتے اور خموش بیٹھ رہتے انھوں نے دل کھول کر بر سرِ عام بتوں کو برا کہنا اور اپنے خاندان والوں اور بزرگوں کو گمراہ و کافر کہنا شروع کر دیا؛ بنو عبدالمطلب کو معلوم ہوا

کہ اب تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) علانیہ بتوں کو بُرا کہنا شروع کردیا ہے تو وہ متفق ہو کر اُن کی عداوت پر تُل گئے اور انھیں اذیت دینے کا ارادہ کیا لیکن چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابی طالب کی کفالت میں تھے لہٰذا وہ لوگ اپنے اس مدعا میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے، تاہم وہ ابی طالب کے پاس آئے ابوسفیان (معاویہ کا والد) بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اور انھوں نے کہا "ابا طالب! تمھارے بھتیجے نے ہمارے دین میں عیب نکالا ہے، ہمارے احلام کو سفاہت قرار دیا ہے، اور ہمارے باپ دادا کو گمراہ بتایا ہے، تم اسے منع کردو کہ وہ ہم سے ایسی باتیں نہ کہے ورنہ اس کا ساتھ چھوڑ دو ہم خود اس سے سمجھ لیں گے، ابوطالب نے اس وقت ان لوگوں کو سمجھا بجھا کر واپس کردیا اور اُن سے کہدیا کہ میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو فہمائش کردوں گا۔

اہل مکہ کی مخالفت

مگر پھر بھی قریشیوں نے آنحضرت کو برابر اپنے دیوتاؤں کے حق میں بُرا ہی کہتے دیکھا، وہ لوگ دوبارہ ابیطالب کے پاس پہنچے اور نہایت غیظ و غضب سے کہنے لگے، اگر تم اپنے بھتیجے کو منع نہ کروگے تو ہم تم سے اور اُس سے لڑیں گے، یہاں تک کہ ماریں گے یا مریں گے، ابیطالب کو یہ بات شاق گزری اور اس کے نتیجے کو وہ سمجھ گئے کہ بہتر نہ ہوگا۔ جس وقت اہل قریش ان کے پاس سے چلے گئے تو وہ اپنے بھتیجے (حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم) سے بولے "پیارے بھتیجے تمھاری قوم کے لوگ آج ایسی بات کہہ گئے ہیں، حضرت کو گمان ہوا کہ چچا میرا ساتھ چھوڑ دیں گے، اس خیال سے انھیں صدمہ گزرا۔ اور انھوں نے جواب دیا چچا صاحب! اگر وہ لوگ میری داہنی طرف آفتاب اور بائیں طرف ماہتاب لا رکھیں گے تب بھی میں اس بات کو نہ چھوڑوں گا" اور روتے ہوئے واپسی کا قصد کیا، اُن کے چچا نے یہ حالت دیکھ کر ان کو بلا لیا، اور کہا جو دل چاہے کہے جاؤ واللہ میں قیامت تک بھی تمھیں اُن کے ہاتھ میں نہ دوں گا۔

مسلمانوں کی مختصر جماعت

اس اثنا میں حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور دعوت آہستہ آہستہ پھیلتی جاتی تھی، چیدہ

چیدہ لوگوں کی ایک مختصر جماعت مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی جن کی اسلامی تاریخ میں بڑی شان و عظمت ہے، انھیں لوگوں میں سے چند یہ بھی ہیں:۔ ابو بکر صدیقؓ، عثمانؓ بن عفان، زبیرؓ بن العوام، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حمزہؓ بن عبدالمطلب اور عمرؓ بن الخطاب، مگر ان دو پچھلے شخصوں کے اسلام لانے کی نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کو بہت خوشی ہوئی کیونکہ یہ دونوں وجیہہ اور زور آور لوگوں میں سے تھے:

مال و جاہ کی ترغیب

حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے اور سب چچا اور کنبے کے لوگ جب اس بات سے نا اُمید ہو گئے کہ ابیطالب کے ذریعے سے کوئی کام بنجائے گا تو انھوں نے خود ہی سلوک اور آشتی کے ساتھ آنحضرت کو راضی کرنے کی ایک چال چلی۔ اور ان میں سے بڑے بڑے لوگوں نے ندوہ میں جمع ہو کر آپ کو بلا بھیجا، وہ آئے تو بڑی خاطر تپاک سے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان سے کہا، محمد صلے اللہ علیہ وسلم! ہم نے تم سے کچھ کہنے کے لئے تو یہاں بلایا ہے؛ سنو واللہ ہم کو عرب کے تمام ملک میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں معلوم ہوتا، جس نے اپنی قوم پر ایسی بلا نازل کی ہو جیسی کہ تم نے اپنی قوم پر آفت ڈھائی ہے اور اسے ذلیل بنایا ہے۔ تم نے باپ دادوں کو گالیاں دی ہیں دین میں عیب نکالے ہیں، دیوتاؤں کو برا کہا ہے، احلام کو سفیہ قرار دیا ہے اور گروہ کی متحدہ قوت کو توڑ دیا ہے۔ غرضکہ کوئی بڑی بات ایسی نہیں رہ گئی جو کہ تم ہمارے اور اپنے مابین نہیں کر چکے (یعنی ہم سے کوئی برائی کرنے کو اٹھا نہیں رکھی) اگر ان باتوں سے تمھاری غرض طلبِ مال ہے تو ہم سب مل کر اپنے مال و متاع میں سے تمھیں اس قدر جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے بڑھ کر مالدار ہو جاؤ۔ اگر ہمارے قبیلے میں شرف و عزت کا خیال ہے تو ہم تم کو اپنا سردار بنالیں، بادشاہت کا خیال ہو تو اپنا بادشاہ مان لیں؛ اور اگر یہ صورت جو تم کو پیش آیا کرتی ہے جنون اور دیوانگی کی قسم سے ہے تو ہم کسی حاذق طبیب کی تلاش میں اپنے اپنے مال کو خرچ کرنے پر تیار رہیں، تمھارا علاج کرائیں گے جس سے تم کو صحت ہو جائیگی:

اور صحت نہ ہوئی تو پھر تم کو اس معاملے میں معذور خیال کریں گے۔

رسولِ اکرم کا جواب: حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا: نہ تو میری وہ حالت ہے جو تم نے بیان کی، اور نہ میرا مقصود مال و منال اور جاہ و عزت کی طلب ہے، بلکہ خداوندِ کریم نے مجھکو پیامبر بناکر تمھارے پاس بھیجا ہے، مجھ پر ایک کتاب اتاری ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تم کو اس کے انعام کی خوشخبری دوں اور اس کے عذاب سے ڈراوں۔ لہذا میں اپنے پاک خدا کے احکام تمھیں پہنچاتا اور نصیحت کرتا ہوں۔ اگر تم میری بات اور رسالت کو قبول کرلو گے تو یہ امر تمھاری دنیوی اور اخروی بہتری کا سبب ہوگا۔ ورنہ اگر میرے قول کو رد کروگے، تو میں اس وقت تک صبر کروں گا، جب تک کہ خود اللہ پاک میرے اور تمھارے معاملے کا کوئی فیصلہ نہ کردے۔

ایذا رسانی اہلِ قریش نے آنحضرت کو ہدایتِ اسلام سے روکنے میں اپنی کوششیں ضائع ہوتی دیکھکر ایک نیا طرز اختیار کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو جو بہت تھوڑے تھے ستانا اور طرح طرح سے دق کرنا شروع کردیا۔ پہلے تو مسلمانوں نے ان ظلموں اور تکلیفوں کو جو انھیں قریش سے پہنچتی تھیں صبر کے ساتھ سہا، لیکن کہاں تک برداشت کرتے آخر تنگ آگئے اور قریش کی سخت اذیتوں اور قسم قسم کی اہانتوں کے تحمل سے عاجز ہوگئے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ حالت دیکھکر ان مسلمانوں کو جن کا کوئی کنبہ نہ تھا کہ انھیں دشمنوں سے بچاتا حکم دیا کہ مکہ سے نکلکر ملک حبش کو چلے جائیں۔ ان بےچاروں نے آگے پیچھے ترکِ وطن کیا اور ملکِ حبش کو چلے گئے۔ مہاجرین کی تعداد عورتوں اور بچوں کے علاوہ صرف (۸۳) مردوں تک پہنچی تھی اور یہ پہلی ہجرت (ترکِ وطن) تھی جو آغازِ اسلام میں ہوئی۔ یہ بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ مکہ سے حبش کا سفر کرنے میں کس قدر دقتوں کا سامنا کرنا کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ خشکی کے راستہ کو طے کرکے دریائی سفر کی مصیبت جھیلنی پڑتی ہے اور خاص کر ان دنوں میں تو یہ سفر اور بھی تکلیف دہ ہوگا۔ ان سب باتوں پر طرّہ یہ کہ اسباب، مال، دولت، اور بال بچوں کا ساتھ لے جانا، کس قدر دقتوں کا

سیف رہا ہوگا۔ یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں اسلام کا اعتقاد کس مضبوطی سے جما ہوا تھا؛

دعوتِ اسلام کی تاریخ مدت دراز تک مطالعہ کرتے رہنے اور غور کرنے سے جو بات ہمارے خیال میں جم گئی ہے اس کے بیان کرنے کے لئے اس مقام پر تھوڑی دیر کے واسطے اصل مدعا کے بیان سے رک جانا ہے اور روئے سخن دوسری جانب پھیر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے؛ ہمارا وہ خیال حسب ذیل ہے؛

اعتراضات کے جوابات

بعض غیر مسلم مؤرخوں نے کہا ہے کہ صاحب شریعت اسلامی سرداری اور وجاہت دنیاوی کی طمع میں اس دعوت پر اٹھے تھے؛

مگر ہم اس قول کی گنجائش نہیں پاتے خود دعوتِ اسلام کی تاریخ صاف صاف دلالت کر رہی ہے کہ پیغمبر اسلام (صلے اللہ علیہ وسلم) بالکل سچائی اور اخلاص کے ساتھ اس بات پر آمادہ ہوئے تھے وہ اپنی رسالت کی صحت کا یقین کامل رکھتے تھے اور لوگوں کو اس خیال کے ساتھ اسلام کی ہدایت کرتے تھے کہ حق سبحانہٗ تعالےٰ نے اُنھیں اس کی اشاعت کے لئے بھیجا ہے۔ اگر اُن کا یہ خیال نہ ہوتا تو وہ ان قسم قسم کی تکلیفوں اور اذیتوں پر جو اس دعوت کی راہ میں اُنھیں پہنچیں صبر کرتے؛ پھر یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام کی ہدایت شروع کرنے سے پہلے وہ تمام اہلِ مکہ کے نزدیک قابلِ عزت تھے، مکہ کے رہنے والے سب کے سب اُنھیں دل سے عزیز رکھتے اور اُن کی حرمت کرتے تھے، اور بی بی خدیجہ سے نکاح کرکے ان کے مال سے تجارت کرنے کے باعث وہ کافی طور پر مالدار اور آرام کی امیرانہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گئے تھے مگر ہدایتِ اسلام کو ظاہر کرنے کے بعد ہی وہ سب کی نظریں کھٹکنے لگے۔ وہی مکہ کے لوگ جو پہلے ان کی خاطر کرتے تھے اب اُن کے سخت دشمن اور خون کے پیاسے ہو گئے تھے، طرح طرح کی تکلیفیں دیتے اور اہانت کرتے رہتے؛ اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ بنی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے قرابت مند ہونے کی وجہ سے بنی ہاشم کے بھی دشمن بن گئے اور اپنے جتھے میں یہ عہد و پیمان کر لیا

کہ بنی ہاشم کے کنبہ میں شادی بیاہ نہ کریں گے اور ان کے ساتھ خرید و فروخت کرنا بند کردیں گے اس کے متعلق ایک اقرار نامہ پر لکھکر کعبہ کے اندر باحتیاط رکھدیا، جس کی وجہ سے بنو ہاشم مکہ سے نکلکر پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور تین سال تک کوہستانی دروں میں مقیم رہے، اگر مکہ میں آتے تو چھپ کر آتے تاکہ کسی کو خبر نہ ہو سکے، البتہ بنو ہاشم میں سے جن لوگوں نے اہل قریش کا ساتھ دیا تھا اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی عداوت کا اظہار کیا تھا وہ ان باتوں سے بری رکھے گئے، مثلاً ابی لہب وغیرہ۔

رسولِ اکرم کا استقلال

پس نظر بحالات بالا یہ اعتراض ٹھیک نہیں ہو سکتا کہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) اپنے چچا ابی طالب کی حمایت میں ہونے کے باعث ثابت قدم رہ سکے۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ اس قدر استقلال دکھاتے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت اپنے چچا کے انتقال کے بعد پہلے سے بھی بڑھکر استقلال و استقامت کے ساتھ ہدایتِ حق کا کام انجام دیتے رہے، اور لوگ بہ نسبت پہلے کے اب انھیں بہت زیادہ تکلیف دیتے تھے۔ خصوصاً بی بی خدیجہؓ کے انتقال کے بعد پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہ ناقابلِ بیان تھے ان دونوں حامیان نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کا انتقال ہجرت سے تین سال پہلے ہو گیا تھا، ان کی وفات سے جو پے درپے مصیبتیں نازل ہوئیں ان کے علاوہ سخت آفت قریش والوں کا ظلم و ستم تھا، اور خاص کر خود نبیؐ کے چچا ابو لہب اور حکم بن العاص اور عقبہ بن ابی معیط کے مظالم، کیونکہ یہ تینوں ان کے پڑوسی تھے اور گھر سے گھر ملے ہوئے ہونے کی وجہ سے اُن کے کھانے پینے کی چیزوں میں غلاظت پھینکتے، اور جب وہ نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو ان پر گندگیوں کی بوچھار کرتے۔ یہاں تک کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس سختی اور ستم پر صبر نہ کر سکے تو اس خیال سے کہ شاید وہاں کوئی شخص حق کی امداد اور ان کی ہدایت قبول کرنے پر آمادہ ہو سکے طائف کو چلے گئے، اور وہاں بھی اسی قسم کا سلوک ہوتا دیکھکر واپس ہوئے لیکن اپنی ہدایت میں سے ایک حرف بھی کم نہ کیا۔ طائف والوں نے اسی پر بس نہ کیا کہ آپ کی بات نہ سُنی بلکہ انھوں نے اپنے یہاں کے

بدمعاشوں اور غلاموں کو اُبھارا کہ وہ لوگ آنحضرت کو گالیاں دیں؛ اور ان کے پیچھے پیچھے ہیو۔ ہاکا شور مچا کر انھیں دق کریں جس کو وہ لوگ بجالائے، یہاں تک کہ بہت سے آدمی اکٹھے ہو گئے؛ اور انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دیوار کی پناہ میں لے کر ان بدمعاشوں کو دور کیا؛ حضرت نے اس حالت کو دیکھکر سمجھ لیا کہ وہ کیسی سخت مصیبت میں مبتلا ہیں، اُنھوں نے اپنے معاملے میں خدا سے فریاد کی اور مکّہ کو پلٹ آئے؛ ان پریشانیوں سے بھی ان کے پختہ ارادے میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا؛ مکّہ میں پھر اُنھیں اپنی قوم سے سابقہ پڑا؛ جواب پہلے سے کہیں بڑھکر ان کو ایذا دیتے تھے؛ انھوں نے اس واپسی کے بعد اپنی حالت کا اندازہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ اپنے اور بیگانے تمام لوگوں نے اُنھیں چھوڑ دیا ہے اور سب ان کے جانی دشمن بن گئے ہیں؛ وہ بخوبی جانتے تھے کہ میں ہدایت کرنا چھوڑ دوں تو میرے ہموطن اور عزیز مجھ سے بیحد رضامند ہو جائیں گے اور جیسی چاہیئے ویسی خاطر سے پیش آئیں گے کیونکہ وہ لوگ بارہا صاف صاف اس بات کو کہہ چکے تھے، مگر انھوں نے ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں کی؛ اس تمام استقلال اور مصیبتوں کے بخوشی برداشت کرنے پر بھی ترکِ ہدایت نہ کرنے سے اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دعوے کی سچائی اور اپنے مرسل من اللہ ہونے کا یقین کامل تھا؛

اہلِ وطن سے ناامیدی

حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو اپنے عزیزوں اور ہموطنوں کے راہِ راست پر آنے سے نااُمیدی ہو گئی۔ انھوں نے حج کے دنوں میں باہر سے آنے والے قبائل کو وعظ و نصیحت شروع کی اور اُنھیں اسلام کی جانب بلانے لگے تاکہ شاید کوئی شخص تو ان کی آواز سُن لے؛ ان کے کنبے والے اس کام میں بھی رُکاوٹ ڈالنے پر تیار رہو گئے؛ خاصکر ان کا چچا ابولہب؛ اس کی تو یہ حالت تھی کہ جب اور جہاں آپ کو کسی قبیلے سے اسلام کے بارے میں کچھ کہتے دیکھتا آکر ان کی بات کاٹ دیتا اور لوگوں سے کہتا یہ شخص محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) تم سے لات و عزّے کی پرستش چھوڑا کر --- گمراہی و بدعت

کی وہ باتیں منوانا چاہتا ہے جو اس نے خود نکالی ہیں؛ خبردار اس کی بات کبھی نہ سُننا مگر آنحضرت کو ان باتوں نے لوگوں کی ہدایت سے باز نہ رکھا؛ وہ ہمیشہ حج کے دنوں میں دعوتِ اسلام فرماتے رہے؛

اہلِ مدینہ کی بیعتِ اسلام

یہاں تک کہ آخر کار یثرب کے رہنے والوں میں سے چند شخصوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی اور وہ لوگ تھوڑی ہی مدت میں اس شہر کے اندر اشاعتِ اسلام کا ذریعہ بن گئے۔ ممکن ہے کہ یثرب میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کا سبب یہ ہوا کہ یہودی وہاں بکثرت آباد تھے؛ کیونکہ وہ اہلِ کتاب اور وحیٔ آسمانی کے معتقد تھے، بنوت کے معنی کو سمجھتے تھے؛ اُن میں ایسا شخص کوئی بھی نہ تھا جو بتوں کی عبادت کے زائل ہو جانے سے کاروبار تجارت کے بگڑ جانے کا خوف کھاتا ہو بلکہ وہاں کے لوگ بتوں کی عبادت ٹلنے کو اس لحاظ سے بہتر جانتے تھے کہ اس کے ساتھ ہی مکہ کا عروج جاتا رہے گا۔ اور ان کے شہر کو رونق حاصل ہوگی، بالخصوص جب خود ہادیٔ اسلام وہاں آگئے اور وہ نئے مذہب کا مرکز بن گیا جس کی روسے لوگ بجائے مکہ کا حج کرنے کے مدینہ کی زیارت کو آنے لگے، دولت کمانے کے معاملات اور تجارت کے اصول میں یہودیوں کی مناسبتِ طبع اور ہوشیاری مشہورِ عام ہے، علاوہ بریں مکہ اور یثرب ان دونوں شہروں میں جو باہمی چشمک اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے اور باہم حسد رکھنے کے اسباب موجود تھے وہ بھی اس امر کا باعث ہوئے کہ مدینہ میں اسلام کو رونق حاصل ہو کیونکہ مکہ کے رہنے والے عدنانی تھے اور مدینہ کے باشندے قحطانی نسل سے یعنی یمن کے عربوں کی اولاد تھے، اس لئے مدینہ والوں نے حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو ہمت دلائی اور ان سے یہ وعدہ کیا کہ آپ ہمارے یہاں آئیں ہم آپ کی مدد کریں گے۔

ہجرتِ مدینہ

غرضکہ آنحضرت نے ۶۲۲ء میں مدینہ کی جانب ہجرت کی اور ان کے ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں نے بھی اپنے وطن کو چھوڑ دیا جو آپ کے کنبے میں سے آپ پر ایمان لائے تھے؛ یہ لوگ صحابہ کے دوسرے

گروہ "انصار" سے تمیز رکھنے کے لئے "مہاجرین" کے نام سے مشہور ہوئے۔ مدینے والوں کا نام "انصار" اس لئے ہوا کہ انھوں نے اپنے شہر میں نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی۔ اہل اسلام اپنے واقعات کی تاریخ آج تک اسی ہجرت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

مسلمانوں کو مدینہ میں نہایت عمدہ طور سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جس سے ان کی اُمیدیں تازہ اور ان کے دل مضبوط ہو گئے۔ وہ مکہ والوں سے ان کے ظلم و ستم کا بدلہ لینے پر متوجہ ہوئے اور ان دشمنان اسلام سے وقتاً فوقتاً کئی لڑائیاں لڑے۔ ان جنگوں کا نام "غزوات" مشہور رہے۔ ان میں سب سے بڑا "غزوہ بدر" تھا جس میں مسلمانوں کو کامل فتح نصیب ہوئی، اور یہی فتح ان کے لئے دوسری جنگوں میں فتحیابی کا نیک شگون تھی۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں نے تمام جزیرہ عرب کو سر کر لیا، شہر مکہ بھی فتح کر لیا، اور قبیلہ قریش کے تمام لوگ ایمان لے آئے۔ اس اندرونی انتظام کے بعد نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے خارجی دنیا کی طرف توجہ کی اور بادشاہان عالم کو اسلام کی دعوت کے خطوط لکھے۔ جس کے حالات تواریخ میں موجود ہیں اور اپنے موقع پر ہم بھی بیان کرینگے



ظہورِ اسلام کے وقت رومیوں اور فارسیوں کی حالت

۷۵۳ قبل مسیح میں رومتہ الکبریٰ کی بنیاد پڑی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ رومانی سلطنت کا وجود قائم ہوا۔ ایک ہزار پچاس سال تک شہر رومیہ اس سلطنت کا پایۂ تخت رہا، اور اس عرصہ میں رومانی حکومت کا دور دورہ زوروں پر تھا یہاں تک کہ اس نے تمام آباد دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ ۳۲۱ء میں پایۂ تخت بیزانیتوم میں منتقل ہو آیا۔ چونکہ قسطنطین کبیر (اعظم) اس نقلِ مکان کا باعث ہوا تھا، لہٰذا اُس نے اس نئے دارالسلطنت کا نام اپنے نام پر "قسطنطنیہ" رکھا، اور آج تک اس کا یہی نام ہے ۳۳۷ء میں قسطنطین اعظم کی موت کے بعد اس کے تین بیٹوں نے ملک کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا، لیکن اس کے بعد وہ تمام ملک ہر پھر کر ایک ہی لڑکے کے پاس آگیا جس کی وفات ۳۶۰ء میں ہوئی۔ اس کے بعد یولیان تخت نشین ہوا۔ اور یولیان کے بعد ۳۶۴ء میں جوفیان نامی مالکِ تخت و تاج ہوا، اتفاق چند ہی مہینوں کے بعد یہ بھی مرگیا، اور چونکہ کوئی وارث نہ تھا، لہٰذا رومانی قوم نے کثرتِ رائے سے "فالنتیان" نامی ایک شہنشاہ انتخاب کیا، فالنتیان نے اپنے انتخاب کے بعد کچھ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا، کہ رومیہ کا شہنشاہ اپنے بھائی "فالنس" کو بنا دیا، اس واقعہ کے بعد رومن امپائر کے دو علیحدہ علیحدہ حصے ہو گئے۔ جن میں سے ایک حصہ مشرقی رومن امپائر کا تھا اس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ رہا، اور دوسرا حصہ مغربی رومن امپائر کا جس کا پایۂ تخت قدیم یعنی رومیہ باقی تھا۔ مگر اوّل الذکر حصہ کی عمر اور شان و شوکت دونوں باتیں آخرالذکر سے زیادہ ہوئیں۔ اور قسطنطنیہ

علم و حکمت کا گھر، سلطنت کا مرکز اور مذہب کا مرجع بن گیا۔

مشرقی روم کی فتوحات

مشرقی رومن ایمپائر کی حدودِ اربعہ پانچویں صدی عیسوی میں حسبِ ذیل تھیں:

مغرب میں بحیرہ ایڈریاتک، مشرق میں دریائے دجلہ کے سواحل، شمال میں بالائی حصہ ملک تاتار اور جنوب میں اس کی حدود ممالک حبشہ تک وسیع تھیں قسطنطین اعظم کے بعد اس سلطنت کو سب سے بڑھکر ترقی کا زمانہ اس وقت نصیب ہوا ہے جبکہ اس کی حکومت قیصر یوسینیانوس، کے قبضہ میں آئی؛ (یعنی ۵۲۷ء لغایت ۵۶۵ء) یہ قیصر ۳۹ سال حکمران رہا۔ اپنی حکومت کے ابتدائی پانچ سال ساسانی بادشاہانِ فارس کے ساتھ جنگ میں بسر کئے۔ یہ جنگ ایک ایسے عہد نامہ ہونے پر ختم ہوئی جس کا نام دائمی صلح کا معاہدہ رکھا گیا تھا، اگرچہ بعد کو وہ صلح قائم نہ رہی۔

اس قیصر کو خوش قسمتی سے ایک نہایت دلیر اور مدبر جنرل، بلیزاریوس نامی، مل گیا تھا، جو دنیا کے مشہور فاتحوں میں سے گزرا ہے۔ اس جنرل نے اس کے لئے اٹلی کو فتح کیا، رومۃ الکبریٰ کی فصیلوں پر اس کا پھریرا اڑایا، اور شمالی افریقہ وغیرہ ممالک کو مسخر کیا، غرضیکہ بلیزاریوس، قیصر یوسینیانوس کا فتوحاتِ ملکی میں دست و بازو اور اس کی قلمرو کو وسیع کرنے میں بہر طور معین و مددگار تھا۔

فارس و روم کی جنگیں

فارس روم اور (یونان) کے رہنے والوں میں قدیم سے عداوت چلی آتی تھی؛ شاید کہ پانچ صدی قبل از ولادتِ مسیح اس کا وجود ہوا تھا، اس کا اصلی سبب بنیادی حکومت کی خواہش تھی کیونکہ ان دنوں یہی دونوں سلطنتیں دنیا کی سب سے بڑی سلطنتیں تھیں، اس لئے ان میں سے ہر ایک دوسرے کے مقابل اپنے عروج اور زیادتی ملک کی خواہش مند رہتی تھی، اس دشمنی کا سلسلہ سکندرِ اعظم کے زمانے تک اور اس کے بعد رومانیوں کے عہدِ حکومت میں اسلام کے عہد تک قائم رہا۔

قیصر یوسینیاں کے زمانہ میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے فارس کے تخت پر کسریٰ

نوشیروان کا جلوس ہوا تھا، جو عادل کے لقب سے مشہور ہوا ہے۔ نوشیروان کو رومیوں سے صلح رکھنا پسند نہ آیا اس نے اپنی فوجوں کو آراستہ کر کے ممالک روم پر حملہ کر دیا۔ سوریا (ملک شام) فتح کر کے شہر انطاکیہ کو پھونک دیا۔ ایشیائے کوچک میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اس حالت کو دیکھکر، یوستینیاں نے بلیزاریوس کو اس کے مقابلہ پر روانہ کیا، جس نے نوشیروان سے کئی ایک میدانی لڑائیاں کر کے اُسے پسپا کر دیا، کسریٰ نے اس خفیف سی شکست سے سنبھل کر پھر دوبارہ حملہ کیا اور آخر کار اُسے پھر پیچھے ہٹنا پڑا۔ لیکن وہ شکستہ دل نہیں ہوا۔ اور برابر سنبھل سنبھل کر حملے کرتا رہا، جس کی وجہ سے ان دونوں سلطنتوں کے مابین متواتر بیس سال تک ۵۴۱ء تا ۵۶۱ء جنگ قائم رہی، اور دونوں بادشاہ دق آ گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں صلح پر متفق ہوئے جس میں یوستینیاں پر تیس ہزار دینار سالانہ خراج ادا کرنا مقرر ہوا۔ اس کے بعد دونوں سلطنتوں کی سرحدیں اسی طرح قائم رہیں جیسی کہ لڑائی سے پہلے تھیں۔

یوستینیاں کے کارنامے

مشرقی رومن ایمپائر کی تاریخ میں، قیصر یوستینیاں، نہایت نیک نام شہنشاہ گزرا ہے۔ اس کے زمانہ میں اس حکومت کو بہت کچھ عروج اور اثر حاصل ہوا تھا اور اس کے ان کارناموں میں سے جنھوں نے قیامِ دنیا تک اس کے نام کو زندہ بنا دیا اس کے وہ قوانین اور احکام تھے جو بعد کے زمانے میں وضعِ قانون کی بنیاد ہوئے اور آج تک قانون سازی کے اصول ہیں۔ اسی نے یورپ میں حریر کی صنعت کو داخل کیا۔ کنیسے تعمیر کرائے، چھاؤنیاں بنوائیں۔ محلات کی بنائیں رکھیں، اور سب سے زیادہ مشہور چیز جو اس کے نام کو یاد دلاتی ہے ایا صوفیہ کا گرجا ہے جسے عثمانی سلاطین نے فتح قسطنطنیہ کے وقت مسجد جامع بنا لیا تھا اور آج تک وہ جامع ایا صوفیہ کے نام سے مشہور اور ان سیاحوں کے لئے قابل دید عمارت ہے جو قسطنطنیہ آتے ہیں۔

مشرقی روم کا زوال

لیکن چونکہ شخصی حکومتوں کی ترقی اور تنزل کا باعث

ان کے حکمرانوں کی قابلیت یا نالائقی ہوا کرتی ہے؛ اس لئے اگر ان کا بادشاہ صاحب شان اور عالی ہمت ہے تو وہ بھی عظیم الشان سلطنتیں ہو گئیں، ورنہ یا تو بالکل مٹ گئیں یا برائے نام مختصر سی ریاستیں رہ گئیں؛ یوستینیا کے مرنے کے بعد ایسے لوگ تخت نشین ہوئے جن میں شاہی اور حکمرانی کے جوہر ہی نہ تھے؛ اور وہ اس قابل بھی نہ ہوئے کہ اتنی عظیم الشان سلطنت کو صرف سنبھالے ہی رہتے، اسی وجہ سے اس کی تمام شان و شوکت مٹ گئی۔

اہل فارس پر حملہ

یوستینیاں کے بعد اس کا بھتیجا، یوستین دوم، اور اس کے بعد طیباریوس، تخت نشین ہوئے اور ان کے بعد شہنشاہ موریس دموریقوس کی باری آئی۔ جس وقت موریس تخت پر بیٹھا ہے سلطنت کی حالت نازک ہو چکی تھی، اور اندرونی و بیرونی فسادات کا زور شور تھا؛ موریس نے خیال کیا کہ خانہ جنگیاں شروع کرنے سے سلطنت کی رہی سہی دھاک بھی جاتی رہے گی۔ اس کی حالت سنبھالنے کے لئے غیر ممالک کی فتوحات کا سلسلہ زیادہ مناسب ہوگا؛ لہٰذا اُس نے مشرقی دنیا پر حملہ کرنے کا قصد کر کے اہل فارس کو اپنا شکار تجویز کیا۔ اور فارس والوں سے جنگ چھیڑ دی؛ سات برس تک اُن سے لڑتا رہا، لیکن کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکا؛ یہاں تک کہ ۵۷۹ء میں کسریٰ (نوشیرواں) کا انتقال ہوا؛ اور اس کی جگہ اُس کا بیٹا ہرمز د چہارم؛ اورنگ سلطنت پر جلوس فرما ہوا؛ ہرمز نہایت ظالم اور جابر تاجدار تھا اس لئے خود اس کی رعایا باغی ہو کر اس پر ٹوٹ پڑی، وہ اس بغاوت کو ہی فرو کرنے میں مصروف رہا اور حدود سلطنت کی حفاظت پر توجہ نہ کر سکا جس کی وجہ سے رومیوں کو میدان صاف ملا۔ اور وہ عراق کی جانب بے تکلف قدم بڑھاتے چلے گئے؛

ایرانی جنرل بہرام

ادھر سے رومیوں کی قتل و غارت کا زور تھا، ادھر دوسری جانب شمال اور مشرقی حدودِ ملک پر تاتاریوں نے بھی چھاپے مارنے اور لوٹ مار کا سلسلہ قائم کر رکھا تھا؛ ان دو بیرونی اور ایک اندرونی ایسے تین تین مخالفوں کے پنجوں میں گرفتار ہو کر قریب تھا کہ سلطنت فارس کا وجود ہی نیست

مٹ جائے ، مگر خداوند پاک کی مرضی نہ تھی ، لہٰذا اس نے ملک فارس کو ایک ایسا دلیر اور مدبر جنرل عطا فرمایا ، جس نے ملکی بغاوت ، رومی فتوحات اور ترکمانی حملوں کا تھوڑی ہی مدت میں پانسہ پلٹ دیا ، اس جنرل کا نام بہرام تھا ، اس کی فتوحات اور اولوالعزمیاں دیکھ کر فارس کے باشندے اس کی جانب مائل ہو گئے اور ہرمزد کو تخت سے اتار کر اس کی آنکھوں کو گرم آہنی سیخوں سے پھوڑ دیا اور اس کی جگہ پر اس کے بیٹے پرویز کو تخت نشین کیا ، بہرام نے پرویز کی تخت نشینی منظور نہ کی اور اُسے ذلیل و خوار کیا ، پرویز خفیہ طور پر قسطنطنیہ بھاگ گیا اور امپرر موریس سے اپنا ترکہ آبائی حاصل کرنے کے لئے امداد چاہی ، موریس نے اُسے بخوشی ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ واپس کیا ، پرویز نے لڑ بھڑ کر بہرام کو زیر کیا اور پھر اپنا موروثی ملک لے لیا ، پرویز موریس کے اس احسان کا ہمیشہ ممنون رہا اور جب تک موریس زندہ رہا پرویز ہمیشہ اس سے احسان مندانہ برتاؤ کرتا اور رومیوں کا دوست بنا رہا ۔

ہرقل کا ظہور

سنہ ۶۰۲ء میں ، موریس قتل کر دیا گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا فوقاس تخت نشین ہوا مگر یہ جاہل اور ظالم تھا جس کی وجہ سے رعایا اس سے ناراض ہوئی اور اس فکر میں پڑی کہ کوئی ایسا زبردست شخص ملے جو ہمیں اس کے پنجے سے رہائی دلوائے ، انھیں دنوں میں رومانی سلطنت کے گورنروں میں سے ملک افریقہ کا ایک گورنر (اکٹیوسس) ہرقل نامی تھا ، قسطنطنیہ والوں نے اس سے امداد چاہی تو اس نے اپنے بیٹے ہرقل اصغر کو ایک جہازی بیڑہ کے ساتھ بھیجدیا ، ہرقل نے سنہ ۶۱۰ء میں فوقاس کو قتل کر کے تخت شاہنشہی پر جلوس کیا ، اسی کے زمانہ میں اسلام کا ظہور ہوا ۔

اہلِ رُوم پر ایرانی حملے

پرویز نے یہ تمام حالات و اخبار سُنے تو اُسے روم سے جنگ چھیڑنے کا بہانہ مل گیا ، اس نے یہ دعوٰی کر کے کہ میں اپنے دوست موریس کے قاتلوں سے بدلہ لینا چاہتا ہوں اپنی فوجوں کے ساتھ ملک شام پر حملہ کر دیا ، شام کے رہنے والے یہودی اس کے مددگار بن گئے ۔ پرویز نے تمام مصر در افریقیہ کو فتح کیا ، انطاکیہ ، دمشق ، بیت المقدس ، اور ملک شام و فلسطین کے دوسرے

تمام شہروں پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد اس نے اپنی فوج کو یروشلیم کے لوٹ لینے کی عام اجازت دیدی جنھوں نے اُسے لوٹ لیا، قبر مقدس کو جلا دیا، کنیسہ قیامنہ کو بھی پھونک دیا، جس قدر مال و خزانہ وہاں جمع تھا سب نکال لیا، وہاں کے بطریب کو پکڑ کر اور اصلی صلیب کو اٹھا کر اپنے ملک کو روانہ کر دیا۔ اسی طرح وہ ۱۶۱۶ء تک برابر ملک شام میں لوٹ مار کرتے رہے، اس عرصہ میں اُنھوں نے جس قدر عیسائیوں کو قتل کیا ان کی تعداد ۹۰۱۰۰۰ تک پہنچی تھی، پھر انھوں نے ایک اور فوج ایشیائے کوچک کی طرف بھیجی اور اُسے بھی فتح کیا، غرضکہ جہاں وہ جاتے فتح و ظفر اُن کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ قریب تھا کہ وہ لوگ تمام سواحلِ باسفرس کو پامال کر ڈالیں،



ہرقل شہنشاہ روم اور اس کے حاشیہ نشیں

ہرقل کا مقابلہ

ملک کی تو یہ حالت ہو رہی تھی اور ہرقل شہنشاہ روم اپنے محل میں عیش و عشرت کے رنگ میں گلچھرے اُڑا رہا تھا، نہ اُسے دشمنوں کے ظلم و تعدی کی پروا تھی اور نہ تباہی سلطنت کا خیال، لیکن جب اُسے

یقین ہوگیا کہ اب تباہی و بربادی کا وقت سر پر آگیا تو وہ خوابِ غفلت سے چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور سنبھلتا ہوا دشمنوں کی روک تھام اور ملکی انتظام کے لئے اُٹھا۔ حالت یہ تھی کہ نہ تو اس کے پاس مال اور خزانہ تھا جو فوجوں کی درستی میں کام آتا اور نہ فوج کی حالت اس قابل تھی کہ بلا فراہمی سامان جنگ میدان میں اُتر کر دشمنوں کا مقابلہ کر سکتی ۔ ہرقل نے مجبور ہو کر کنیسوں کا مال اس شرط پر قرض لیا کہ خاتمہ جنگ کے بعد اس کو معہ سود لے باق کرے گا اور فوج کو آراستہ کر کے دریائی راہ سے کلیکیا کو گیا جو ایشیائی کوچک میں ایک شہر ہے اور السبوس میں داخل ہوا، جس کا اہلِ فارس مقابلہ کئے ہوئے تھے۔ ۶۲۲ء میں اس نے بمقام مذکور فارس والوں سے پہلی میدان داری کی اور انہیں شکستِ فاش دی اسی سال میں اہلِ اسلام نے مکہ چھوڑ کر مدینہ کی جانب ہجرت کی تھی۔

اہلِ فارس سے جنگ

ہرقل نے متواتر تین برس تک فارس والوں سے جنگ جاری رکھی، یہاں تک کہ انہیں مارتا اور پیچھے ہٹاتا ہوا اُن کے ملک میں گھس پڑا اور پرویز مجبور ہوا کہ ملکِ مصر اور سواحل ایشیا سے اپنی فوجوں کو واپس بلا کر اُن سے اپنے اصلی گھر کی حفاظت کا کام لے اور اپنا پایۂ تخت دشمنوں کے حملے سے بچائے۔

ایران کی خانہ جنگیاں

ہرقل نے ۶۲۷ء میں دوسری مرتبہ پرویز کے ساتھ پھر جنگ کی اس مرتبہ اُس نے ایسا پُر زور حملہ کیا کہ اہلِ فارس مقابلہ کی تاب نہ لاسکے۔ اور بڑی زبردست شکست کھا کر پیچھے ہٹے۔ رومی فوجیں اشوریوں کے قدیم دارالسلطنت نینولی تک بڑھتی چلی گئیں۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ رومیوں نے اس شہر کو پامال کیا۔ پرویز جو اب بہت بڈھا اور کمزور ہوگیا تھا لہٰذا اس نے اپنے بیٹے مروز کے واسطے تخت نشینی کی وصیت کی۔ پرویز کا ایک اور لڑکا شیرویہ نامی بھی تھا۔ اُسے اپنے بھائی کے ولیعہد ہونے پر رشک آیا اور باپ بھائی دونوں کے ساتھ ایک چال چلنے کا قصد کیا، بعض ارکین سلطنت کو اپنے ساتھ گانٹھ کر اُن کی ۔ دستِ پرویز کی

باقیماندہ اولاد کو جن کی تعداد اٹھارہ تھی اور ان سب کو باپ کے روبرو قتل کر کے باپ کو قید خانے میں ڈلوادیا جو وہیں پڑے پڑے مرگیا؛ اس طرح پر کسریٰ پرویز کی موت سے ساسانی حکومت کی عظمت و اقتدار کا خاتمہ ہوگیا؛ پرویز کا ناخلف بیٹا شیرویہ بھی اس کے بعد صرف آٹھ مہینے زندہ رہا، اور شیرویہ کی جوانمرگی کے بعد حکومت فارس کی ہوا اُکھڑ گئی؛ چار برس کی قلیل مدت میں نو شخصوں نے سلطنت کا دعویٰ کیا جس کی وجہ سے تمام ملک میں بدامنی اور فساد کا زور ہوگیا؛ اور خانہ جنگیوں نے تمام قوت توڑ دی؛ اسی زمانہ میں جبکہ فارس مذکورہ بالا حالت میں گرفتار تھا اس پر مسلمانوں نے فوج کشی شروع کردی اور وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پامال ہوگیا؛

ادھر رومانی حکومت کا حال بھی ابتر ہو رہا تھا؛ یوروپین روم میں قوم گاتھ کے وحشی لوگوں نے ہلچل ڈال رکھی تھی۔ یہ لوگ آغازِ اسلام کے زمانہ میں ہنگاریا دمجر)کے مغربی حصے پر قابض ہوگئے تھے؛ علاوہ بریں مشرق کی جانب سے سلطنتِ روم کو ہونیوں کا بھی کھٹکا لگا تھا جو اُس پر حملے کرتے رہتے تھے؛

مذہبی اختلافات

روم و فارس کی سلطنتوں میں صرف انتظامی ہی خرابی نہ تھی بلکہ ان کے طرزِ معاشرت اور مذہبی امور میں بہت کچھ پیچیدگیاں پڑگئی تھیں جو ان کی جڑ کھوکھلی کررہی تھیں، ان کے مذہب میں بہت سے گروہ پیدا ہوگئے تھے، اور وہ سب باہم لڑتے جھگڑتے رہتے؛ چھٹی صدی عیسوی کے قریب رومیوں کی حالت بہت نازک ہو رہی تھی، ان میں بہت سے مذہبی فرقے پیدا ہوگئے تھے اور دھڑابندیوں کا زور تھا، خصوصاً ایک طبیعت اور دو طبیعتوں اور ایک مشیت اور دو مشیتوں کے مسئلے میں ان کے مابین سخت اختلاف و نزع پڑا ہوا تھا اُن کے متعلق ان کے جتھے میں جو پھوٹ پڑی ہوئی تھی وہ بہت ہی نقصان رساں تھی، مطلب اور مقصود دونوں جماعتوں کا ایک ہی تھا، لیکن نزاع لفظی کے پنجہ میں اسیر تھے، اور آخر کار اپنی اس حماقت کا شکار بھی ہوئے؛

حکومت اور مذہبی فرقوں کے اختلافات

شاہنشاہ اور ارکانِ سلطنت

اس کے قائل تھے کہ مسیح کی دو طبیعتیں اور دو مشیتیں ہیں اور اس کی رعایائے مصر وشام ایک ہی طبیعت اور ایک ہی مشیت ہونے کی قائل تھی۔ اس آخری جماعت کا نام یعقوبی تھا۔

شہنشاہ ہرقل کے عہد حکومت میں یعقوبی گروہ کے بطریرک اثنا بیوس نے جو منبج میں رہتا تھا اس امر کی کوشش بھی کی کہ دونوں جتھوں کو متفق کردے اور ان کے باہمی فسادات کو روک دے۔ اُس نے اس غرض سے امپرر کے ساتھ خط وکتابت بھی کی اور ایک نیا مذہب ایجاد کیا جو دونوں مذہبوں کے مابین متوسط مذہب ہو سکتا تھا۔ یعنے وہ اس بات کا قائل ہوا کہ مسیح کی طبیعتیں تو دو ہیں لیکن مشیت صرف ایک ہے۔ شہنشاہ نے اُس کے رائے سے اتفاق کیا اور اس قدر اور ٹھہر جائیے کہ میں قسطنطنیہ کے بطریرک سے اس معاملے میں گفتگو کرلوں جس کا نام بیروس تھا اور وہ اصل میں ملک شام ہی کا باشندہ تھا۔ اثنا بیوس نے اس امر میں شہنشاہ کے ساتھ سلسلہ جنبانی کرنے سے پہلے ہی بیروس کو اپنا ہمخیال بنا لیا تھا، اس لئے اس نے شہنشاہ کے دریافت کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ شہنشاہ نے اس نئے اعتقاد کو تسلیم کرنے کیلئے ایک فرمان صادر کیا جس کو اکثر مشرقی ملک کے اسقفوں نے تو قبول کرلیا لیکن یورشلم کے بطریرک اصفرونیوس اور کچھ تھوڑے سے اسقفوں نے جن کا سرگروہ عمان کا اسقف تھا اور نیز تمام شاہی چرچ کے پیروں نے اس اعتقاد کو منظور نہ کیا شہنشاہ کو یہ بات ناگوار ہوئی اور وہ عدول حکمی کرنے والوں سے بدلہ لینے پر تیار ہو گیا۔ جن میں رومی لوگوں کا بہت بڑا حصہ تھا اس طرح کئی گروہ میں باہم نفاق پیدا ہو گیا۔ خود شہنشاہ اور قسطنطنیہ اسکندریہ اور انطاکیہ کے بطریرک یہ سب ایک گروہ میں داخل تھے جو دو طبیعتوں اور ایک مشیت کا ماننے والا تھا اور یورشلم کا بطریرک اور تمام رومانی گرجا کے پیرو دوسرا گروہ تھا، جن کا یہ اعتقاد یہ تھا کہ مسیح کی طبیعتیں بھی دو ہیں اور مشیتیں بھی دو۔ یعقوبی گروہ یعنی قبطی حوران کے رہنے والے، اور تمام ملک مصر وشام کے اندرونی حصہ ملک کے باشندے یک علیحدہ گروہ تھے اور نسطوری یعنی عراق اور جزیرہ کے لوگوں کا جتھا جدا تھا۔ یہ فرقے ان گروہوں کے

علاوہ تھے جو پہلے سے موجود تھے مثلاً "خیالی" فرقہ کے لوگ جو کہتے تھے کہ حقیقت میں مسیح کو سولی نہیں دی گئی بلکہ ان کی جگہ ایک اور شخص کو سولی پر چڑھا دیا گیا؛ اور "اکیفالی" لوگ جو رؤسا کی فرمانبرداری کے قائل نہ تھے، یہ لوگ خارجیوں کی مانند تھے؛ پھر یعقوبیوں کی بھی بہت سی قسمیں تھیں جن کا بیان باعثِ طوالت ہوگا۔

مذہبی اختلاف کا نتیجہ

ان باہمی نفرتوں کا طرزِ حکومت پر بھی نہایت برا اثر پڑا، کیونکہ رومیوں کی سلطنت میں حکمرانی مذہب کے ساتھ ساتھ رہتی تھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بعض اوقات قوموں کی قومیں رومیوں کے قبضۂ اقتدار سے نکلکر فارس والوں کے زیرِ اثر ہوگئیں؛ جس طرح ارمینیا والے؛ کیونکہ جب قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ نے ایک طبیعت کہنے کی بدعت کو ناجائز ٹھہرایا تو شہنشاہِ روم نے اس کے ماننے والوں پر سخت گیری کی اور ان کو دق کرنا شروع کیا، آرمینیا والے بھی انھیں لوگوں میں داخل تھے حکام کے جور و تعدی سے دق ہوکر انھیں اس پر مجبور ہونا پڑا کہ اپنا ملک فارس والوں کے سپرد کردیں، اور رومانی حکومت کے پنجہ سے چھوٹ جائیں؛ یہی کام قبطیوں نے بھی کیا؛ جب عمرو بن العاص ملکِ مصر کی فتح کو آئے تو یہ لوگ ان کے مددگار اور طرفدار بن گئے؛ جس کا سببِ اصلی یہی باہمی نفاق اور جبر و تعدی سے بچنا تھا

یہودیوں اور عیسائیوں میں عداوت

اُمورِ مذکورہ بالا پر یہ ایک امر اور اضافہ کرنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں تعصب کی وجہ سے یہودیوں اور رومیوں (عیسائیوں) میں ایک خاص قسم کی سخت عداوت تھی، تو یہ دشمنی ہرقل کے زمانہ میں اس حد تک پہنچگئی تھی کہ ایکبار یہودیوں نے بغاوت کرکے انطاکیہ میں بڑی ہلچل ڈالدی، اور وہاں کے بطریرک کو . . . . قتل کرکے اُس کی لاش کی بڑی گت بنائی؛ آخر ہرقل نے ان کی جانب ایک بھاری فوج روانہ کرکے ان میں سے ایک جمِ غفیر کو قتل کرادیا؛ یہودیوں نے فینیقیہ کے دارالسلطنت "صور" میں بھی علمِ بغاوت بلند کرکے وہاں کے حاکم کو

قتل کر ڈالا؛ صور، فینیقیہ اور فلسطین کے یہودیوں نے آپس میں ٹھانی کہ رات کے وقت شہر صور میں گھس کر عیسائیوں کو قتل کر ڈالیں، صور کے مطران کو کسی طرح اس دغابازی کی خبر مل گئی، اس نے حاکم شہر کو ہوشیار کر دیا، اور حاکم شہر نے محافظ فوج اور دربانوں اور پہرہ داروں کو تاکید کر دی کہ اس رات چوکنے اور خبردار رہیں؛ رات کا اندھیرا ہوتے ہی یہودیوں نے باہر سے شہر پناہ پر حملہ کیا۔ لیکن یہاں فوج تیار تھی، اس نے مقابل ہو کر انھیں پسپا کر دیا؛ یہودیوں نے اس طرف ناکامیاب اور کھسیانے ہو کر شہر کے قرب و جوار میں جو دیر اور گرجے واقع تھے ان پر دھاوا بولدیا اور انھیں منہدم کر کے وہاں کے سامان اور برتن وغیرہ لوٹ لئے گئے؛ اور ایسا ہی سلوک گرد و نواح شہر کے دیہاتوں میں بھی کیا،

یہودیوں کا قتل عام حکومت نے یہودیوں کو اس شرارت کی سزا دی کہ شہر صور کے تمام یہودیوں کو ایک ایک کر کے قتل کرا دیا؛ اور اسی قسم کا واقعہ ملک فلسطین کے شہر قیسارية میں بھی ہوا؛ جہاں بادشاہ نے اپنے بھائی تاوودرس کو بھیجا جس نے جا کر وہاں کے تمام یہودیوں کو قتل کر ڈالا؛ ان وجوہ سے ملک کے ہر گوشہ میں یہودیوں کے اندر ایک غضب کی آگ بھڑک اٹھی؛ اور وہ حکومت کے جانی دشمن ہو گئے؛ جن باتوں نے رومیوں کو یہودیوں کی طرف سے ڈرا کر ان سے پرحذر رہنے پر آمادہ کیا تھا، ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ بعض نجومیوں نے شہنشاہ سے یہ کہا تھا کہ عنقریب ایک مختون شخص تمھاری سلطنت چھین لے گا؛ اسی بنا پر عرب والے کہتے ہیں کہ مختون لوگوں سے اہل اسلام مراد ہیں؛ یہودیوں نے جن برے طریقوں سے رومیوں کو تباہ و برباد کیا ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے فارس والوں سے اسی ۸۰ ہزار عیسائی قیدی خرید کر ان سبھوں کو ذبح کر ڈالا؛

یہودیوں سے عام بدسلوکی اس عداوت کا انحصار صرف رومیوں اور یہودیوں پر ہی نہ تھا؛ بلکہ در اصل عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین یہ عداوت عام تھی، عیسائی حکومتیں کوئی قانون بناتیں

تو اس میں چند دفعات خاص کر یہودیوں کے لئے مقرر کریں تاکہ ان کے ساتھ حقارت اور ظلم کا برتاؤ کر سکیں۔ مثلاً اسپین کی حکمران قوم گاتھ بادشاہوں نے فتوحِ اسلامی کے قریب قریب زمانہ میں اپنی یہودی رعایا کے لئے۔ حکومت قوم گاتھ کا دشمن نام تجویز کیا تھا۔ حکومت مذکورہ کی مذہبی مجلسوں نے اسرائیلی مذہب کی بیخکنی پر متفق ہو کر سلطنت کو حکم دیدیا تھا کہ یہودیوں کو اُن کے تہوار منانے سے روکا جائے، انہیں عیسائیت کی عزت کرنے پر مجبور کیا جائے، غرضکہ ان پر اس قدر سختی کی گئی اور دباؤ ڈالا گیا کہ وہ پریشان ہو کر بظاہر عیسائی بننے پر مجبور ہو گئے، لیکن ان کے دل برابر یہودی رہے جو طرح طرح کے ظلم و ستم اٹھانے کے رنج و عداوت سے اس قدر بھرے ہوئے تھے کہ ذراسی ٹھیس لگنے پر لوٹ جائیں۔ قوم گاتھ کے لوگ بھی یہودیوں کی اس دلی عداوت سے بیخبر نہ تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ لوگ یہودیوں کے ساتھ اصلی اور خالص عیسائیوں کا سا برتاؤ نہیں کرتے تھے بلکہ انھیں تمدن کے تمام جائز حقوق سے محروم کر رکھا تھا، ان کے واسطے باندی غلاموں کا خریدنا جرم قرار دیا تھا اور ان کے ذلیل کرتے رہنے میں اس قدر مبالغہ کرتے تھے کہ اُنھیں پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے سے منع کر دیا تھا، کیا ان سب باتوں کے معلوم ہو جانے پر بھی یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ یہودیوں نے اپنے عیسائی حکام کے مقابلے پر اہلِ اسلام عربوں کی امداد کی تھی۔

اہلِ فارس کے اختلافات

رہ گئے اہلِ فارس اُن کا طرزِ معاشرت بھی اسلام سے ایک مدت پہلے ہی سے بڑا انحطاط قبول کر چکا تھا، مانی اور مزدک کی وجہ سے مذہب میں شاخیں پھوٹنے سے ان کے مابین اختلاف و نزاع کا سامان موجود ہو گیا تھا، اس آخرالذکر شخص مزدک، کا یہ دعویٰ عجیب و غریب تھا کہ خداوند پاک نے اُسے اس لئے مبعوث کیا ہے تاکہ وہ عورتوں اور مال و دولت کو سب آدمیوں میں برابر تقسیم کر دے، اس لئے کہ وہ سب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں، اس مذہب کا اتباع فارس کے ایک بادشاہ قباد نامی نے کیا تھا، پھر اس کے جانشین نے اس مذہب کو توڑ کر ایک اور جدید مذہب اختیار کیا اور اب اختلاف رائے کا

سلسلہ بڑھنے لگا۔ جس کا نتیجہ فسادِ اخلاق ہوا

جس زمانہ میں روم اور فارس والوں کی حالت یہ کچھ تھی جو ہم بیان کر چکے ہیں ان دنوں اہلِ عرب اپنی ترقی کے عالم شباب میں تھے۔ ان میں اتفاق کی قوت موجود تھی۔ اور نیز انھیں ان رومی اور فارسی لوگوں سے جو اپنے حکام سے یا مخالف فرقوں کی زبردستی سے تنگ آن آن کر بھاگتے اور اہل عرب کے پاس پناہ لیتے، کافی مدد پہنچ رہی تھی۔



اِنتشارِ اسلام

اسلام کی تاریخ ہجرت کے وقت سے شروع ہوتی ہے ۔ مسلمانوں نے قریشیوں کی ایذا دہی اور شرارتوں سے تنگ آکر مدینہ کی جانب ہجرت کی ۔ وہ تھوڑے سے آدمی ہونے کے باعث اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے تھے ۔ پھر انھوں نے اہلِ مدینہ کو اپنی امداد و اعانت پر آمادہ پایا ۔ کیونکہ مشہور بیعتِ عقبیٰ کے ظہور نے انھیں اس کا یقین دلایا تھا کہ اہلِ مدینہ ہمارے سچے معین و ناصر ہوں گے ۔ نبی عربی (علیہ السلام) نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ مکہ چھوڑ دیں اور مدینہ چلے چلیں ۔ مدینہ کے لوگوں نے بھی ان نئے مہمانوں کی خاطرداری اور ان کو جگہ دینے میں بہت سی کشادہ دلی اور خلوص سے کام لیا ۔

اسلامی اخوت

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں پہنچنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مکہ کے رہنے والے قریشیوں اور یثرب کے باشندوں انصار میں باہم دوستی اور بھائی چارہ کرا دیا ۔ اس سے پہلے وہ لوگ ایک دوسرے سے چشمک رکھتے تھے، اور یثرب والے ہمیشہ مکہ والوں پر سبقت لے جانے کے خواہشمند رہتے تھے، مگر نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اسلام کو ان دونوں جماعتوں کے مابین رابطہ اتحاد بنا دیا ۔ اور دونوں فریقوں کے نام ایک عہد نامہ لکھا گیا جس میں انھوں نے ایک ہی قوم کے افراد ہونے کا اقرار کیا تھا ۔ ابنِ ہشام نے اس اقرار نامہ کی پوری عبارت نقل کی ہے ۔ اس کے بعد نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے قریش میں سے مہاجرین کو اور یثرب والوں میں سے انصار کو چند اور خاص معاہدوں کے ذریعہ باہم پیوند کر دیا ، ان معاہدوں کا نام (مواخاۃ) بھائی بندی رکھا گیا ۔ اور پیغمبر (علیہ السلام) نے بہت ہی استحکام کے ساتھ اس بھائی چارہ کا ان سے اقرار لیا ۔ اسلامی سلطنت کا پہلا بنیادی پتھر یہی "عہد مواخاۃ" تھا جو مہاجرین اور انصار کے مابین مستحکم کیا گیا ۔ اور

اس وقت میں مسلمانوں کی تعداد دہائیوں سے زیادہ نہ تھی، مسلمانوں کے ایک امن کی جگہ میں پہنچ جانے پر ان کے لئے زکوٰۃ اور روزے فرض ہوتے، شرعی سزائیں مقرر کی گئیں اور حرام وحلال کی حدود معین ہوئیں غرضکہ احکام اسلام پوری طرح نافذ ہونے لگے، رفتہ رفتہ مدینہ کے بعض ذی وجاہت لوگ بھی مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہوگئے ہیں جن کے اسلام لانے سے مذہب اسلام کو ایسی ہی امداد پہنچی جیسی کہ مکہ میں حضرت حمزہؓ اور عمر بن الخطابؓ کے اسلام لانے سے پہنچی تھی۔

غزوات عہدوپیمان ودوستی سے فراغت حاصل ہوگئی اور پُرامن جگہ میں رہنے سے اطمینان ہولیا تو مسلمانوں کو اہل مکہ کی ایذا دہی اور اُن کے مظالم کا خیال آیا، اُنھوں نے انتقام لینے کی غرض سے قریشیوں پر چھاپہ مارنے اور جنگ کرنے کا قصد مصمم کیا، اور بہت سے مشہور غزوات وجود میں آئے۔ جو اسلامی جنگوں کا مقدمہ تھے، اسلامی جنگ عرب کی معمولی عادت کے مؤافق جس کے وہ زمانہ جاہلیت سے عادی تھے چھوٹی چھوٹی مہموں اور قتل وغارت سے شروع ہوکر شہروں اور ملکوں کی فتح پر تمام ہوئی۔ ان غزوات میں سب سے اہم اور مشہور غزوہ "بدر کبرٰے" کی مہم تھی۔ کیونکہ اس جنگ میں مسلمانوں کی کامیابی نے انھیں پے درپے جنگ وجدل کرتے رہنے کا شوق دلایا اور ان کے ارادوں کو قوی بنادیا تھا۔

غزوہ بدر کبرٰے مکہ اور مدینہ کے مابین چند کنوئیں ایک مقام پر واقع ہیں جہاں پر مکہ سے ملکِ شام کو آنے جانے والے قافلے ٹھہرا کرتے ہیں۔ اسی مقام کا نام بدر ہے۔ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ قریشی تجارت پیشہ تھے ان کے قافلے ملکِ شام کو مال لینے جایا کرتے تھے، ۲ھ میں مسلمانوں کو خبر پہنچی کہ قریشیوں کا ایک قافلہ تجارتی مال لے کر ملکِ شام سے آتا اور مکہ کو جاتا ہے، اور اس قافلہ کے ساتھ بتیس محافظوں کا دستہ ہے جن کا افسر ابوسفیان بن حرب بانی مکہ کا سردار رکھا ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو اس قافلے کے غارت

اور اس کے محافظوں سے جنگ کرنے کے لئے روانہ کیا، ابوسفیان کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے بہت جلد ایک قاصد بھیجکر اہل مکہ سے کمک چاہی، مکہ سے نو سو پچاس شخص کمک پر چلے، جن میں سو (گھوڑے کے) سوار تھے، مسلمان بھی اپنی پوری طاقت کے ساتھ نکلے جن کی کل تعداد (۳۱۴) نفر تھی، ان میں ستر مہاجرین تھے، اور باقی انصار۔ تمام فوج کے پاس صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے، جس وقت اسلامی جماعت مدینہ سے باہر آئی ہے اُسے خبر ملی کہ قریش کا قافلہ بدر کے کنوؤں سے قریب آگیا ہے لہذا انھوں نے پیش قدمی کر کے کنوؤں پر قبضہ کر لیا، اور نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے لئے ایک عریش (کھجور کے پتوں کا بنایا ہوا چھپر) تیار کر دیا، جس کے نیچے وہ تشریف فرما ہوئے، اور ابوبکر رضؓ ان کے ساتھ تھے، اور دیگر اصحاب جنگ کی تیاری کرنے لگے،

دشمنوں کی کثرت اسی اثنا میں انھوں نے اہل قریش کو بھی آتے دیکھا جو اُن سے تگنی جمعیت رکھتے تھے، اور ان میں مکہ کے وہ چیدہ چیدہ لوگ شریک تھے جنھوں نے بہت زور کے ساتھ اسلام کا مقابلہ کیا تھا اور نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی دل کھول کر اہانت کی تھی، منجملہ ان کے ایک شخص ابوجہل بن ہشام بھی تھا۔ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے بھی سمجھ لیا کہ یہ لڑائی انقطاعی اور فیصلہ کن ہوگی، یا تو مسلمانوں کی فتح ہوگی اور جب وہ قریشیوں پر غالب آگئے تو اسلام کو بہت کچھ قوت حاصل ہو جائے گی یا پانسہ پلٹا اور مغلوب ہو کر بالکل نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اس لئے جب انھوں نے قریش کی آمد اتنی زیادہ دیکھی اور اپنے اصحاب کی قلیل جماعت پر نظر کی تو فرمایا "اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لاتعبد فی الأرض"، یعنے اے پاک خدا اگر یہ مختصر سا گروہ ہلاک ہو گیا تو روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔

کفار مکہ کی شکست عرب کی معمولی عادت کے مطابق ایک ایک آدمی نے طرفین سے نکل نکل کر مقابلہ شروع کیا، اسی اثنا میں ابوجہل مقتول ہوا، اور اس کا سر نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا،

جسے دیکھ کر انھوں نے خدا کے سامنے سجدۂ شکر ادا کیا؛ اب میدان کارزار گرم ہو گیا، فریقین ایک دوسرے سے بھڑ گئے؛ نیزے بیکار ہو کر تلواریں کھنچ گئی تھیں، اور کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ کچھ دیر کے بعد لڑائی کا رنگ بدلا، کفارِ مکہ پر شکست اور مسلمانوں پر فتحمندی کا سایہ ہوا؛ اس جنگ میں مسلمانوں کی جانب سے صرف چودہ شخص شہید ہوئے جن میں چھ مہاجر اور آٹھ انصار تھے اور قریش والوں کے ستر آدمی کام آئے جن میں قریش کے تمام گھرانوں کے معزز لوگ شامل تھے؛ خصوصاً بنو اُمیہ، بنی مخزوم، اور بنی اسد کے لوگ زیادہ تر تھے، اور اسی قدر یعنی ستر آدمی ان کے گرفتار بھی ہوئے جن میں عقبہ بن ابی معیط بھی تھا؛ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا، کیونکہ اُس نے مکہ میں آپ کو بہت ستایا تھا؛ اس جنگ میں سب سے زیادہ پرجوش اور کوشش کرنے والے مسلمان صرف دو تھے، ایک علی بن ابی طالب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی اور دوسرے حمزہ بن عبد المطلب پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا؛ قریش کے باقیماندہ لوگ تمام ساز و سامان چھوڑ کر مکہ کی جانب بھاگ نکلے اور انھیں ہزیمت خوردہ لوگوں میں ابو سفیان اور عمرو بن العاص بھی شامل تھے جو آخر کار اسلام کے مشہور جنرل ہوئے ہیں۔ مسلمانوں نے خوشی خوشی مالِ غنیمت اُٹھایا مگر اب اس کے حصے کرنے میں ان میں باہم نزاع واقع ہوا؛ نبی نے اپنے ہاتھ سے وہ سب مال لوگوں کو برابر بانٹ دیا اور اپنی ذاتِ خاص کے لیے کچھ نہ رکھا؛ اس کے بعد قریش والوں نے کچھ لوگ بھیجے، اور اپنے قیدیوں کا زرِ فدیہ ادا کر کے اُنھیں چھڑا منگایا، اس طرح بھی بہت سا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا؛ مکہ والے مارے بھاگے اپنے گھر واپس آگئے؛ اس شکست سے اہلِ مکہ کی شان و شوکت مٹ گئی؛ اور مسلمانوں کی دھاک بندھ گئی تھی؛ سب سے بڑی تائید اہلِ اسلام کو اس واقعہ سے پہنچی کہ اسلام کا مشہور دشمن ابی لہب بدر کی لڑائی میں خود نہیں شریک ہوا تھا؛ بلکہ اس نے ایک شخص کو اپنا قائم مقام بنا کر میدان میں بھیجا تھا؛ اہلِ عرب کی عادت تھی کہ وہ جنگ میں اپنا قائم مقام بھیجدیتے تھے؛ جس وقت اُسے قریش والوں کی شکست کی اطلاع ملی اس قدر رنج و غم میں

مبتلا ہوا کر اسی کو فت میں چند روز بعد مر ہی گیا، چونکہ بدر کا واقعہ اسلامی فتوح کی بسم اللہ تھا؛ لہذا تاریخ اسلام میں اس کا مرتبہ اور اس کی شان بہت بلند ہے؛

جنگِ اُحد قریشیوں نے بدر کی شکست کے بعد دوبارہ سنبھل کر دوسرے سال پھر جنگ کی تیاریاں کیں؛ اس مرتبہ ان کا سردار ابوسفیان تھا اور جنگ آوروں کی تعداد تین ہزار تھی جن میں سات سو زرہ پوش اور دو سو سوار تھے؛ یہ جرار لشکر بدر کے مقتول لوگوں کا بدلہ لینے کے لئے تیار ہوا اور مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے چلا؛ ان کے ساتھ عورتیں بھی تھیں؛ جو دف بجا بجا کر بدر کے مقتولوں کا نوحہ کرتی ہوئیں اور لوگوں کو مسلمانوں سے لڑنے کے لئے جوش دلاتی ساتھ چلتی تھیں، اس حملہ کے نامور لوگوں میں خالد بن الولید مخزومی بھی تھے، جو بعد میں اسلام کے ایک مشہور جنرل ہوئے؛ یہ فوج مدینہ کے مقابل پہنچی تو نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اصحاب کے ساتھ مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیئے؛ خود نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی رائے یہ تھی کہ مدینہ ہی میں ٹھہر کر مدافعانہ پہلو اختیار کیا جائے؛ اور صحابہ میں سے بھی ایک شخص عبداللہ بن ابی سلول نامی نے یہی رائے دی - مگر باقی صحابہ میدان میں نکلکر لڑنے پر مصر ہوئے اور نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کثرت رائے کی پیروی کر کے ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ دشمنوں کے مقابلے کو نکلے اور شہر مدینہ اور احد نامی پہاڑ کے وسط میں ٹھہرے، اسی پہاڑ کے نام سے یہ واقعہ بھی موسوم ہوا ہے؛ ابن ابی سلول مذکور اس پیچ و تاب میں تھا کہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اس کی رائے کی خلاف ورزی اور دوسروں کی پیروی کی ہے؛ جس وقت سب لوگ وسط راہ میں پہنچے ہیں وہ ایک تہائی لوگوں کے ساتھ مدینہ کو پلٹ گیا اور قریش والوں نے فوج میں یہ افواہ اڑادی کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) قتل کر دئے گئے، یہ خبر وحشت اثر سنکر مسلمانوں کے پیر اُکھڑ گئے اور جنگ میں انھیں فتح نصیب نہ ہوئی؛ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب شہید ہوئے اور ان کی شہادت ہی زیادہ تر ہزیمت کا موجب ہوئی جس طرح کہ ان کا اسلام لانا باعث ازدیاد و تقویت اسلام

ہوا تھا، مسلمانوں کے شہدا کی تعداد ستر شخصوں تک پہنچی، اور خود نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ایک پتھر لگنے سے سر (مبارک) میں چوٹ آئی اور اس زخم میں جھلم کی چند کڑیاں گھس گئیں جس سے خون بہ نکلا: قریش والوں نے مسلمانوں کے شہیدوں کو بہت ہی بیحرمت کیا، ان کے ناک کان کاٹ ڈالے یہاں تک کہ ہندبن عتبہ ابی سفیان کی بیوی (معاویہ کی ماں) نے حمزہؓ کا پیٹ پھاڑ کے ان کا کلیجہ نکال لیا اور دانتوں سے کچل کر نگلنا چاہا، لیکن نگل نہ سکی اور تھوک دیا؛

یہ واقعہ مسلمانوں کے لئے اس وقت تک کے تمام مصائب سے زیادہ سخت تھا، مگر چونکہ وہ پہلے سے فتح و نصرت کا ذائقہ چکھ چکے تھے، لہذا انھوں نے اس حزیمت کا الزام ابن سلول کی بیوفائی پر رکھ کر چھوٹی چھوٹی مہماتِ جنگ کا سلسلہ اس وقت تک جبکہ واقعہ خندق پیش آیا، جاری رکھا۔

واقعۂ خندق

اس جنگ کی وجہ یہ ہوئی کہ جب عرب کے قبائل نے قریش والوں کو اُحد کی جنگ میں کامیاب ہوتے دیکھا تو وہ سب کے سب اہلِ مکہ کے ساتھی بن گئے؛ ان میں قریش غطفان اور تمام عرب کے قبیلے شامل ہو گئے؛ اور ساتھ ہی یہودیوں کے دو گھرانے بنو نفیر اور بنو قریظہ بھی ان میں مل گئے کیونکہ مسلمانوں نے ان کو ان کے وطنوں سے نکال باہر کر دیا تھا، چنانچہ آگے چل کر اس کا ذکر آئے گا۔ ان لوگوں نے اور بھی قریش کو جنگ کے لئے ابھارا اور سترہ اٹھارہ ہزار آدمیوں کی عظیم الشان جماعت کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا، اس فوج میں چار سو گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ تھے، اور چونکہ وہ سب مختلف گھرانوں اور گروہوں سے مرتب تھی اس لئے اس واقعہ کا نام (واحزاب) بھی مشہور ہے، غنیم تو اس قدر کثیر تعداد میں تھے اور مسلمانوں کا شمار تین ہزار سے زائد نہ تھا، لہذا ان میں سخت بیچینی پھیلی اور ان پر خوف طاری ہو گیا، چونکہ پہلے واقعہ سے انھیں یہ سبق بھی مل چکا تھا کہ شہر سے باہر نہ جائیں لہذا وہ اِسی پر عامل رہے۔

خندق کی تجویز

ان دنوں صحابہ کے گروہ میں ایک شخص فارس کے رہنے والے

سُلیمان نامی موجود تھے، ان کو کسی قدر فنونِ جنگ سے آگاہی تھی، انھوں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو خندق کھودنے کی صلاح دی، عرب والے پیشتر سے اس طریقے کو جانتے نہ تھے لہٰذا انھیں ایک نئے کام میں تحیّر و تردّد ہوا۔ اس حالت کو دیکھ کر سلیمان نے کہا، جب ہم ملک فارس میں تھے تو دشمنوں کے حملہ کا خوف ہوتا تو اپنے پڑاؤ کے چاروں سمت خندق کھود لیتے تھے اور اس بات کا شمار تدابیر جنگ میں ہوتا تھا، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سلیمان کی رائے پسند فرما کر خندق کھودنے کا حکم دیا اور خود بہ نفس نفیس اصحاب کے ساتھ مٹی ڈھونے میں شریک ہوئے، مگر چونکہ مسلمانوں کے پاس خندق تیار کرنے کے لئے ضروری اوزار تک نہ تھے لہٰذا انھوں نے کسی قدر اس قسم کا سامان بنو قریظہ (یہودیوں) سے مستعار لیا اور چند دنوں میں جن کی تعداد دو ہفتوں کے قریب ہوگی بہت عمدہ خندق شہر مدینہ کے گرد تیار کرلی

آسمانی آفات کے اثرات

احزاب مدینہ کی چاروں جانب اُترے اور محاصرہ کئے ہوئے تھے، شہر پر حملہ کرنے سے خندق ان کو روکتی تھی، بیس دنوں سے زائد وہ یونہی پڑے رہے، اس عرصہ میں وہ پتھروں اور تیروں سے جنگ کرتے رہے؛ خندق کے معاملے نے اُنھیں خوف میں مبتلا کردیا تھا، وہ جانتے تھے یہ کوئی نیا فریب ہے، اس پر بھی بعض منچلوں نے مع گھوڑے کے خندق کو دجانا چاہا اور وہ اس میں گر پڑے اور ان کی گردنیں چور چور ہوگئیں۔ اس صورت نے اور بھی غنیم کے دلوں میں رعب پیدا کردیا، آخر اس نے بے نتیجہ محاصرہ سے دق ہوکر میدان میں نکل کے لڑنے کا ارادہ کیا اور اس کی جانب سے ایک شخص نے میدان میں آکر مسلمانوں میں سے اپنا مقابل طلب کیا؛ مسلمانوں میں سے علیؓ اس کے مقابلے پر گئے؛ اور ردّ و بدل کے بعد اس پر غالب آگئے؛ اس کے بعد سرد ہوا چلنی شروع ہوئی اور خوب زور کا پانی پڑا جس نے احزاب کے خیموں کو تر کرکے ان کے چولھوں کو ٹھنڈا کردیا، مدینہ والے اپنے گھروں میں باآرام بیٹھے تھے جن میں بہت کم تری کا اثر پہنچا تھا، غنیم اس آسمانی بلا سے اور بھی پریشان ہوا اور اسے اپنے لئے شگونِ بد خیال کرکے محاصرہ توڑ دیا اور پسپا ہوگیا؛ بلامنتِ غیرے دشمنوں کے اس طرح ہزیمت اُٹھانے سے مسلمانوں کو احد کی شکست کے ننگ سے بھی نجات مل گئی؛

یہودیوں کی جلاوطنی

یہاں تک جس قدر جنگوں کا ذکر ہوا ان میں فتح ملکی کا کوئی حصہ

نہ تھا بلکہ محض مار دھاڑ اور لوٹ کھسوٹ تھی، اسلامی فتوحات کی پہلی بسم اللہ، بنی نضیر یہودیوں کی سرزمین کو فتح کرنے سے ہوئی؛ بنی نضیر یہودیوں کا ایک گھرانہ تھا، ایک معاملہ ایسا آپڑا جس نے مسلمانوں کو ان لوگوں کے جلاوطن کرنے پر مجبور کیا؛ لہٰذا نبیؐ نے ان سے کہلا بھیجا کہ وہ سیدھی طرح کان دبا کر اپنے ملک و مال کو چھوڑ دیں اور جدھر ان کا جی چاہے چلے جائیں؛ بنو نضیر نے (نبی صلے اللہ علیہ وسلم) کا حکم ماننے سے انکار کیا، جس کے بعد پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ۴ھ میں ان کی بستیوں کا محاصرہ کئے رکھا؛ بنو نضیر نے یہ حالت دیکھ کر پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) سے درخواست کی کہ وہ اتنی مہلت دیدیں کہ جس قدر مال وہ اپنے اونٹوں پر لاد کر لیجا سکیں لے جائیں، مگر ہتھیار ایک بھی نہ لیں گے جس کو پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے منظور کرلیا اور بنو نضیر اپنے ملک سے نکل گئے؛ ان کے جانے کے بعد ان کا جس قدر مال و اسباب رہا وہ خاص نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ملکیت ہوا؛ اور انھوں نے جس کو چاہا اس میں سے عطا کیا؛ ایسی ہی صورت قریظہ (یہودیوں کا ایک دوسرا گھرانا) اور خیبر میں پیش آئی، خیبر کے بہت سے قلعے تھے جن کو اہلِ اسلام نے یکے بعد دیگرے فتح کیا:



(قلعۂ خیبر)

صلح حدیبیہ

قریش والوں کو خندق کے واقعہ کے بعد یہ آسان معلوم ہوا کہ مسلمانوں سے صلح کرلیں لہٰذا ۶ھ کے قریب انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مدینہ کا رہنے والا شخص (مسلمان) اگر حج اور عمرہ کرنے کے لئے مکّہ آئے یا مکہ میں ہو کر

یمن اور طائف کو جانا چاہے تو وہ بخطر ہوگا اور مکہ کے لوگوں میں سے یا ان کے سیفوں میں سے جو شخص ملک شام اور مشرق کو جاتا ہوا مدینہ کی حدود میں سے گزرے وہ بھی بخطر رہے؛

اشاعتِ اسلام کی سہولت اس صلح کے بعد مسلمانوں نے چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ساتھ اشاعتِ اسلام کا کام شروع کیا چونکہ احزاب کی ہزیمت نے قبائل عرب کے دلوں پر بہت کچھ اثر ڈالدیا اور اسلام کی شان و شوکت ان کی نظروں میں بہت بلند ہوگئی تھی؛ لہٰذا وہ خود بخود گروہ در گروہ مدینہ کو آتے اور اسلام قبول کرتے۔ انھیں آنیوالوں میں دو شخص ایسے تھے جن کو اسلامی دنیا میں بڑی شان حاصل ہوئی؛ وہ دونوں شخص خالد بن الولید اور عمرو بن العاص تھے؛ یہ دونوں صاحب اسلام کے مشہور جنرل (سپہ سالار) ہیں؛ قبائل عرب کے اسلام قبول کرتے جانے سے مسلمانوں کو عزت پر عزت نصیب ہوتی جاتی تھی اور ان کی امیدوں کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔ اگلے سال نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے شاہانِ دنیا کے پاس دعوتِ اسلام کی غرض سے قاصد روانہ کئے؛ اور ملک شام میں رومیوں سے جنگ کرنے کے واسطے ایک فوج بھی بھیجی؛ اس اسلامی فوج نے ملک شام کی حدود میں جو حوران سے متصل ہیں بلقا کے ایک گاؤں میں جس کا نام موتہ تھا؛ رومیوں کا مقابلہ کیا۔ روم والوں کے ساتھ یہ ان کی پہلی لڑائی تھی؛ چونکہ اہل عرب نے ابھی تک کبھی باقاعدہ فوجوں سے جنگ نہیں کی تھی لہٰذا وہ کامیاب نہ ہوسکے؛ اور مدینہ کو واپس آگئے؛ اس لڑائی میں چند اعلےٰ درجہ کے صحابی کام آئے جن میں سے ایک جعفر بن ابی طالب بھی تھے؛

فتح مکہ اسی اثناء میں ایک ایسا حادثہ گزرا جس کی وجہ سے مسلمانوں اور قریش کے مابین صلح کا اقرار شکست ہوگیا، ابوسفیان نے خیال کیا کہ اب قریش والوں کو مسلمانوں کی مخالفت اور مقابلہ کی قوت باقی نہیں رہی ہے لہٰذا وہ خود نئے سرے سے معاہدۂ صلح قائم کرنے کے لئے مدینہ آیا، مسلمانوں کو غنیم کی کمزوری معلوم ہوچکی تھی وہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے میں نہ چوکے، انھوں نے ابوسفیان سے تو یہ کہا کہ ہمیں صلح منظور ہے اور اس سے وعدہ کیا کہ معاہدۂ آشتی کرلیں گے؛ لیکن جب ابوسفیان مطمئن ہوکر مکہ کو واپس چلا گیا تو مسلمانوں نے بہت ہی تیزی کے ساتھ مکہ پر فوج کشی کا انتظام

کرلیا اور یلغار کر کے مکہ پر جا پہنچے تاکہ یکایک اس پر حملہ کردیں اور وہاں کے لوگوں کو مدافعت کے لئے تیار ہو سکنے کا موقع نہ دیں جس وقت یہ اسلامی لشکر مکہ پر پہنچا ہے اس کی تعداد دس ہزار تھی جس میں مہاجر انصار اور ان کے حلیف قبیلے سب شامل تھے؛ ابوسفیان اور قریش کے چند اور معزز لوگ تجسس حالات کی غرض سے مکہ سے باہر آئے تھے؛ راہ میں انھیں عباسؓ بن عبدالمطلب نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے چچا ملے جنھوں نے ان کو مسلمانوں کی توجی قوت اور ان کی شان و شوکت سے مطلع کر دیا؛ ابوسفیان نے عباس سے کہا، اب تو تمھارے بھتیجے صاحب کی بڑی عزت و عظمت ہوگئی ہے؛ جس کے جواب میں عباسؓ نے ابوسفیان کو یہ مشورہ دیا کہ تم مسلمانوں سے اپنے لئے امان حاصل کر لو؛ ابوسفیان کو بھی اس مشورہ سے بہتر صورت نظر نہ آئی؛ لہٰذا وہ عباسؓ کے ساتھ اسلامی کیمپ میں داخل ہوا؛ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اس کی بہت کچھ خاطر کی اور صحابہ کو اس کے ستانے سے باز رکھا جو دل میں اُسے ضرر پہنچانے پر تلے بیٹھے تھے، اور نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ابوسفیان کو ایسا ہاتھوں ہاتھ لیا کہ وہ ان کا ہوا خواہ بن گیا؛ یہاں تک کہ انھوں نے ہر ایسے شخص کو جو فتح مکہ کے دن ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے اسی طرح امن دیدیا جیسا کہ مسجد کے اندر پناہ لینے والے کو مامون بنا دیا تھا؛ ابوسفیان اس قدر رعایتیں حاصل کر کے مکہ میں واپس آیا اور وہاں کے لوگوں سے تمام حالات بیان کئے جنھیں سنکر اہل مکہ نے اُسے بزدل اور پست ہمت کہنا اور گالیاں دینا شروع کیں اور سب اس سے الگ ہوگئے، یہاں تک کہ خود ابوسفیان کی بیوی ہندؓ بنت عتبہ نے اس کی مونچھیں پکڑ کر کہا؛ "اُقتلوا الحمیت الدسم الاحمس قبحہ اللہ من طلیعۃ قوم[1]" لیکن ابوسفیان نے ان تمام باتوں کی کچھ پروا نہ کی۔

بت شکنی

اس کے بعد مسلمان مکہ میں داخل ہوئے انھوں نے اُسے بزور شمشیر فتح کیا اور نبی (صلے اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے کعبہ میں تشریف لے گئے، انھوں نے وہاں کے بتوں کو جو اس کے اندر اور گرداگرد باہر کی جانب رکھے ہوئے تھے توڑ دیا اور خانہ کعبہ کی دیواروں پر بنی ہوئی تصویروں کو مٹا دیا جن کو کفار عرب نے فرشتوں وغیرہ کی تصویروں سے موسوم کر رکھا تھا، اس طرح جزیرہ عرب میں بت پرستی کا خاتمہ ہوگیا اور خانہ کعبہ

---

[1] گردن مارو اس ہیٹے کی کالی، خدا تباہ کرے اس کو قوم کی پیروی سے

بُت خانہ سے مسجد بن گیا۔ جس میں خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت ہونے لگی۔ تمام اہل مکہ مسلمان ہو گئے۔ جن میں ابو سفیان اور اس کے بیٹے بھی شامل تھے۔ اور منجملہ اولاد ابو سُفیان کے ایک شخص معاویہ بھی تھے جنھوں نے بعد میں حکومت بنواُمیہؓ کی بنیاد قائم کی۔

مؤلفۃ القلوب

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان اشراف مکہ کا جو اسلامی فتح کے بعد ایمان لائے مؤلفہ یا (مؤلفۃ القلوب) نام رکھا۔ جس سے اس امر کیجانب اشارہ تھا کہ ان کے دل خوش رکھکر انھیں اپنے ساتھ ملایا جائے، اور اس ذریعہ سے ان کی قوم سے بھی میل ملاپ پیدا کر کے اسلام کی عزت وعظمت میں قوت پیدا کی جائے؛ سیرت حلبیہ میں لکھا ہے کہ مؤلفۃ القلوب کی تین قسمیں تھیں؛ ایک قسم تو وہ جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اسلام میں داخل کرنے کی غرض سے خوش کیا تھا، مثلاً صفوان بن اُمیہ، دوسرے وہ لوگ تھے جنھیں اسلام پر ثابت قدم رکھنے کے لیے ان کی تالیف قلوب کی گئی تھی جن میں سے ایک ابوسفیان تھے اور تیسری قسم میں ایسے لوگ تھے جن کی شرارت دور کرنیکی غرض سے اُن کی خاطر مدارات کی جاتی تھی؛ نبی صلے اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے ساتھ جود وبخشش سے سلوک ہوتے اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، عطائے مال میں ان کو تمام صحابہ سے امتیاز دیتے تھے، اس حکمت عملی میں جو راز حسن انتظام اور تحمل وکشادہ دلی کے متعلق مخفی ہے کو اہل نظر خود سمجھ سکتے ہیں۔

دشمنوں کے ساتھ فیاضی

فتح مکہ کے بعد نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے قرب وجوار کے مقامات کو چھوٹی چھوٹی فوجیں روانہ کیں تاکہ وہ لوگوں کو اسلام کی جانب بلائیں اور اس کے بعد حنین اور طائف پر فوج کشی کی؛ لیکن نبی صلعم کے اس دفعہ طائف میں داخل ہونے اور آغاز زمانہ دعوت کی تشریف بری میں زمین وآسمان کا فرق تھا، کیونکہ ان دنوں آپ ان لوگوں کے پاس مدد کے خواہاں بنکر گئے تھے؛ اور اب فاتح کی حیثیت سے پہنچے، غرضکہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ان کو زیر کر کے بہت کچھ مال غنیمت حاصل کیا جس کی مقدار (۲۴۰۰۰) ہزار اونٹ (۴۰۰۰۰) بکریاں اور بھیڑیں اور چار ہزار اوقیہ خالص چاندی تھی؛ جس وقت انھوں نے اس مال غنیمت کو اپنے اصحاب میں تقسیم کرنا چاہا تو پہلے مؤلفۃ القلوب

لوگوں نے تقسیم شروع کی؛ ابوسفیان کو سو اونٹ، اس کے بیٹے معاویہ کو سو اونٹ اور یزید بن ابوسفیان کو بھی سو اونٹ دیئے؛ اس کے علاوہ انھیں چاندی کی بھی معتدبہ مقدار عنایت کی؛ اس طرح پر ابوسفیان نے مع اپنے بیٹوں کے تین سو اونٹ اور ایک سو بیس اوقیہ چاندی حاصل کی؛ اس عطا کو دیکھ کر ابوسفیان کی آنکھیں کھل گئیں اور دم بھرنے لگے: "یارسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں لاریب آپ جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں صاحب کرم ہیں"؛ ایسا ہی برتاؤ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے تمام اشرافِ قریش کے ساتھ کیا؛ مثلاً مشہور ابی جہل کے بھائی حارث بن ہشام اور صفوان بن امیہ وغیرہ۔ مہاجرین وانصار کو یہ بات ناگوار گذری کیونکہ وہ لوگ اسلام کے رکن اور سابق الاسلام تھے اس لئے وہ کیونکر چھوڑ دیئے جاتے اور مالِ غنیمت خوشی سے ان لوگوں کا حصہ ہونے دیتے جو محض مجبوری کے عالم میں مبتلا ہو کر اسلام لائے تھے، صحابہ نے آپس میں اس بات کی شکایت کرتے ہوئے کہا "پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) قریش والوں کو کیوں عطا فرماتے ہیں اور ہمیں چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ اب تک ہماری تلواروں سے ان کے خونوں کے قطرے ٹپک رہے ہیں"؛ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی اس گفتگو کی خبر ہوگئی اور آپ نے اصحاب کو جمع کر کے اُن سے دریافت فرمایا کہ تم نے ایسا ایسا تذکرہ کیا ہے؟ صحابہ کرام نے نبی صلعم سے اپنی گفتگو کا اقرار کیا؛ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کو صحیح تسلیم کر لیا، لیکن ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہا، بیشک میں ایسے لوگوں کو عطا کرتا ہوں جو چند روز ہوئے مسلمان ہوئے ہیں؛ اور ان کے کفر کا زمانہ بہت ہی قریب گذرا ہے، میں ان کی دلدہی اور خاطرداری کرتا ہوں تاکہ ان کا اسلام اچھا ہو جائے، اور ان کے سوا اور لوگ بھی ان کی پیروی کر کے اسلام لے آئیں؛ رہے تم لوگ سو میں نے تمھارا معاملہ تمھارے اس ثابت قدم اسلام پر چھوڑ دیا ہے جو ذرا بھی تزلزل میں نہیں آسکتا، اے! انصاری لوگو! کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ اور لوگ تو اونٹ اور بکریاں لے لیکے چلے جائیں اور تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو لے کر اپنے لوگوں میں واپس ہو۔ اور ایسی ہی باتیں مہاجرین کو فرمائیں جن سے وہ سب راضی ہو گئے؛

اس کے بعد تقریباً ۹ھ میں یہ لوگ (فاتحان مکہ وطائف) مدینہ میں واپس آگئے۔ اب ان کی شان وشوکت بہت قوی ہو چکی تھی اور ان کے زور طاقت کی خبر تمام

ملک عرب میں مشہور ہو چکی تھی جس کی وجہ سے لوگ خود بخود گروہ در گروہ آتے اور مدینہ میں پہنچکر داخل اسلام ہوتے تھے۔

غزوۂ تبوک

جس وقت مسلمانوں کی عزت و عظمت بہت بڑھ گئی اور تقریباً تمام جزیرۂ عرب ان کے زیر حکم آچکا تو انھوں نے اپنی فتوحات کا دائرہ پھر وسیع کرنا چاہا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روم والوں پر دوبارہ فوج کشی کرنے کے لئے درستی افواج کا حکم دیا اور بہت جلد تیس ہزار کا بھاری لشکر جمع ہو گیا جس میں دس ہزار سوار تھے۔ مسلمانوں نے اس وقت تک جس قدر حملے کئے تھے ان میں یہ سب سے بڑا لشکر تھا انھوں نے اپنی قوت کے مطابق اس فوج کی تیاری میں بہت کچھ مال بھی صرف کیا اور جس قدر زیادہ آدمی بہم پہنچ سکے جمع کئے گئے، مگر راہ میں انھیں پیاس سے بہت سخت تکلیف اٹھانی پڑی اور وہ شام اور مدینہ کے درمیان ایک بستی میں رک گئے، جس کا نام تبوک تھا اور ان کا خیال تھا کہ رومی لوگ مع لخم و جذام کے عربوں کے اسی مقام پر آکر مجتمع ہوں گے، اسی مقام پر ایلہ[1] کا حاکم ان کے پاس آیا اور جزیہ دے کر صلح کا عہد کیا، اسی چڑھائی کی حالت میں خالد بن الولیدؓ نے مدینہ اور دمشق کے مابین دمشق سے کوئی سات منزل کے فاصلے پر دومۃ الجندل کے حاکم پر حملہ کیا یہ حاکم عربی النسل تھا اور نصرانی مذہب کا پیرو اور یہ خاندان کندہ میں سے تھا، خالدؓ نے اسے گرفتار کر لیا اور اس کے بھائی کو قتل کر ڈالا، انھوں نے اس حاکم سے ایک قبائے دیبا جس پر سنہری کام کیا ہوا تھا حاصل کر کے اسے مسلمانوں کے پاس بھیجا، جس کو دیکھ کر مسلمانوں نے بہت تعجب ظاہر کیا اس لئے کہ ایسے عمدہ اور فاخرہ کپڑوں کے دیکھنے کا ان کو یہ پہلا موقع تھا، اتنی کارروائی کے بعد یہ اسلامی لشکر مدینہ کو واپس آگیا، اور اس نے ممالک روم میں سے کسی شہر کو فتح نہیں کیا۔

۱۱ھ میں صاحب شریعت اسلامی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وفات پائی اس وقت تک اسلام بالکل کمسنی کے عالم میں تھا اس لئے جن لوگوں کے افزائش و عظمت میں اسلام نے کمزوری پیدا کر دی تھی یا ان کی ذاتی اغراض کے حاصل ہونے میں سد راہ بن گیا تھا انھوں نے اپنی اپنی جگہ پر سر اٹھانا یکلخت شروع کر دیا عرب کے سب قبیلے اسلام سے پھر گئے، بس صرف مدینہ، مکہ، اور طائف کے رہنے والے سچے مسلمان رہے اور اس امر کی وجہ سے اسلام نہایت خطرناک حالت میں گرفتار ہو گیا، اگر ابو بکرؓ ان کی خبر نہ لیتے جیسا کہ آگے چلکر بیان ہو گا تو غالباً وہ نیست و نابود

---

[1] خلیج عقبہ کے سرے پر ملک شام کے قریب ساحل بحر قلزم پر ایک شہر ہے۔

خُلفائے راشدینؒ

نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) اپنی حیات میں مسلمانوں کے فرمانروا، جنگ میں سپہ سالار، نماز میں امام، اور تمام دوسری حالتوں میں ان کے قاضی تھے، جس وقت انہوں نے رحلت فرمائی تو کوئی اولاد نرینہ نہ چھوڑی، نہ کسی کیلئے بعد میں اپنا جانشین بنائے جانے کی وصیت کی تو مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا کہ ان کا جانشین کون ہو؟ یہ ظاہر تھا کہ ان کی خلافت کیلئے تمام لوگوں سے بہتر اور برتر انکے اصحاب تھے، جن کی دو قسمیں تھیں، مہاجرین اور انصار، مہاجرین نے کہا کہ ہم خلافت کے زیادہ حق دار ہیں، کیونکہ ہم نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے قرابت مند اور ان کے ساتھی ہونے کے علاوہ ان کے ساتھ دینے میں اپنے وطن اور گھر کو چھوڑکر اور عزیزوں اور یار دوست سے بے تعلق ہو کر رہے ہیں، اور انصار کہتے تھے نہیں ہم خلافت کے زیادہ مستحق ہیں، اس لئے کہ ہم نے اپنے شہر میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی اور ان کی مدد میں اپنی جانیں فدا کیں، ان دونوں فریقوں میں یہ جھگڑا اس قدر طول کھینچ گیا کہ باتوں باتوں سے ہاتھا پائی کی نوبت آجانے کا یقین ہو چلا تھا، ابو بکرؓ نے ان سے ایک ایسی حدیث بیان کی جس کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے بہت سے لوگوں کے سامنے بیان فرمایا تھا، اور وہ حدیث یہ تھی کہ "حکومت کے مالک قریش ہیں" اس حدیث کو سنکر سبھوں نے سرِ تسلیم خم کرلیا اور انصار بالکل خاموش ہو گئے،

حضرت ابو بکرؓ کی خلافت

یہ سب کچھ تو ہوا لیکن اسلام کو اب تک سخت خطرہ کا سامنا تھا، کیونکہ مہاجرین میں بھی اس عظیم الشان منصب کے لئے کسی شخص کو انتخاب کرنے کی بابت بہت کچھ اختلاف پھیلا ہوا تھا، مسلمانوں کے ایک سر برآوردہ فرد عمر بن الخطاب نے اس اختلاف کے خطرے کو محسوس کر لیا اور انھیں یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام صرف اتحاد کی بدولت اور اسی کے استحکام کے لئے قائم ہوا ہے، لہذا انھوں نے بہت تیزی کے ساتھ ابی بکرؓ کی جانب بڑھکر ان سے بیعت کرلی، دوسرے لوگ اس تماشے ہی کو دیکھتے رہے اور انھیں عمرؓ کی قوت و جرأت سے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں وہ خود ہی طالب بیعت

اور خلافت کے دعویدار نہ بن بیٹھیں، مگر جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں سب سے پہل کر گئے تو سبھوں نے ابو بکرؓ سے بیعت کرلی اور تمام مشکلات کا خاتمہ ہو گیا۔

اَب یہ خیال کرنا ایک غور طلب امر ہے کہ انھوں نے اور بہت سے مہاجرین کے ہوتے ہوئے جن میں عباسؓ بن عبدالمطلب نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے چچا اور علیؓ بن ابی طالب ان کے چچازاد بھائی اور دوسرے بنی ہاشم نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے کنبے والے موجود تھے؛ تو ابو بکرؓ ہی سے کیوں بیعت کی؛ عمر بن الخطاب وغیرہ کے اقوال سے جو انھوں نے مختلف موقعوں پر کہے ہیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے بنی ہاشم کو عزت نبوت سے سرفراز دیکھا اس لئے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم انھیں میں سے تھے؛ لہذا انھوں نے یہ پسند نہ کیا کہ عزت نبوت پر خلافت کا بھی اضافہ کریں؛ اور ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کے لحاظ سے ایسا کیا ہو، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ نے ایک بار ان سے کسی مقام کے عامل بنائے جانے کی استدعا کی تھی تو پیغمبر صاحب نے انکار کر دیا تھا؛ اور خود بنو ہاشم نے اس خیال کو صاف صاف ظاہر کیا ہے۔ جن کے پیشوا امام حسنؑ بن علیؓ ہیں جبکہ وہ معاویہ کے مقابلہ میں خلافت سے دست بردار ہوئے اور خلافت معاویہ کے سپرد کی تو فرمایا کہ خدا ہی کو یہ منظور نہیں کہ ہم (اہلبیت نبوت) میں نبوت اور خلافت دونوں باتوں کو جمع فرمائے۔

ترجیح کے اسباب

علاوہ بنو ہاشم کے اور مہاجرین مثلاً عمرؓ۔ عثمانؓ۔ اور زبیر وغیرہ کے ہوتے جس امر نے ابو بکرؓ کے منتخب ہو جانیں مدد دی وہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے سابق الاسلام ہونے کو ملحوظ رکھا اور ابو بکرؓ مردوں میں سب سے پہلے مشرف باسلام ہوئے تھے، اور نیز اس مقام پر ایک اور مہتم بالشان سبب یہی ہے جس کا اہل عرب زمانہ جاہلیت سے لحاظ کرتے آئے تھے، اور وہ سبب عمر کی بڑائی ہے، شیخ کا لفظ بھی ان کے محاورہ میں شیخوخت (بزرگی) کے ساتھ ہی سرداری پر بھی دلالت کرتا ہے؛ ان کا قاعدہ تھا کہ جن باتوں کو سرداری و افسری کے لئے ضروری خیال کرتے تھے، اگر وہ سب اوصاف کئی شخصوں میں برابر ہوتے تو اس شخص کو سردار بناتے جو ان سبھوں میں مسن ہوتا تھا اور اس کے ساتھ ہی باعتبار ادب کے بھی اس کے مرتبہ کا لحاظ کرتے تھے، حرب فجار ثانی میں بھی قریش نے

یہی کیا تھا، انھوں نے اپنے تمام گھرانے کو یکجا کیا اور ہر گھرانے کا ایک سردار تھا اور سبھوں پر افسر اعلےٰ حرب بن اُمیہ کو مقرر کیا تھا، ابن اثیر نے لکھا ہے کہ انھوں نے تمام لوگوں پر حرب بن اُمیہ کو عام حاکم بنایا تھا کیونکہ عبد مناف کے خاندان میں سن اور عزت دونوں کے اعتبار سے وہ بہت معزز تھا، اسی طرح پر ابو بکرؓ نے بھی سن اور وجاہت کے اعتبار سے تمام قریش پر امتیاز حاصل کیا تھا، اور ان سب باتوں سے بڑھکر یہ امر تھا کہ جب نبی علیہ السلام بیمار ہوئے تو آپؐ نے ابو بکر کو مسلمانوں کی نماز پڑھانے پر اپنا قائم مقام بنایا تھا، اور یہ منصب امامت کے حقوق میں سے تھا۔

حضرت ابو بکر کا خطبہ

ابو بکر کا پہلا خطبہ جو انھوں نے بیعت خلافت لینے کے بعد پڑھا ہے، اسلام کی حقیقت اصلی کی تصویر کھینچ رہا ہے، اور اس راز کو عیاں کرتا ہے جس کے سبب سے اسلام نے اتنی تیزی کے ساتھ محیط زمین پر اپنا سایہ پھیلا دیا؛ وہ خطبہ یہ ہے؛ اے لوگو! میں تمہارا والی مقرر کیا گیا ہوں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تم سے بہتر نہیں، اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر بدی کا مرتکب ہوں تو مجھے ٹھیک بناؤ۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت، تم میں کا زور والا میرے نزدیک اس وقت تک کمزور رہے جب تک کہ میں اس سے حق کو حاصل نہ کرلوں؛ اور تمھارے گروہ کا کمزور شخص اس وقت تک میری نظروں میں زوردار ہے جب تک کہ میں انشاء اللہ تعالےٰ اُسے اس کا حق نہ دلا دوں، تم میں سے کوئی شخص کوشش جہاد کو نہ ترک کرے؛ کیونکہ جو قوم اس کو چھوڑ دیتی ہے خداوند کریم اُسے ذلت میں مبتلا فرماتا ہے؛ جبتک میں خدا اور رسول کی اطاعت کرتا رہوں تم بھی میرے مطیع رہو۔ اور جس وقت میں اس امر سے باہر ہو کر نافرمانی کروں تو تم پر بھی میری اطاعت واجب نہیں؛

نازک دور

ابو بکرؓ نے زمام خلافت ایسے وقت اپنے ہاتھ میں لی تھی جبکہ اسلام نہایت بےچینی اور خطرہ کی حالت میں مبتلا تھا؛ اس اضطراب کی وجہ وہی ردّۃ تھی جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں؛ اس ارتداد کے اسباب میں یہ امر بھی شامل تھا کہ بعض قبیلے بظاہر اسلام کے مطیع ہو چکے تھے لیکن اسلام نے ان کے دلوں اور خیالات پر پورا قابو نہیں پایا تھا؛ جس وقت نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کا انتقال ہوا ان کے دماغوں میں یہ ہوا سمائی کہ نبوت کا دعوٰی کر لینا بہت آسان امر ہے انھوں نے یہ بھی خیال کیا کہ ہم

بذاتِ خاص اس کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ہی اپنے قبائل سے امداد حاصل کرلیں گے۔ جن کے لوگ شمار میں قبیلہ قریش سے کہیں زیادہ ہیں، اس لئے یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ تھوڑے سے قریشی تمام جزیرۂ عرب پر سرداری کریں "۔ یہ وجہ تھی جس سے کئی آدمیوں نے نبوت کا باطل دعوٰی کردیا۔ جن میں بنی اسد میں طلیحہ بن خویلد الاسدی ؛ بنی تمیم میں سے سجاح اور یمامہ کے باشندوں بنی حنیفہ میں سے مسیلمہ وغیرہ کئی شخص تھے، اور ہر شخص نے اپنے قبیلے اور مددگاروں سے امداد حاصل کی تھی اس وجہ سے عرب کے تمام قبائل میں کچھ ایسی کھلبلی پڑ گئی تھی کہ توبہ بھلی ؛ بعض تو ان میں سے ان دعویداروں کے پیرو بن گئے تھے اور کچھ ایسے تھے جو صرف زکوٰۃ دینے سے باز رہے حالانکہ زکوٰۃ اسلام کے ابتدائی ارکان میں شامل ہے، اس کی حالت بعینہٖ ایسی ہے جیسے سلطنتوں میں مال کا صیغہ، اور یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہر وقت ہر جگہ سلطنتوں کے قیام کے لئے مال کا ہونا ضرور ہوتا ہے ؛ اور بعض عرب بریں خیال زکوٰۃ کے ادا کرنے سے رُک گئے ؛ کہ انھوں نے اسے "اتاوہ" کی قسم سے سمجھا ؛ جو وہ جاہلیت کے زمانہ میں ادا کیا کرتے تھے ؛

مُرتدوں کے خلاف جنگ

ردّۃ کا معاملہ اس قدر سخت ہو گیا اور مرتد لوگوں نے اتنا زور پکڑا کہ ان میں سے بعضوں نے خود مدینہ پر چڑھائی کرنے کا قصد کر کے اور اس پر حملہ کر ہی دیا؛ ان دنوں مدینہ مسلمانوں کا پایۂ تخت تھا اور قریب تھا کہ یہ حملہ آور اُسے فتح کرلیں ؛ لیکن ابوبکرؓ نے نہایت عمدگی کے ساتھ ان کی مدافعت کی اور انھوں نے مُرتد لوگوں سے جنگ کرنیں ایک تجربہ کار، عقلمند اور دوراندیش کی طرح کام کیا ؛ ان کے ماتحت کئی ایک چیدہ چیدہ افسر اور دانا آدمی تھے ؛ جن کے لئے ابوبکرؓ نے کئی ایک علیحدہ علیحدہ فوجی نشان بنا کر ان کے حوالے کئے ؛ ان فوجی نشانات کی تعداد گیارہ تھی جو اتنے ہی افسروں کے لئے بنائے گئے تھے ؛ اور منجملہ ان لوگوں کے خالد بن الولیدؓ؛ عکرمہ بن ابی جہل اور عمرو بن العاص بھی تھے۔

جنگ یرموک

ابوبکرؓ کی خلافت کو پورے دو برس بھی نہ گذرے تھے کہ سب معاملہ ٹھیک ہو گیا اور تمام شورشیں فرد ہوگئیں ؛ لوگ پھر اسی طرح امن کی زندگی بسر کرنے لگے جیسی کہ ان فسادوں سے قبل گذارتے تھے ؛ ان جھگڑوں سے فراغت

پا کر ابوبکرؓ نے اپنی توجہ بہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے لحاظ سے شام و عراق کی جانب منعطف کی اور ان ملکوں پر فوجیں بھیجیں جن کی وجہ سے ۱۳ھ کا مشہور واقعہ "یرموک" پیش آیا جو بعد میں ملک شام کی فتح کا سبب بنا؛ اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کو ویسی ہی قوت حاصل ہوئی جیسے کہ ابتدائے اسلام میں بدر کبریٰ کے واقعہ سے ہوئی تھی؛

اسی ۱۳ھ میں ابوبکرؓ نے وفات پائی؛ وہ انتقال سے قبل عمرؓ کے واسطے خلافت کی وصیت کر گئے تھے؛ جو کہ ابوبکرؓ کے بعد عمرؓ ہی تمام مہاجرین سے بڑے تھے؛ عمرؓ کے زمانہ خلافت میں شام، عراق، مصر، اور افریقہ وغیرہ ممالک میں بہت بڑی بڑی فتوحات حاصل ہوئیں؛

اسلامی فتوحات
آغاز اسلام میں

ابتدائے اسلام میں عربوں کی سادہ زندگی؛ فنون حرب و ضرب سے ناواقفیت؛ سامان جنگ کی غیر موجودگی اور تنگدستی کے علاوہ ان کی اتنی تھوڑی تعداد نے جو قیصر روم و کسریٰ فارس کی صرف ایک شہر کی محافظ فوج سے بھی زائد نہ تھی؛ قیصر و کسریٰ کے ممالک کو فتح کر لیا؛ اور اس زمانہ کی ان دونوں عظیم الشان حکومتوں کا قلع قمع کر دیا؛ اس کے اسباب میں مؤرخین و مصنفین اور روایتوں کی چھان بین کرنیوالوں نے بہت کچھ اختلاف آرا دکھایا ہے؛ اور بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں؛

اور اس میں شک نہیں کہ یہ معاملہ ہے بھی غور طلب؛ کیونکہ عرب والوں کی بے سروسامانی کے مقابل سلطنت ہائے روم و فارس کا ساز و سامان ویسا ہی کامل تھا؛ جیسا کہ ہونا چاہیئے؛ فوجوں کی کثرت، مال و دولت کی افراط، سلاح اور سامان جنگ کی فراوانی، رسد خانوں اور قلعوں کی کثرت تو تھی ہی اس پر طرہ یہ کہ عرب ان پر حملہ کرنے آئے، تو ایسے

ملک میں داخل ہوئے کہ نہ وہاں کے راستوں اور حالات سے واقف تھے اور نہ وہاں ان کا کوئی معین ومددگار تھا۔ اور رومی وفارسی مدافعانہ پہلو اختیار کئے تھے؛ جس میں یوں بھی تھوڑے سے آدمی بہتوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور سب باتوں سے زیادہ تعجب خیز یہ امر ہے کہ عربوں نے صرف چودہ پندرہ برس کی قلیل مدت میں ان دونوں سلطنتوں کا چراغ گل کردیا اور انہیں فتح کرلیا، اس لئے سوال ہوسکتا ہے کہ آخر ان کو یہ بات کیونکر حاصل ہوگئی؛

فتوحات کے اسباب

اس بارہ میں محقق لوگوں کا سب سے زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ عرب والوں کو ان دونوں عظیم الشان سلطنتوں کے فتح کرنے کا موقع صرف اسی وجہ سے مل گیا کہ اسلام کے پیشتر سے یہ دونوں حکومتیں باہمی جنگ و پیکار کے جھگڑوں میں مبتلا ہوکر نہایت کمزور اور خستہ ہوگئی تھیں؛ جیسا کہ ہم اس سے پہلے ایک فصل میں بیان بھی کرچکے ہیں؛ مگر ہماری ذاتی رائے میں محض حریف کی یہ کمزوری ہی عربوں کی فتحیابی کا باعث نہ تھی؛ ورنہ انہیں دونوں سلطنتوں میں سے کوئی ایک اپنی ہمسایہ مخالف حکومت پر بدرجہا دلے غالب ہونی چاہیئے تھی؛ یہ نہیں کہ ایک چھوٹی سی قوم ملک عرب کے بیہڑ میدانوں سے اٹھ کر آئے اور دونوں سلطنتوں پر تصرف کرلے؟ گو ہم یہ مانتے ہیں کہ رومیوں اور فارسیوں کی کمزوری کو بھی اسلامی فتوحات میں دخل مزور تھا، مگر ایک یہی امر اس کی علت نہ تھا، بلکہ اور بھی بہت سے اسباب تھے؛ جنکا بیان آگے چلکر آئے گا؛

عربوں کو کس چیز نے فتح ممالک پر جری بنایا؟

سب سے پہلے ہم کو ان اسباب سے بحث کرنی چاہیے جنہوں نے اہلِ عرب کو باوجود ان کے جنگلی اور وحشی قوم ہونے کے ایسی شاندار اور قومی حکومتوں پر حملہ کرنے کی جرأت دلائی؛ حالانکہ وہ جنگلوں کے رہنے والے اور وحشی تھے، کئی صدیاں گزر چکی تھیں کہ وہ ان دونوں سلطنتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے اور ان کے زور وقوت سے ڈرتے رہنے کے عادی ہوگئے تھے، اور ان کی وسعتِ ملک ان کے ہاں ضرب المثل تھی؛ لہذا یہ کیونکر ہوسکتا تھا کہ ایسے لوگوں کا ایک مختصر سا گروہ جس کی تعداد چند ہزار سے زائد نہ ہو، ان دونوں سے بھڑ جانے کے لئے آمادہ ہونے کی جرأت کرلے، خصوصاً اس صورت میں کہ نہ

تو ان لوگوں کے بدن پر سوا موٹے جھوٹے کپڑوں کے کوئی جنگی لباس ہو اور نہ جو جوار سے بڑھکر انھیں کوئی غذا میسر ہو، ہتھیاروں کی یہ حالت کہ ٹوٹے پھوٹے نیزے جا بجا سے بندھے ہوئے ہاتھوں میں رہوں، اور تلواریں بجائے پرتلوں میں لگی ہونے کے چیتھڑوں میں باندھکر حمائل کی ہوئی، پھر اگر انھیں اس کی جرأت بھی ہوئی تو اسلام سے پہلے انھوں نے ایسا کیوں نہ کیا اُس وقت انھیں کیا ہو گیا تھا۔

قوتِ ایمانی کا کرشمہ اس کا جواب یہ ہوگا کہ اسلام کے بعد عرب وہ عرب ہی نہ رہے تھے جو قبل از اسلام تھے، ان کی بالکل کایا پلٹ گئی تھی، پہلے تو وہ جدا جدا اور منتشر قبیلے تھے، ادھر ایک دوسرے سے بیگانہ تھا، مگر اسلام کے بعد وہ ایک قوم اور ایک دل ہو گئے۔ یہ بات بھی اکیلی ان کے اتنے بڑے کام میں قدم بڑھانے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، البتہ جو امر کہ اس قدر جرأت پیدا کر دینے کا موجب بن سکا وہ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ جس چیز کی جانب ان کو بلایا گیا ہے یعنی دین اسلام وہ واقعی حق اور راست ہے ان کا عقیدہ تھا کہ وہ دنیا کو دین کے لئے فتح کرتے ہیں، اور خداوند پاک انھیں روئے زمین پر اسلام کے پھیلانے کا حکم دیتا ہے ان میں سے جو شخص اس کوشش میں مارا گیا وہ شہید ہو گا۔ اور آئندہ عالم کی نعمتیں عالمِ ہستی کی نعمتوں سے عمدہ اور دیرپا ہیں، یہی عقیدہ تھا جس نے عرب والوں کو اتنے بڑے اور سخت کام میں ہاتھ ڈالنے پر دلیر بنا دیا تھا، اور اس میں بھی شک نہیں کہ انھوں نے اپنے حملوں اور لڑائیوں میں نبی صلعم کے زمانہ میں فتحمندی کا جو مزہ چکھا تھا اس نے بھی ان کو اس خیال پر جمے رہنے میں مدد دی، انسان کا قاعدہ ہے کہ جب اسے کسی کام میں نفع حاصل ہوتا ہے یا کوئی تجارت اُسے سودمند ثابت ہو جاتی ہے تو اس کام یا تجارت کے ترقی دینے میں اسے اپنا سرمایہ بھی لگا دینا گراں نہیں گزرتا۔

اتحادِ اسلامی کے اثرات اسلامی اتحاد کا جلوہ ان کے تمام کاروبار میں نظر آتا ہے۔ جس کے شواہد میں سے ایک وہ بھی ہے جو ہم نے رابطہ کے اقرار باہمی اور بھائی چارہ کے برتاؤ سے متعلق پہلے بیان کیا ہے، نیز ہمارے اس دعوے کی یوں بھی تائید ہوتی ہے کہ اسلام توحید کا عنوان ہے جیسا کہ قرآن و حدیث کے ملاحظہ سے عیاں

ہوتا ہے۔ اور صدرِ اسلام میں خلفا اور امرا اسلام کا کوئی خطبہ اس وحدت (ایکے) کی جانب اشارہ کرنے اور مسلمانوں کو اس جدائی اور بیگانگی کے یاد دلانے سے خالی نہیں ملتا، جس پر ان کے باپ دادا زمانہ جاہلیت میں عامل تھے اور ساتھ ہی وہ خطبے ان مفید اُمور سے بھرے ہوئے ملتے ہیں جن کی جانب اسلام نے لوگوں کو بلا کر انھیں باہمی تعصب کے ترک اور یکدل رہنے کی تاکید کی ہے۔ اور پانچ مرتبہ ایک دن میں امام یا اس کے نائب کے پیچھے جمع ہونے کی تاکید نے ان کے اس اتفاق کو اور بھی مضبوط کر دیا ہے اس امر میں اتحاد و تعلقات کے قوت پانے اور اطاعت پر یک دل ہونے کا جو فائدہ ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں رہ سکتا۔ بلاذری نے بیان کیا ہے کہ فتح مکہ ہونے سے پہلے جب ابوسفیان مسلمانوں کے پاس آئے اور وہ اس وقت مسلمان نہ ہوئے تھے تو انھوں نے مسلمانوں کو نماز میں کھڑے دیکھا جب نبی صلعم رکوع کرتے تو وہ سب جھک جاتے اور جس وقت سجدہ فرماتے سب سجدہ میں آجاتے، ابوسفیان نے یہ حالت دیکھ کر کہا "خدا جانتا ہے کہ میں نے آج کی طرح کبھی کسی ایسی قوم کی فرمانبرداری نہیں دیکھی جو اِدھر اُدھر سے آکر جمع ہوگئی ہو اور نہ معزز فارسیوں اور پرہیبت رومیوں میں ایسی اطاعت گزاری کا نمونہ دیکھا ہے۔"

ایمانِ کامل باقی رہا یہ امر کہ عرب دعوت اسلام کی راستی کیونکر مانتے تھے اور ان کا یہ خیال کس طرح تھا کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں دنیا کے لئے نہیں کرتے بلکہ آخرت کے لئے، سو یہ بات اثنائے فتوحات میں ان کے ہر ایک قول و فعل سے ظاہر ہوتی ہے، مثلاً مغیرہ بن شعبہ کا جواب جبکہ فارس کے سپہ سالار رستم نے قادسیہ کی جنگ میں ان سے کہا تھا کہ "بیشک تم اپنی مطلوبہ شئے کی کوشش میں بیوجہ جانیں دیتے ہو۔" مغیرہؓ نے کہا "ہم میں سے جو قتل ہوتا ہے وہ جنت میں داخل ہوگا اور تم میں سے جو مرے گا وہ جہنم واصل۔ اس کے بعد جو لوگ ہم میں سے باقی رہ جائیں گے وہ تمھارے باقی ماندہ لوگوں پر فتح پائیں گے۔"

حضرت عبادہؓ کی تقریر اور عبادہ بن الصامتؓ کی وہ گفتگو جو مقوقس مصر سے ہوئی تھی جبکہ مقوقس نے انھیں رومی فوجی قوت کا خوف دلا کر ان سے کہا تھا کہ تم کبھی ان کا مقابلہ نہ کر سکو گے۔ اس کے جواب میں عبادہؓ نے کہا، اے شخص تو اور تیرے ساتھی ہر گز اپنے دل میں کچھ گھمنڈ نہ کریں تو جو ہمیں رومیوں کی جماعت اور کثرت سے

دہمکاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم ان پر فتح نہ پائیں گے ۔ میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ بات ہم کو ڈرانیوالی نہیں ہے؛ اور نہ ہمارے اس مصمم ارادہ کو توڑ سکتی ہے جس پر ہم کمربستہ ہیں؛ اور اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو واللہ ان سے جنگ کرنے میں جو چیز ہم کو سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہی ہے اور اب ہماری حرص ان پر بہت زیادہ ہو گئی ہے کیونکہ یہ صورت ہمارے واسطے ہمارے خدا تعالے کے روبرو بہت بڑی عذر خواہی کی وجہ ہو سکتی ہے جبکہ ہم اس کے حضور میں حاضر کئے جائیں گے، اگر ہم ایک سرے سے قتل کر ڈالے جائیں تو بالآخر اس خلاق عالم کی رضامندی حاصل کر کے اُس کی جنت میں داخل ہو جائیں گے ۔ اس سے بڑھکر تو ہم کو کوئی چیز پسند اور مرغوب ہی نہیں بحالت موجودہ تمہارے ساتھ ہمارا تعلق ایسا ہے جس کا نتیجہ ہمارے لئے دو میں سے ایک بہتر ضرور ہوگا یعنی اگر ہم نے تم پر فتح پائی تو عظیم الشان دنیاوی غنیمت ہمارے ہاتھ آئے گی اور اگر تم نے ہم پر غلبہ پا لیا تو ہم غنیمت آخرت سے بہرہ یاب ہوں گے ۔ اور خوب سمجھ رکھو کہ ہماری طرف سے اجتہاد (کوشش) ہو چکنے کے بعد جو بات ان دونوں سے ہم کو زیادہ مرغوب ہے، وہ یہی آخری امر ہے اور خدائے پاک و بے نیاز ہم سے اپنی کتاب میں یوں خطاب فرماتا ہے ۔ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۔ یعنی کتنی ہی دفعہ گروہ قلیل بحکم خدا گروہ کثیر پر غالب آیا ہے اور اللہ صبر والوں کا ساتھی ہے، ہمارے گروہ میں ہر شخص صبح و شام اپنے پروردگار کے روبرو بالحاح تمام یہی دعا مانگا کرتا ہے کہ بار خدایا مجھے شہادت نصیب فرما اور مجھ کو اپنے ملک و وطن اور بال بچوں کیطرف زندہ واپس نہ لیجا اور ہم میں سے کسی کو اپنے پسماندوں کا غم نہیں ہے بلکہ ہر شخص نے اپنے بال بچوں اور مال و متاع کو اپنے خدا کے سپرد کر رکھا ہے البتہ ہم کو فکر ہے تو اس بات کی جو اب ہمارے سامنے ہے؛ (یعنی کفار سے جنگ)، باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہم لوگ بسر اوقات کے سامان میں تنگدست اور بے برگ و ساز ہیں تو یہ خیال اپنے دل سے دور کر دو، کیونکہ ہم بعد فراغت کی زندگی بسر کر رہے ہیں؛ اور ایسے خوشحال ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں، اگر ساری دنیا بھی ہماری ملک ہو جائے گی تو ہم اپنی ذات خاص کے لئے کبھی اس سے زائد نہ چاہیں گے جتنا کہ اب ہمارے لئے ہے؛

اسلامی تاریخ میں اس کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں یہاں تک کہ ایک مسلمان شخص خود اپنے باپ اور بھائی سے جبکہ وہ دونوں مشرک ہوتے لڑتا تھا اور

اسے اچھا سمجھتا تھا، اور دوسرے مذاہب کی تاریخیں دیکھنے سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ انسان کسی معاملے کے اندر ہلاکت میں پڑنے اور خطرہ میں ہاتھ ڈالنے پر تیار نہیں ہوتا مگر جبکہ وہ دینی معاملہ ہو جس میں اُسے بالکل اپنی جان تک کی پروا نہیں رہتی؛ اس کے متعلق خود نصاریٰ کے یہاں عیسوی شہیدوں کے قصے موجود ہیں؛ اور دوسرے مذاہب کی بھی بکثرت اس قسم کی روایتیں ملتی ہیں جو ہمارے مدّعا کو ثابت کرنے کے لئے کافی ووافی ہیں؛

فتح مصر و شام کی وجوہات

مصر، شام اور عراق کے لینے کی خواہش عرب والوں کو یوں اور بھی بڑھی کہ انھیں ان ممالک کی سرسبزی اور زرخیزی کا حال معلوم ہو گیا تھا اور اسی نئی اٹھان کے بعد جواب ان میں پیدا ہو گیا تھا خود ان کا خشک اور بنجر ملک ان کی ضروریات کا ذمہ دار نہ ہو سکتا تھا؛ اور اسلام کے چند ماتحت قبیلے تو محض مال غنیمت ہی کی خاطر لڑتے تھے؛ اس دعوے کی دلیل وہ واقعہ ہو سکتا ہے جو مسلمانوں سے غزوہ حنین اور طائف کے بعد ظہور میں آیا، کیونکہ ان لڑائیوں سے فارغ ہونے کے بعد جبکہ بہت سال اور بے شمار لوٹ کا سامان جمع ہو گیا تھا اور جنگ کے قیدی واپس کر دیئے گئے تھے اس موقع پر جو حالت ہوئی اُسے ابن ہشام یہ لکھکر دکھاتا ہے کہ "نبی صلعم سوار ہو کر چلے اور لوگ یہ غل مچاتے ہوئے آپ کے پیچھے ہو لئے کہ یا رسول اللہ آپ ہمارا لوٹ کا مال اور اونٹ بکریاں ہم کو تقسیم فرمائیں"؛ یہاں تک کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درخت کے تلے ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔ اور ان کی چادر چھین گئی؛ اس وقت نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لوگو میری چادر واپس دیدو۔ قسم ہے خدا کی اگر میرے پاس درخت تہامہ کے برابر نعمتیں ہوتیں تو میں انھیں بھی تم پر بانٹ دیتا؛ اور پھر بھی تم مجھے بخیل، بزدل؛ اور دروغگو نہ پاتے"؛

فتوحات پر اہل عرب کی مساعدت کس امر نے کی؟

یہاں تک تو اس کا بیان تھا کہ فلاں فلاں وجوہ سے عرب والوں کے دلوں میں ایسی عظیم الشان سلطنتوں کے ساتھ جنگ کرنیکی جرأت پیدا ہوئی، مگر یہ بتانا باقی ہے۔ کہ ان فتوحات پر ان کی مساعدت کس امر نے کی جن کی تفصیل یہ ہے؛

جفاکشی اور سادگی

(۱) ان کی چستی و جفاکشی اور زیادہ ساز و سامان کا پاس

نہ رکھنا کیونکہ وہ خانہ بدوش لوگ تھے؛ اور تکلیف سے زندگی بسر کرنیکے عادی ہوکر بھوک و پیاس کی سختیوں سے بے پروا ہو گئے تھے، جب ان میں سے کوئی شخص کسی جنگ کے لئے سفر کرتا، تو کبھی اپنے ساتھ اس قدر اسباب نہ لیتا جو اس کے کندھوں پر یا اس کے اونٹ پر بار ہو؛ بلکہ بعض حالتوں میں تو وہ کھانے کا بھی سامان نہ لیتے تھے، جو کچھ راستہ میں لوٹ مار سے ہاتھ لگتا اُسی سے گذارہ کر لیتے تھے؛ عربوں کے غالب آنے میں اونٹ کا بہت کچھ احسان ہے اسلئے کہ وہ اکیلا ان کے یہاں وہی کام دیتا تھا؛ جو رومیوں کے یہاں گاڑیوں اور گھوڑوں، اور دیگر چوپایوں سے نکلتا تھا؛ عرب کا باشندہ اپنی اونٹنی سے اتنے کام لیتا تھا، اس پر سوار ہوتا، اپنا سامان لادتا، اس کے دودھ کو غذا بناتا؛ اور اس کے سایہ میں بیٹھکر آرام لیتا، ان فوائد کے مقابلے میں اس کی خدمت کچھ نہیں کرنی پڑتی تھی؛ وہ بچارے جنگل کی گھاس پھوس سے پیٹ پالتے اور کبھی سوکھی گھاس ہی پر بسر کرتے، پھر کئی کئی دن تک بھوک اور پیاس کا تحمل کر لیتے تھے؛ بخلاف اس کے رومی یا فارسی اس وقت تک میدان جنگ میں نہ جا سکتا تھا جب تک کہ اس کے ساتھ بہت سا بوجھ خیمہ و خرگاہ اور سامان رسد کا نہ ہو جس کے اٹھانیکی طاقت گاڑیوں کے سوا کسی اور کو نہ ہوتی؛ اور گاڑیوں کے کھینچنے کو جانوروں کی ضرورت پڑتی اور جانوروں کو دانہ چارہ اور پانی کی احتیاج دامنگیر رہتی؛

جنگِ سوڈان کی مثال

اور ہمیں اس بات کا ذکر اسلئے اور بھی کرنا پڑا کہ ہم نے انگریزوں اور سوڈانی عربوں کی جنگ میں بچشم خود یہ حالت دیکھی ہے ۱۸۸۴ء میں جب دریائے نیل کی مہم گارڈن پاشا کو خرطوم کے محاصرہ سے چھڑانیکے لئے روانہ ہوئی ہے اس وقت یہ کیفیت دیکھی گئی کہ ایک انگریز بھی اس وقت تک اپنے مقام سے جنبش نہ کرتا تھا جب تک کہ اُس کے ساتھ ڈبل روٹی؛ بسکٹ، بھنا ہوا گوشت؛ شکر، چائے، دودھ، مکھن؛ اور پانی کی چھاگلیں؛ خیموں؛ ڈیروں کے گٹھڑ اور سامانوں اور کپڑوں کے بوجھ نہ ہوتے؛ اس کے علاوہ ان کے ساتھ گھوڑوں کا دانہ چارہ اور دیگر سامانِ رسد اس قدر ہوتا تھا جس کے اٹھانے کے لئے بہت سے باربردار جانور درکار ہوتے؛ مذکورہ بالا مہم میں آدمی (سپاہی) تو ۱۵۰۰ سو تھے اور اونٹوں کی تعداد چار ہزار تھی؛

جس کی وجہ سے شتربانوں اور دوسرے ملازموں کی ایک بھاری تعداد ھمراہ ہوگئی تھی اور یہ حالت ہم کے سر پر بارگراں ہوتی تھی، برعکس اس کے سوڈانی ان تمام سازاور سامانوں سے بے پروا تھے، ان کے پاس ایک تھیلا ہوتا تھا جس میں تھوڑے سے جوار کے دانے پڑے ہوتے تھے وہ اُسے بغل میں دبانا اور جہاں چاہتا چل دیتا۔

قضاؤ قدر پر اعتماد

(۲) ان کا قضاؤ قدر پر اعتقاد رکھنا اور یہ ماننا کہ جب تک موت نہ آئے انسان ہرگز نہیں مرتا۔ جب اس کا وقت آجاتا ہے تو فوراً مرجاتا ہے چاہے اپنے بستر استراحت ہی پر کیوں نہ پڑا ہو، اور موت نہ آئے تو برستی ہوئی تلواروں کے سایہ میں بھی اس کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ یہ اعتقاد بہت پختگی کیساتھ ان کے دلوں میں جما ہوا تھا، اور ان کے مشہور وقائع میں جو دلیریاں ان سے ظاہر ہوئی ہیں، ان سب کی علت یہی اعتقاد تھا۔

شہسواری اور تیراندازی

(۳) گھوڑے کی سواری اور تیراندازی میں ان کا ماہر کامل ہونا، ان امور میں وہ رومی اور فارسی دونوں قوموں سے کہیں زیادہ ماہر تھے۔ پھر عرب کے گھوڑے بھی رومیوں اور فارسیوں سے نجیب تر ہوتے تھے، اور ان کی زیادہ تر لڑائیوں میں رواج زمانہ کے مطابق ایک ایک و دو شخصوں کا مقابلہ ہوا کرتا تھا، وہ لوگ تمام فوج میں سے ایک ایک سوار کو چنتے تھے، اور وہ میدان میں نکل کر باہم مقابل ہوتے۔ جو غالب آجاتا اس کے طرفدار بازی جیت لیتے۔ اور عرب والے اس طریقہ سے اکثر کامیاب ہی ہوتے تھے۔ نیز بسا اوقات ان کی فتحمندی صرف اس شخص کی کوششوں پر منحصر ہوتی تھی جو میدان میں نکلکر غالب رہتا۔ یا کسی ایسے سچے نشانہ باز قدرانداز پر جو ایک ہی تیر میں غنیم کے سپہ سالار کا خاتمہ کردیتا جس سے اس کی سپہ منتشر ہوجاتی ہے جس مقام پر ہم جنگی ہتھیاروں کا ذکر کریں گے وہاں اس امر کی تفصیل آئے گی۔

بہادر جرنیلوں کا ظہور

(۴) اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا زمانہ مشہور ذیشان لوگوں کے پیدا کرنے میں ویسا ہی ممتاز گزرا ہے جیسا کہ نپولین کا زمانہ نامی جنرلوں کے لئے مشہور ہوا ہے۔ کیونکہ وہی ملک فرانس بعد میں اس قسم کے جنگجو

سردار پھر نہ پیدا کر سکا۔ پنولین اعظم کے جنرل فرینچ بغاوت کے بعد نام آوری کے میدان میں اُترے جیسا کہ اسلام کے صدرِ اوّل میں نامور لوگ نمایاں ہوئے جبکہ ملک عرب میں واقعہ فیل گزرا اور حبشی لوگوں نے ہاتھیوں اور فیل سواروں کی کثیر تعداد کے ساتھ خانہ کعبہ پر حملہ کیا تھا۔ اس واقعہ نے عربوں کے سکون میں ایک قسم کی حرکت پیدا کردی۔ اور زمانہ کے انقلابات کی وجہ سے جو صدمات پہنچے انھوں نے عرب کو اپنے شکنجے میں کس کر انھیں اپنی حالت کے سنبھالنے کا خیال دلادیا جس کی وجہ سے ان کی وہ مخفی قوتیں جو اب تک دبی ہوئی اور پنہاں تھیں اُبھر کر آشکارا ہوگئیں۔ ایسے سخت حادثے لوگوں میں اکثر ایک قسم کا مادۂ ترقی اور جوش پیدا کر دیتے ہیں جس سے پوشیدہ قوتیں اور دبی ہوئی طاقتیں آشکارا ہوجاتی اور اُبھر آتی ہیں۔ ہمارے اس دعوے پر تاریخ ایک زبردست شاہد ہے گویا کہ خداوند پاک نے عرب والوں کی قسمت میں فتحمندی لکھ دی تھی کہ ان کو ایسے سرداروں اور سپہ سالاروں کے ساتھ مختص کیا جو فنونِ جنگ حسنِ تدبیر اور حکمت عملی میں دنیا کے چیدہ چیدہ لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً خالد بن الولیدؓ، خالد بن سعیدؓ، ابی عبیدہ ابن الجراحؓ، سعد بن ابی وقاص، یزید بن ابی سفیان، حمزہ بن عبد المطلبؓ اور علی بن ابی طالبؓ جیسے لوگ جن میں دلیری اور سپہ سالاری کا مادہ غالب تھا، اور عمرو بن العاصؓ معاویہ بن ابی سفیانؓ، مغیرہ بن شعبہ، اور زیاد بن ابیہ کی مانند مدبر و ہوشیار لوگ اور ابوبکر صدیقؓ و عمر بن الخطابؓ کی مثل دانا و متقی اور صاحبِ ہمت لوگ ان میں پیدا ہوئے۔

اسلام کے تیزی سے کامیاب ہونے میں ان مذکورہ بالا عظیم الشان لوگوں یا اُن جیسے اور نامور شخصوں کا وجود میں آنا ایک قوی سبب تھا اور خود مسلمان اس بات کو بخوبی جانتے تھے یہاں تک کہ آغازِ دعوت کے زمانہ میں خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا "خدایا حمزہ بن عبد المطلب کے مسلمان ہونے سے اسلام کی تائید فرما" اور جب حمزہؓ داخلِ اسلام ہو چکے اور عمرؓ بھی مسلمان ہو لئے تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ "بیشک حمزہؓ اور عمرؓ کے اسلام لانے سے مذہبِ اسلام کو تائید پہنچی ہے"۔

ابی بکرؓ، عمرؓ، علیؓ، ابن العاصؓ، معاویہؓ، اور خالدؓ جیسے لوگ آج کے دن ظاہر ہوتے تو اسمیں کلام نہیں تو ان کا شمار ان بڑے بڑے لوگوں میں ہوتا، جن کی عظمت کو مہذب دنیا بطور ضرب المثل کے پیش کرتی ہے جیسا کہ یورپ کے لوگ ان دنوں بوناپارٹ، کرامویل

بسمارک، اور گلیڈ اسٹون کو ضرب المثل بناتے ہیں؛ مذکورہ بالا اشخاص ان نامور لوگوں کے علاوہ ہیں جو اموی اور عباسی حکمرانوں کے عہد میں پیدا ہوئے اور شہرت و عظمت کے آسمان پر نیر اعظم بن کر چمکے

صبر اور استقلال

(۵) جنگ موتہ کے بعد جس میں اہل عرب کو شکست ہوئی انھیں رومیوں کی قوت و کثرت کا علم و تجربہ ہو گیا تھا؛ اب وہ اس امر سے آگاہ ہو گئے تھے کہ رومیوں کی لڑائی اور ہے اور جنگلی لوگوں کی جنگ اور؛ جن سے کہ وہ اپنے ملک میں روز لڑا کرتے اور آپس میں ایک دوسرے پر چھاپہ مارا کرتے تھے؛ جس وقت انھیں یہ بات ثابت ہو گئی تو انھوں نے اس کے بعد والے زمانہ میں رومیوں سے جنگ کرنے کا طریقہ بدل دیا۔ اب وہ بجائے سرعت کے ساتھ حملہ آور ہونے کے چپکے چپکے لڑتے رہنے اور لڑائی کو طول دینا سیکھ گئے تھے، اور اسی بات پر کاربند رہتے تھے۔؛ صبر کرنے کی عادت تو ان کے لئے بہت ہی آسان کام تھا، اس لئے کہ ان کو تھوڑی سی غذا، اور موٹے جھوٹے کپڑوں پر اکتفا کرنا پہلے ہی سے آتا تھا، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے؛ اور جب ان کا سامان ہو چکتا تھا تو وہ لوٹ مار پر جھک کر چوپائے اور گیہوں وغیرہ جو کچھ ملجاتا اس پر بسر اوقات کر لیتے تھے؛

چھاپہ مار جنگیں

شروع شروع میں جب اہل عرب عراق اور شام کے ملکوں پر بڑھے ہیں تو ان کی لڑائیوں کا رنگ ملکی فتوحات کی نسبت چھاپے مارنے اور لوٹ مار کرنے سے زیادہ مشابہ تھا، اور اکثر فتوحات میں ان کا یہی قاعدہ تھا کہ جس شہر کو فتح کرنے کا ارادہ کرتے اس پر پہلے اپنی فوج کی ایک جماعت کو چھاپہ مارنے کے لئے بھیجدیتے اور کبھی بظاہر ان کا یہ ارادہ بھی نہیں ہوتا تھا؛ کہ اس ملک کو فتح ہی کریں گے؛ اس طرح وہ اس شہر کے گرد قتل و غارت کرتے ہوئے چکر کاٹتے تھے، یہاں تک کہ انھیں فتح کا موقع ملجاتا تو اسے غنیمت سمجھکر ہاتھ سے نہیں دیتے تھے؛ انھوں نے صدر اسلام اور اس کے مابعد زمانہ میں اپنی بہت سی فتوحات کے اندر ایسا ہی طریقہ برتا؛ کیونکہ جب موسیٰ بن نصیر نے طارق کو ۹۲ھ میں سواحل ہسپانیہ کی جانب روانہ کیا تھا تو اس کی غرض صرف لوٹ کی تھی کچھ فاتح کی حیثیت سے نہیں بھیجا تھا، مگر حسن اتفاق

کہ آخر کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے جنھوں نے فتح ملک میں طارق کی مدد کی؛ یہ اسباب ان سببوں سے ملتے ہوئے تھے، جنھوں نے ملک شام کی فتح پر اہل عرب کو کمک پہنچائی تھی؛ اس طرح سے طارق اندلس میں داخل ہو گیا اور جب موسیٰ کو یہ اطلاع ملی تو اُسے پہلے تو اس بات کا تعجب ہوا، پھر اُسے ناگوار گذرا کہ آپ ہی فاتح کیوں نہ ہوا؟ لہٰذا اس نے حکم امتناعی بھیجکر طارق کو آگے بڑھنے سے روک دیا؛ ان دونوں کے مابین جو واقعہ گذرا وہ ناظرین تواریخ سے مخفی نہیں؛ افریقیہ اور اس کے آس پاس کے ملکوں کی فتوحات میں بھی عرب کی یہی حالت رہی؛

عرب والوں کی کمک

(۶) اسلام ابتدائی حالت میں عربوں کی ترقی کا پہلا قدم تھا، اور مسلمان خود عرب ہی کے باشندے تھے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اکثر حالتوں میں یہ دونوں لفظ مسلمین اور عرب ایک ہی معنوں میں مستعمل ہونے لگے؛ جب لوگ عربوں کا ذکر کرتے تو ان سے مسلمانوں کو مراد لیا کرتے؛ اور اس کے برعکس بھی ہوتا؛ داخل اسلام ہونے کے معاملے میں بنسبت اور قوموں کے اہل عرب قریب تر تھے؛ اس لئے کہ اسلام پر فخر کرنیمیں جو خصوصیتیں انھیں حاصل ہیں دوسروں کو حاصل نہیں؛ یہ بات بہت مضبوطی کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی؛ خصوصاً اس وقت اور بھی جبکہ عمرؓ نے جزیرہ عرب سے غیر مسلم لوگوں کے نکال باہر کرنے کا حکم دیا تھا، جس کے بعد تمام مشرکین اور غیر مذاہب کے لوگ جزیرہ عرب سے جلاوطن ہو گئے اور اب اس جزیرہ میں سوئے مسلمانوں کے کوئی غیر باقی نہیں رہا۔ چنانچہ اس وقت سے آج تک یہ حالت بدستور قائم ہے؛

عرب و عجم کی عداوت

مسلمانوں نے شام اور عراق کے شہروں پر ایک ہی دفعہ حملہ نہیں کیا؛ بلکہ بہت دنوں تک وہ ان ممالک کے قرب و جوار میں جو صحرائے عرب سے متصل تھے لوٹ مار کرتے رہتے میں مصروف رہے تھے؛ عراق اور شام کے صحراؤں کے رہنے والے بھی مسلمانوں ہی کی طرح عرب تھے جن میں حدود ملک شام پر صوبہ حوران کے شہر بصریٰ میں غسانی خاندان کے لوگ فرمانروا تھے اور عراق کی سرحدوں پر شہر حیرہ میں منذری گھرانہ حاکم تھا ملک شام میں غسانی لوگ رومیوں کے گورنر تھے؛ اور عراق میں منذری اُمرا اہل فارس کے عمّال شمار ہوتے تھے؛ اہل عرب لوں تو روم اور فارس والوں سے طبعاً نفرت و عداوت رکھتے تھے

لیکن "زبردست کا ٹھینگا سر پر" دباؤ میں پڑ کر ان کے ماتحت بنے تھے؛ خصوصاً منذری گھرانے کے لوگ تو نعمان بن منذر (جس کا لقب ابو قابوس تھا۔) کے قتل ہو چکنے کے بعد سے فارس والوں سے خار کھا رہے تھے؛ نعمان مذکور کو کسریٰ پرویز نے قتل کرا دیا تھا؛ اور اس کے قتل ہونے کے باعث سے فارسیوں اور عرب کے باشندوں میں ایک مشہور جنگ بھی واقع ہوئی جو "ذوقار" کے نام سے معروف ہے اس جنگ میں فارس والوں کو بہت بری طرح شکست کھانی پڑی تھی اور وہی سب سے بڑا میدان تھا جس میں عرب والوں نے عجم سے بازی لی، یہ عجیب اتفاق ہوا کہ مذکورہ بالا واقعہ اس سنہ میں ہوا تھا؛ جس میں "بدر کبریٰ" کا واقعہ ہوا ہے، اور دونوں جنگوں میں عرب والے ہی مظفر و منصور رہے۔ منذری خاندان اور فارس کے لوگوں میں اس وقت تک عداوت و مخالفت قائم رہی جبکہ خالد بن الولید نے ان پر فوج کشی کر کے تین باتیں ان کے روبرو پیش کیں۔ اسلام؛ یا جزیہ دینا؛ یا لڑ نا مرنا؛ ان لوگوں نے جزیہ دینا منظور کیا اور ایک مقدار مال معین پر جسے ہر سال ادا کرتے رہنے کی شرط کی تھی صلح کر لی؛ بصریٰ وغیرہ نصاریٰ کے دیگر ممالک میں بھی جو ملک شام کی حدود میں تھے نیز ان مقامات میں جو خط عرب میں داخل اور حدود صحرا کے اندر عراق عرب اور ملک شام کے مابین واقع تھے؛ یہی صورت پیش آئی مثلاً عین التمر، اور صندودار، ان مقامات میں، خاندان کندہ؛ ایاد؛ اور قراقر کے لوگ آباد تھے؛ اور یہ جگہ بنی قلب وغیرہ قبائل کے رہنے کی تھی جو بسبب پانی دستیاب ہونے کے یہاں سکونت رکھتے تھے، خالد ابن ولید نے عراق سے ملک شام آتے ہوئے ان قبائل سے جنگ کی تھی؛ جن اسباب کو ہم نے اوپر بیان کیا ہے ان کی نیز دیگر اسباب کی وجہ سے خاص عرب کے باشندے اسلام کی ملک لئے بہ نسبت دیگر قوموں کے زیادہ قریب اور پیش دست تھے؛ اور جو اسباب اس امداد کے محرک ہوئے وہ حسب ذیل تھے؛ عرب کے ہر ایک قبیلے کے ساتھ چند با تیں خاص تھیں مثلاً یمن کے رہنے والے عرب اہل فارس سے خار کھائے تھے؛ جب سے فارسیوں نے اسلام سے پیشتر ان کے ملک کو فتح کرنے کے بعد اس پر علیحدہ علیحدہ حکومت کی اور بعد ازاں ان کی سلطنت کا سایہ یمن والوں کے سر سے سمٹ کر صرف بحرین پر قائم رہا تھا؛ یمن کے باشندے ان کے دشمن ہو رہے تھے؛ قوم ربیعہ ملک فارس کے ایک صوبہ ممالک جزیرہ میں سکونت پذیر تھی؛ یہ قوم بھی فارس

کے باشندوں کو نقصان پہنچانے میں مسلمانان عرب کی بہت کچھ معاون ہوئی۔

اکثر حالتوں میں مذکورہ بالا عربی قبائل اور ان کے علاوہ ملک شام کے اصلی باشندے بھی محض جزیہ دینے سے بچنے کے لئے رومیوں کے مقابلے پر مسلمانوں کی جانبداری کرتے تھے جیسا کہ جراجمہ (مردہ) نے کوہ لکام میں کیا، حبیب بن مسلمۃ الفہری نے جب ان پر چھاپہ مارا تو وہ جھٹ پٹ امن کے خواہاں ہو گئے اور پھر اس شرط پر صلح کر لی کہ ہم مسلمانوں کے مددگار، ان کے جاسوس، اور کوہ لکام میں رہیں گے۔ مگر یہ بھی کہ ہم سے جزیہ کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ ان کے شہر میں و جو لوگ تاجر، اجیر، اور محکوم رعایا کی قسم سے تھے جن میں بعض نبطی تھے۔ اور بعضے دیگر اقوام سے اور نیز تمام دیہات کے لوگ سب اس صلح میں داخل ہو گئے تھے اور ان کا نام رداد یف رکھا گیا تھا۔

پسپا ہونے کا راستہ

(۷) شام اور عراق وغیرہ میں عربوں کی جنگ کا ایک یہ بھی قاعدہ تھا کہ وہ لڑائی چھیڑنے اور حملہ کرنے سے پہلے اپنے پسپا ہونے کا راستہ محفوظ کر لیتے تھے تاکہ ضرورت کے وقت بھاگنے کا موقع رہے۔ لہذا وہ رومیوں اور فارسیوں سے اس وقت تک نہیں لڑتے تھے جب تک کہ اپنے آپ کو کسی محفوظ مقام میں نہ کر لیں۔ اس راہ فرار کی حفاظت ان کے لئے ایک نہایت آسان بات تھی۔ کیونکہ وہ جنگلوں اور لق و دق میدانوں کو اپنے پس پشت لے کر معرکہ آرا ہوا کرتے تھے، اور صحرا ان کی جائے پناہ تھا، جس وقت وہ بھاگتے تھے رومی یا فارسی ان کی گرد کو بھی نہ پا سکتے تھے۔ اور نہ انھیں اس تعاقب کی حاجت معلوم ہوتی تھی، جب رومی لوگ اپنے مقام پر واپس آجاتے تو اہل عراق پھر ان کے مقابل آکر ڈٹتے تھے۔ اسی طرح پسپا ہو کر مقابلہ کرتے رہنے سے رومیوں کا ناک میں دم کر دیتے تھے۔ اور لڑائی کو طول دے کر ان کی قوت کو گھٹاتے جاتے تھے۔ خواہ وہ غنیم کے مقابلے میں کتنے ہی کم ہوں لیکن آخر کار اسے تباہ کر ڈالتے تھے، اس معاملہ میں ان کی بعینہٖ وہی حالت تھی، جو اندنوں ہماری پر شوکت اور طاقتور گورنمنٹ انگلشیہ کے مقابلے میں بوروں کی کیفیت تھی، گو وہ بہت تھوڑے تھے۔ لیکن انھوں نے کثیر التعداد انگریزی فوجوں کو دق کر رکھا تھا۔ اور نہ فوجیں بھی ایسی جن کے پاس کسی قسم کے سامان اور آلاتِ حرب کی کمی نہ تھی۔ نہ وہ بزدل تھیں۔ لیکن بات یہ تھی کہ بوئر لوگوں نے وقتاً فوقتاً حملہ کرتے رہتے اور مار پیٹ کر اپنے مقامات میں جو انھوں نے دشوار گذار پہاڑوں کے

اندر مقرر کر رکھے تھے جا گھسنے سے انگریزی فوجوں کو کھٹکا مارا تھا؛ اور قباحت یہ تھی کہ سرکاری فوجیں وہاں بلاسخت خطرہ میں مبتلا ہوئے جا نہیں سکتی تھیں؛

اپنے علاقے میں جنگ یہ قاعدہ اہلِ عرب کے یہاں بہت زور کے ساتھ ملحوظ رہتا تھا، یہاں تک کہ ان میں سے بعض لوگ اوروں کو بھی اس کی ہدایت کیا کرتے تھے، منجملہ ایسے ہی اقوال کے مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کا یہ قول بھی ہے جو ایک لیڈر اور جنگجو عربی سردار تھا جس وقت اُسے مسلمانوں کے اہلِ فارس سے معرکہ آرا ہونے کے لئے ملکِ عراق میں آنیکی اطلاع ملی تو اس نے یہ پیغام افسرِ فوجِ اسلام سے کہلا بھیجا تھا؛

"اہلِ فارس سے ان کے ملک کی سرحدوں پر ایسے مقام میں جنگ کرو جہاں کہ سرزمین عرب کا ایک چھوٹا سا پتھر بھی پایا جا سکے؛ خبردار ان کے گھروں میں گھسکر نہ لڑنا؛ اگر خداوند پاک نے مسلمانوں کو فتحمند بنایا تو جو کچھ اہل فارس کے پس پشت ہے۔ سب انھیں کا ہوگا؛ لیکن بصورتِ دیگر انھیں اپنے ہی لوگوں میں سے کسی گروہ میں واپس آنا ہوگا جس کے بعد وہ اپنی راہ سے زیادہ باخبر اور اپنی سرزمین پر زیادہ دلیر ہوں گے۔ یہاں تک کہ حق سبحانہ' انھیں دوبارہ حملہ کرنیکی استطاعت دے"

دریا کا حائل نہ ہونا خلیفہ عمر بن الخطابؓ کی یہ خواہش کہ مرکزِ خلافت مدینہ اور اسلامی مملکت کے تمام گوشوں سے آمد و رفت کا سلسلہ باقی رہے۔ اس امر کی اور بھی تائید کرتی ہے کیونکہ خلیفہ ممدوح اس امر پر بیحد مصر رہتے تھے؛ کہ اُن کے اور تمام مسلمانوں کے مابین راہ میں کوئی دریا حائل نہ ہو، فارس اور مصر فتح ہو چکنے کے بعد جس زمانہ میں امیر سعد بن ابی وقاص مدائن میں اور امیر عمرو بن العاص اسکندریہ میں مقیم تھے؛ خلیفہ ممدوح نے تمام اُمرائے اسلام کو یہ فرمان لکھا تھا کہ "میرے اور اپنے مابین کسی دریا کو حائل نہ کرنا تاکہ جس وقت میں اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر تمھارے پاس آنا چاہوں تو آسکوں"؛ اس حکم کے موصول ہونے پر سعدؓ کوفہ میں آگئے اور عمرو بن العاص فسطاط میں؛ ان دونوں امیروں نے اپنی فوجوں کے ساتھ کیمپ میں سکونت اختیار کی، بعدازاں ان ہی خیموں کے پڑاؤ کچھ عرصہ بعد بڑے بڑے آباد شہر بن گئے

یرموک شام اور عراق کے معرکوں میں اہل عرب کا جو قاعدہ تھا اُسے ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اس کے بعد یرموک کا مشہور معرکہ پیش آیا جو ابوبکرؓ

کی زندگی ہی میں ۱۳ھ میں واقع ہوا۔ یرموک اطرافِ شام میں ایک وادی (نالہ) ہے جو طبریے کے قریب واقع ہے، اس میں سے پانی بہہ کر بحیرہ طبریہ میں گرتا ہے اس کا یونانی نام (Hilramax) تھا جس کو اہلِ عرب نے اپنے تلفظ میں لاکر "یرموک" کر دیا۔ اسی ندی کے کنارے پر یہ خوفناک معرکہ ہوا تھا فتحِ شام میں اس کی بڑی شان ہے اس لئے کہ اسی معرکہ میں مسلمانوں کی کامیابی نے انھیں فتوحات کا سلسلہ قائم رکھنے پر مستعد بنایا اور رومیوں کی ہمتیں پست کر دیں۔

کامیابی کے اسباب

واقعہ یرموک کے حالات میں غور کرنے کے بعد اس میں مسلمانوں کی کامیابی کا باعث صرف دو چیزیں پائی جاتی ہیں، عمرو بن العاص کی رائے صائب، اور خالد بن الولید کی شجاعت۔ کیونکہ جس وقت رومیوں نے حدودِ شام پر اہلِ عرب کی چھیڑ چھاڑ اور ان کی مار دھاڑ دیکھی تو انھوں نے اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے یہ قصد کیا کہ مسلمانوں کو یکبارگی پیس ڈالیں۔ مسلمان لوگ شام و عراق کے اطراف میں متفرق تھے۔ انھیں اس امر کی خبر ملی تو انھوں نے باہم اس معاملہ میں خط و کتابت کی۔ عمرو بن العاص رضؓ نے کہا، کہ "میری تو یہ رائے ہے کہ اجتماع بہتر ہے۔ کیونکہ جب ہم اکٹھے ہو جائیں گے تو تھوڑے ہونے پر بھی مغلوب نہ ہو سکیں گے اور اگر ہم متفرق رہیں گے تو ہم میں سے ہر ایک فرقہ دشمنوں کی کثرت کی وجہ سے اپنے مدِّ مقابل غنیم کا بار نہ اٹھا سکے گا۔ مسلمانوں نے ابو بکر رضؓ کو اس رائے سے اطلاع دی، اور انھیں تمام صورتِ حال لکھ بھیجی۔ ابو بکر رضؓ نے بھی وہی جواب دیا جو عمرو بن العاص نے کہا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کی فوجیں شام و عراق سے آن آن کر یکجا جمع ہو گئیں اور یرموک کے میدان میں اُن سے اور رومیوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ابنِ اثیر کے قول کے مطابق رومیوں کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار تھی، اور مسلمانوں کی تعداد صرف پچاس ہزار جو خالد بن الولید کی ماتحتی میں تھے۔ خالد نے مسلمانوں میں کھڑے ہو کر ایک پر زور تقریر کی اور انہیں غنیم کے مقابل ثابت قدم رہنے پر ابھارا اور ہمت بندھائی۔ پھر انھوں نے اسلامی فوج کے کئی حصے کر دیئے۔ اور ہر حصے پر ایک سردار مقرر فرمایا۔ اہل عرب صف بندی کر کے لڑنا نہ جانتے تھے جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ مگر یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالد رضؓ نے رومیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے انھیں کے فوجی نظام کو دیکھ کر اپنی افواج کو بھی اسی طرز پر مرتب کر لیا

خالد کو مسلمانوں کے خوفزدہ ہونے کا احساس ہو گیا تھا؛ لیکن وہ مختلف اوضاع سے انھیں جوش دلاتے رہتے؛ مثلاً انھوں نے ایک مسلمان کو یہ کہتے سنا کہ "روم والے کتنے زائد ہیں اور مسلمان تھوڑے"؛ اُسے اُنھوں نے چھوٹتے ہی یہ جواب دیا کہ "روم والے کس قدر تھوڑے ہیں، اور مسلمان زائد"؛ تم سمجھ رکھو کہ تھوڑی فوجیں فتحمندی کے ساتھ زائد ہو جاتی ہیں"؛ اور شکست و ہزیمت کی وجہ سے بڑے بڑے لشکر صرف تھوڑے سے آدمیوں کے برابر رہجاتے ہیں"؛ جس وقت کہ اسلامی فوجیں معرکہ کارزار میں تھیں؛ ان کے پاس ابو بکرؓ کی وفات کی خبر آئی؛ مگر انھوں نے بدیں خیال اس خبر کو مخفی رکھا کہ اس میدان میں ہزیمت کھانا ہماری تمام محنتوں کو رائیگاں کر دے گا؛ اور ہمیں بالکل تباہ و برباد کر ڈالے گا؛ مسلمانوں نے اس معرکہ میں بڑی سخت جنگ کی یہاں تک کہ ان کی عورتیں بھی لاٹھیاں لے کر لڑی تھیں آخر کار انھیں فتح نصیب ہوئی اور یہی فتح ملکِ شام کی آئندہ فتوحات کا پیش خیمہ بنی؛ اسی طرح ملکِ عراق میں قادسیہ کا معرکہ ان کے اہلِ فارس پر فتوحات حاصل کرنے کی بسم اللہ ہوا۔ اس جنگ میں بھی مسلمانوں نے بڑی پامردی اور صبر دکھایا تھا اور بہت دنوں تک یہ میدان سر نہ ہو سکا

کفّار کی نااتفاقی

(۸) رومیوں اور فارسیوں کے خانگی جھگڑوں میں گرفتار رہی؛ پھوٹ اور خانہ جنگی؛ ان کی متفقہ قوت کی کمزوری اور اخلاق کی خرابی نے بھی ان دونوں ممالک کے رہنے والوں کو نیچا دکھایا۔ مذکورہ بالا حالت اس عداوت اور مخالفت کے علاوہ تھی؛ جو ملک کے اصلی باشندوں اور ان کے غیر قوم حکمرانوں کے مابین پھیل رہی تھی؛ مصر اور شام کے ملک میں اس عداوت کا بہت زور تھا اس لئے کہ مصر کے اصلی باشندے جو کہ قبطی تھے؛ پے درپے کئی صدیوں تک غیر قوم کے حکمرانوں کی زیادتیاں برداشت کرتے رہے تھے؛ پہلے فارس والوں کے محکوم ہوئے بعد ازاں یونان والوں کے اور پھر رومی قوم کے زیر فرمان آئے؛ اس تغیر و تبدّل نے ان کی طبیعتوں کو انقلاب پسند بنا دیا تھا؛ اور آئے دن کے ظلم و ستم سے بچنے کے لئے ایک حکومت کے پنجے سے نکل کر دوسری سلطنت کی ماتحتی میں آجانا انھیں ایک آسان کام ہو گیا تھا؛ اسی طرح اہلِ شام جو کہ آرامی، سُریانی، نبطی اور یہودی وغیرہ

قوموں میں سے تھے؛ وہ بھی اپنے مصری پڑوسیوں کی طرح مصیبت کے مارے ہوئے اور انہیں کی مانند استقلال سے مایوس ہو چکے تھے؛ اس لئے انھیں اس کی کوئی پروا نہ تھی؛ کہ ان کا حاکم رومی ہو یا عربی؛ البتہ صرف اس قدر چاہتے تھے کہ انھیں اس حکمران کے ماتحت راحت و امن نصیب ہو۔ ملک شام کے رہنے والوں کو بہ نسبت اور اقوام کے عربی قوم کی حکومت پسند بھی ہو سکتی تھی کیونکہ اہلِ عرب زبان، نسب اور عادات کے معاملہ میں ان سے بہت قریب تھے؛ اس بات کو بھی جانے دیا جائے، تاہم ایک اور امر قابلِ لحاظ ہے وہ یہ کہ انسانی طبیعت کا خاصّہ ہے کہ بہ نسبت قریب والے کے دور والے سے زیادہ نفع پانے کی اُمید رکھا کرتا ہے اور نئے آنے والے سے بہ نسبت ہمیشہ کے پاس رہنے والے کے زیادہ بہتری کا متوقع ہوتا ہے؛ خصوصاً اس صورت میں جبکہ مذکورہ بالا شخصوں کی حالت کا فرق ظاہر ہو جیسا کہ رومیوں اور اہلِ عرب میں بیّن فرق تھا؛ کیونکہ ان دنوں روم والے ادبار و تنزل کے چکر میں آ چکے تھے؛ ان کے احکام و آداب بگڑ چکے تھے اور عرب اپنے اٹھان و ترقی کے دور میں تھے، انھوں نے انصاف و مساوات کو اپنا طریقہ بنا رکھا تھا، یہ سب باتیں ان مذہبی اختلافوں اور جدائیوں کے علاوہ تھیں جو ان دونوں ملکوں کے رہنے والوں اور رومانی حاکموں کے مابین وجہ بیگانگی تھیں؛ ہم ان تمام باتوں کو اوپر بیان کر آئے ہیں؛ ان اسباب سے شام اور مصر کے رہنے والوں کو کسی غیر قوم و مذہب کے حاکم کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنا اور اُسے اپنے ہم مذہب حکام کے بالمقابل مدد دینا آسان معلوم ہوتا تھا

یہود

(۹) اگرچہ روم والے متعدد گروہوں اور جماعتوں میں منقسم تھے؛ تاہم جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے یہودیوں کے ستانے اور دق کرنے کے معاملے میں وہ سب ایک ہو جاتے تھے، جس وقت مسلمان ملکِ شام کو فتح کرنے کی نیت سے آئے ہیں یہ دشمنی حد درجہ کو پہنچ چکی تھی؛ اور گو یہودی لوگ مال کو جان سے بھی بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں، لیکن بدعملوں سے انتقام لینے کی راہ میں وہ اپنے مال و منال کو خرچ کرنے پر بھی آمادہ تھے؛ اور فی الواقعہ اکثر حالتوں میں رومیوں کے مقابلے پر وہ اہلِ عرب کے مددگار ہوتے رہے؛ ان کو شہروں کا مخفی راستوں کا راز بتا کر شہر میں لے جایا کرتے تھے؛ جیسا کہ قیساریہ میں کیا، مسلمانوں نے متواتر سات برس تک اس شہر کا محاصرہ کئے رکھا؛ لیکن وہاں کی فوج کی طاقت اور اس

کے قلعوں کی پائداری و دشوار گذاری کی وجہ سے فتح نہیں کر سکے، ہر ایک رات میں قیساریہ کی فصیلوں کی حفاظت کرنے کے لئے ایک لاکھ فوج متعین رہتی تھی، اسلامی فوج کے سپہ سالار اس مقام پر معاویہ بن ابی سفیانؓ تھے، ان کے پاس قیساریہ کے باشندوں میں سے ایک یہودی آیا جس کا نام یوسف تھا، اس نے محض اس شرط پر کہ اُسے اور اس کے بال بچوں کو امن دیا جائے مسلمانوں کو ایک بدررو بتادی جس میں پانی تھا اور اس کے اندر سے ہو کر آدمی شہر میں داخل ہو سکتا تھا، اس بات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان لوگ شہر میں اُسی بدررو کے راستہ سے گھس گئے۔ اور اُسے فتح کر لیا۔

یہودیوں کی امداد

جب عبیدہؓ نے شہر سامرہ کو صلح سے لیا تو وہاں کے رہنے والے سب یہودی تھے ان سے صرف یہ شرط تھی کہ مسلمانوں کے جاسوس اور راہبر بنیں اسی شرط کے مقابل میں ان کو جزیہ سے بری کر دیا اور ان کی زمین انھیں کو دیدی کہ اس کی آمدنی کھائیں اور خرچ میں لائیں۔ دوسرے ایسے ہی شہروں کی حالت کو جنھیں یہودیوں نے محض اپنے رومی حاکموں کے زک دینے کی غرض سے بددیانتی کر کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں سپرد کر دیا اسی پر قیاس کر لو۔ اور ان سب باتوں کا سبب وہی عداوت اور بددلی تھی جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔

مسلمانوں کا عدل اور خدا ترسی

(۱۰) ان عمدہ صفات کا ان لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑتا تھا جو رومی اور ایرانی والوں کی حکومت سے آزاد ہو کر مسلمانوں کے سایۂ عاطفت میں داخل ہوتے تھے۔ یہ نیک برتاؤ ان کی سب سے مقدم وصیت تھی جسے ساتھ لے کر دارالخلافت سے فتوحات کے لئے قدم نکالتے تھے۔ دیکھو جب کہ اسامہ بن زید اسلامی فوج کو ساتھ لے کر دارالخلافت سے شام کی جانب روانہ ہوئے ہیں۔ ابوبکر صدیقؓ نے انھیں حسب ذیل فہمائش کی تھی۔

حضرت ابوبکر کی ہدایت

بددیانتی، بے وفائی، ظلم و زیادتی نہ کرنا، لوگوں کے اعضا کاٹنے، بچیں، سن رسیدہ بڈھوں اور

عورتوں کے قتل کرنے، پھل دار درخت کو کاٹنے اور جلانے اور درختوں کو بے ثمر بنانے سے پرہیز رکھنا، بکری، گائے اور اونٹ کو غذا کے لئے ذبح (قربانی) کرنے کے علاوہ اور کسی وجہ ذبح نہ کرنا اور عنقریب تم ایسے لوگوں کے پاس سے گذرو گے جنھوں نے خدا کی عبادت کے لئے عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں سکونت اور گوشہ نشینی اختیار کر رکھی ہے؛ انھیں اُن کی حالت پر چھوڑ دینا اور ان کی عبادت گاہ یا خانقاہ سے بھی معترض نہ ہونا؛

مساوات کا قیام

انھیں شائستہ سلوکوں میں سے ایک طریقہ ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں میں مساوات کا قائم کرنا بھی تھا؛ اس امر کی سب سے روشن دلیل غسان کے بادشاہ جبلہ بن ایہم غسانی کا قصہ ہے؛ جبکہ وہ عمر بن الخطاب کے عہد میں مسلمان ہو کر اپنے خدم و حشم کے ساتھ مدینہ آیا تھا؛ عمر رضؓ اس کے مسلمان ہونے سے بہت مسرور ہوئے اور مدینہ کے رہنے والے اس کے جلوس کو دیکھنے نکلے جس میں مرصع و مغرق ساز و براق کے گھوڑے تھے اور جبلہ کے سر پر جواہرات کا مرصع تاج تھا، باوجود اس شان و شوکت اور رعب و جلال کے جبکہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا اور قوم فزارہ کے ایک شخص نے اس کے ازار پر پیر رکھدیا؛ جبلہ نے غضبناک ہو کر اس کے مُنہ پر ایک طمانچہ مارا اور وہ شخص عمر رضؓ کے پاس فریادی ہوا؛ تو عمر رضؓ نے جبلہ کو سزا شرعی سے معاف نہ فرمایا؛ بلکہ اُسے بلوا بھیجا اور جب وہ آیا تو اس سے پوچھا کہ یہ فزاری کیا شکایت کرتا ہے؟ جبلہ نے کہا بیشک؛ اے امیر المؤمنین! اس شخص نے میری ازار گرا دینے کا قصد کیا تھا اور میں صرف حرمتِ کعبہ کی وجہ سے تھپیڑ مار کر رہ گیا؛ ورنہ اس کے منہ پر تلوار مارتا؛ اس کے جواب میں عمر رضؓ نے فرمایا کہ "اب اور رقت ہوئی کہ تو نے خود گناہ کا اقرار کر لیا؛ لہٰذا یا تو اس آدمی کو رضامند کرے یا میں اس کو تجھ سے بدلہ دلاؤں گا اور اُسے حکم دوں گا کہ جس طرح تو نے تھپیڑ مارا تھا وہ بھی تجھے مارے؛ جبلہ نے کہا؛ یا امیر المؤمنین یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ وہ ایک معمولی آدمی ہے اور میں بادشاہ ہوں؛ عمر رضؓ نے فرمایا اسلام نے تم دونوں کو ایک کر دیا ہے، تم اس پر سوا پرہیزگاری اور نیک مزاجی کی عمدہ صفات حاصل کرنے کے اور کسی طرح فضیلت نہیں پا سکتے؛ جبلہ کو عمر رضؓ کے حکم سے بچنے کی سوا اسکے کوئی صورت نظر آئی کہ کہیں بھاگ جائے۔

لہٰذا وہ رات کے وقت قسطنطنیہ کو بھاگ گیا اور پھر کبھی ملک عرب کا رُخ نہ کیا۔

قبطی کا واقعہ ایسی ہی اس قبطی کی حکایت ہے جسے عمرو بن العاص کے بیٹے نے بگیناہ مارا تھا۔ اور وہ مدینہ جاکر حضرت عمرؓ کے حضور میں فریادی ہوا، عمرؓ نے فوراً قاصد بھیجکر امیر عمرو بن العاصؓ اور ان کے بیٹے کو مدینہ طلب کیا، جس وقت عمرو بن العاص معہ اپنے بیٹے کے حاضر دربار خلافت ہوئے: خلیفہ ممدوح نے مظلوم قبطی کو ایک کوڑا دے کر حکم دیا کہ عمرو بن العاص کے فرزند کو مارے: قبطی نے اس لڑکے کو کوڑا جما کر یہ قصد کیا کہ اس کے باپ امیر عمرو بن العاصؓ پر بھی ہاتھ ڈالے کہ امیر مذکور بول اُٹھے: "مجھے تو صرف میرے بیٹے نے مارا تھا: جو اپنی سزا کو پہنچگیا: اب مجھ پر کیوں بے وجہ عتاب ہے"! اس کے جواب میں خلیفہ نے قبطی کو روک دیا: اور امیر مذکور سے فرمایا "اے عمرو تونے لوگوں کو غلام کب سے بنانا شروع کر دیا ہے: وہ تو اپنی ماں کے حکم سے آزاد پیدا ہوئے تھے:"

ان بہترین اور شریف ترین عادات کا جو اثر فتوحات کے بسرعت بڑھنے میں ہو سکتا ہے، وہ اہل دانش سے مخفی نہیں رہ سکتا، کیونکہ شام، عراق، اور مصر کے رہنے والے اپنے حکام کے ظلم و ستم اور ان کے ذلیل برتاؤ سے تنگ آ رہے تھے جو ان کو سخت حقیر اور خوار سمجھتے تھے، جب انھیں معلوم ہوا کہ مسلمان فاتح سراپا عدل و رحم ہیں تو بدل و جان ان کی جانب متوجہ ہو گئے اور ان کے دوستدار بن گئے۔

لوگوں کو اپنی اصلی حالت پر رہنے دینا (۱۱) عربوں کا قاعدہ تھا کہ جب کسی شہر اور ملک کو فتح کرتے وہاں کے رہنے والوں کو بدستور سابق اُنھیں کے طور و طریق اور حالتوں پر رہنے دیتے، ان کے مذہب میں معاملات میں اور ان کی تمدنی و انتظامی وغیرہ حالتوں سے کوئی تعرض نہ کرتے تھے: جبکہ عمرو بن العاصؓ نے مصر کو فتح کیا ہے تو انھوں نے وہاں بھی ایسا ہی برتاؤ کیا یعنی قبطیوں کی حکومت اور انتظامی حالت خود انھیں کے ہاتھوں میں رہنے دی: حتےٰ کہ قبطی لوگ اپنے ہی گروہ میں سے اپنا قاضی بھی مقرر کرتے جو ان کے معاملات کا فیصلہ کرتا تھا اور بہت سے مفتوحہ ممالک میں اہل عرب کا یہی طرز عمل رہا۔

جان و مال کی حفاظت گو کہ بظاہر ان کی فتح ایک قسم کی حاکمانہ مداخلت ہوتی تھی جس سے رعایا کے طور و طریق پر کوئی اثر نہیں پہنچ سکتا تھا

اور آگے چلکر جو اُمور بیان ہوں گے اُن سے اس بات کا اور بھی صاف صاف انکشاف ہوجائے گا اور اہل عرب جزیہ کے نام سے جو رقم وصول کیا کرتے تھے، یہ گویا ان کی حفاظت جان و مال کا معاوضہ ہوتا تھا، خود رومی لوگوں کو غسانی وغیرہ قبائل کے عربوں کو جو ملکِ شام کی حد میں رہتے تھے اس قسم کی مالی امداد دیتے رہنے کی عادت تھی تاکہ وہ ان کے مددگار رہیں، اور اہل فارس کے مقابلہ میں اُن کے ساتھ جنگ کریں، جس طرح کہ عراق کے رہنے والے عربوں کو اہل فارس زرِ نقد اور دیگر انعامات دے دے کر انھیں رومیوں کی جنگ میں اپنا بازو بنائے رکھتے تھے، علاوہ بریں جتنی بڑی سلطنتیں ہیں وہ سب اپنے ممالک کے قریب رہنے والی وحشی اور جنگجو قوموں کو اس قسم کا عطیہ دیتے رہنے کے عادی ہیں۔ دولتِ عثمانیہ بھی ایسا ہی کرتی ہے اور آج کل اس عطیہ کا نام "خوۃ" رکھا جاتا ہے، لیکن اہلِ عرب نے اپنی مفتوح قوموں پر ادائے مال کے ساتھ ہی "حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون" کی نص پر عمل کرنے کے لحاظ سے اطاعت و فروتنی کا اظہار بھی مشروط کر دیا تھا، اور گو ان سے اپنی اطاعت منواتے تھے، تاہم لوگ جزیہ دیا کرتے تھے، یہ ان کی حفاظت اور خبر گیری کا اقرار کر لیتے تھے، اور اس کے ذمہ دار ہو جاتے تھے کہ انھیں کسی قسم کا مالی یا جانی نقصان بیرونی دشمنوں کے ہاتھوں نہ پہنچنے دیں گے، اس بات کو دیکھ کر گمان غالب یہی ہوتا ہے کہ اس حمایت سے ملک کے اصلی باشندوں کا ان کے حکام رومیوں کی دسترس سے بچائے رکھنا مراد ہوتا تھا۔ اس لئے کہ اہلِ ملک دل سے تو رومیوں کی اطاعت سے خارج ہونے کے خواہاں تھے، لیکن ان کے زور قوت سے ڈرتے بھی تھے،

مصر کے حاکم سے گفتگو

عبادۃ بن الصامتؓ نے مقوقس مصر کے حکمراں سے جو گفتگو کی، اُس سے بھی امر مذکورہ بالا بخوبی واضح ہوتا ہے، انھوں نے مقوقس اور تمام مصر کے رہنے والوں سے مخاطب ہو کر یوں کہا تھا، لیکن اگر تم اسلام کو قبول نہیں کرتے اور نہ لڑنا چاہتے ہو تو جزیہ ادا کرو اور عاجزی کے ساتھ ہمارے مطیع بنو۔ اور جس قدر رقم پر ہم تم راضی ہو جائیں وہ تم ہر سال ہمیں دیا کرو جبتک کہ ہم اور تم باقی رہیں، ہم تمھارے ان دشمنوں سے لڑیں گے جو تم کو ایذا دینے پر آمادہ ہوں، یا تمھاری زمینوں، مالوں، اور جانوں کو تلف کرنا چاہیں، اگر تم ہماری ذمہ داری میں رہو گے تو ہم

تمھاری طرف سے حفاظت جان ومال کی خدمت ادا کریں گے اور اس امر کا تم کو قول دیں گے ۔۔۔ الخ
اسی مضمون کے اقرار نامے اور خطوط ذمی لوگوں کو اہل اسلام لکھدیتے تھے جو کثرت پائے جاتے ہیں؛
اور خالد بن الولید رضی نے ملک عراق میں ابن نسطونا کے نام جو تحریر لکھی تھی اس کا مضمون بھی اسی قسم کا ہے؛

جزیہ کی واپسی

ہمارے اس بیان کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو مسلمانوں اور شہر حمص کے رہنے والوں پیش آیا تھا؛ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو یرموک کے میدان میں اکٹھے ہونے کی ضرورت پیش آئی اس وقت شہر حمص ان کی ذمہ داری میں تھا مسلمانوں نے جس قدر جزیہ کی رقم حمص والوں سے وصول کی تھی وہ سب انھیں واپس کردی اور ان سے کہا "اب ہم ایک جہم میں مبتلا ہونے کے باعث تمھاری امداد اور حفاظت کا کام انجام نہیں دے سکتے - لہذا تمھیں اختیار ہے کہ جو چاہو اپنے بچاؤ کا سامان کرلو" اس کے جواب میں حمص والوں نے کہا؛ "تمھاری حکمرانی اور تمھارا انصاف ہمیں بہ نسبت اس ظلم وستم کے جس میں ہم اب سے پہلے مبتلا تھے ، صدہا درجہ بڑھکر پسند ہے ؛ ہم تمھارے عامل کے ساتھ مل کر شہر (حمص) کو افواج ہرقل کی دسترس سے بچائیں گے اور اس کی حفاظت کریں گے" نیز مسلمان لوگ اکثر ایسی حالتوں میں غیر مسلم قوموں کو جزیہ سے معاف بھی کردیتے تھے جبکہ وہ ان کے ساتھ ہوکر لڑنے کا اقرار کرتی تھیں؛ اور بہ صورت نصرانی عربوں کے ساتھ اکثر واقع ہوئی ہے ؛ لیکن کچھ اسی پر منحصر نہیں بلکہ کئی بار عربوں کے علاوہ اور قوموں سے بھی اس قسم کا معاملہ ہوا؛ جیسے جراجمہ وغیرہ سے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ؛ اس لئے مسلمانوں کا تسلط لوگوں پر گراں نہیں گزرتا تھا، بلکہ ملک کے باشندے اکثر حالتوں میں ان کو اپنے اصلی حاکموں (رومیوں یا فارسیوں) سے افضل سمجھتے تھے، اور جزیہ کی رقم جو انھیں مسلمانوں کو نذر کرنی پڑتی تھی؛ ان تمام لگانوں اور ٹیکسوں سے جو وہ لوگ رومیوں اور فارسیوں کو دیا کرتے تھے - کہیں کم تھی ؛

خلاصہ

حاصل کلام یہ ہے مسلمانوں کی فتح کی جرأت اور اس میں امداد صرف ان کے مذہبی ولولہ نے ملائی اور اپنی فہمندی پر ان کے سچے دلی اعتقاد نے جس کے ساتھ ہی ان کی شاہ سواری اور تیر اندازی کی مہارت، جسمانی قوت، جنگلی زندگی بسر کرتے رہنے سے مستعدی کی عادت، لڑائی کو طول دینے کا ڈھنگ، اور ان کی قوم میں اہل الرائے اور شجاع

ازدیاد کا پیدا ہونا بھی شریک تھا؛ اور ان سب پر طرہ اِن کی انصاف پسندی اور داد گستری اور مہربانی تھی جو وہ مفتوح رعایا کے ساتھ برتتے تھے؛ اور رومی اور فارسیوں کی کمزوری کی حالت بھی ان کی معین بن گئی جس کے سبب سے دس برس سے کچھ ہی زائد عرصہ میں اُنھوں نے شام فلسطین مصر عراق، اور فارس کی سلطنتوں پر قبضہ کر لیا؛ اور عمر بن الخطاب رضی کے عہد میں ان تمام مقامات پر ان کا کامل تسلط ہو گیا اور اس کے بعد عثمان بن عفان اور ان کے جانشین خلفا کے زمانہ حکومت میں بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا؛

خلفائے راشدین کے باقی حالات

فتنہ عثمان رضی کے زمانہ میں اس فساد کا بیج پڑا جو ان کے قتل ہونے کے ساتھ ۳۵ھ میں برپا ہوا اور اُسی وقت سے اسلامی تاریخ کا رنگ بدل گیا؛ اس فتنہ کا سبب یہ تھا کہ جس وقت ۲۳ھ میں عمر رضی کو ابولولو مجوسی نے زہر میں بجھے ہوئے خنجر سے زخمی کیا اور انھیں اپنی زندگی کا خاتمہ ہوتا محسوس ہوا تو اُنھوں نے اصحاب نبی میں سے چند لوگوں کو جنمیں عثمان رضی بن عفان، طلحہ رضی بن عبید اللہ، زبیر رضی بن العوام اور علی رضی بن ابی طالب بھی شامل تھے، اپنا جانشیں ہونے کے لئے نامزد کر کے یہ وصیت کی کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے گھر میں جمع ہو کر اپنے میں سے ایک شخص کو کثرت رائے سے منتخب کر لیں جو میرے بعد خلافت کا کاروبار سنبھالے ان لوگوں نے جمع ہو کر عثمان بن عفان کو منتخب کیا جو بنی اُمیہ کے کنبہ میں سے تھے اور ان سب لوگوں میں باعتبار عمر کے بڑے بھی تھے؛

یوں تو بنو اُمیہ تمام قریش کے گھرانوں میں قوت و جمعیت کے لحاظ سے بڑھے ہوئے تھے؛ لیکن ان میں سے بہتیرے لوگ مکہ کے فتح ہو چکنے اور اپنے سرگروہ ابوسفیان رضی کے مسلمان ہو جانے کے بعد اسلام لائے تھے، اس لیے ان لڑائیوں میں جن سے سلطنت اسلامی کے رکن قائم ہوئے؛ ان کی کوششوں کا کوئی حصہ شامل نہ تھا، ابوبکر رضی مسند نشین خلافت

ہوئے تو انھوں نے بھی ان لوگوں کو عامل مقرر نہ کیا اور شاید اس بات کا باعث ابوبکر کا ان لوگوں نے اسلام کی سچائی پر وثوق نہ کرنا رہا کیونکہ ان لوگوں کو اسلام لاتے ہوئے بہت تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا۔ یا اس لئے کہ یہ لوگ قبولِ اسلام سے کوئی مفر نہ رہنے پر مجبوری کی حالت میں مسلمان بنے ہوئے تھے، بنو اُمیہ نے ابوبکر رضؓ سے اس بات کا مطالبہ بھی کیا کہ ہمیں افسری اور عہدے کیوں نہیں دیئے جاتے؟ جسکے جواب میں انھوں نے صرف اتنی بات کہی کہ "بیٹنے اور بھائیوں کی سی کارگذاریاں جہاد میں دکھاؤ"، اور یہ کہکر انھیں مرتد لوگوں کے مقابلہ میں لڑنے کیلئے روانہ کر دیا، اس واقعہ کے بعد عمرؓ نے انہیں اپنے عہد میں ملک شام کی لڑائیوں پر بھیجا، باوجود اس بات کے بنو اُمیہ ہمیشہ یہی خیال کرتے رہے کہ حکومت اور امارت کے لئے قریش کے تمام گھرانوں میں وہی بہتر ہیں۔ اسلئے کہ وہ بنو ہاشم سے مرتبہ میں معزز اور تعداد میں زیادہ ہیں اور لڑائیوں میں فوجی افسری انھیں کا حق تھا جیسا کہ زمانہ جہالت کے باب میں بیان ہو چکا ہے۔ اور ابی طالب کے وفات پا جانے کے بعد جو نبی صلعم کے چچا تھے، بنو اُمیہ کا اثر و اقتدار بھی اور بڑھ گیا تھا۔ علاوہ ان تمام باتوں کے ہاشمیوں اور اُمویوں کے مابین زمانہ جاہلیت ہی سے مسلسل ایک قسم کی چشمک بھی چلی آتی تھی۔

حضرت عثمان کی مخالفت

عثمانؓ مسند آرائے خلافت ہوئے تو ان کی وجہ سے بنو امیہ کی عزت میں نشوونما ہوا، یوں تو عثمان بہت نیک مزاج اور صاف باطن بزرگ تھے، لیکن اپنے اقربا کا بہت خیال رکھتے تھے اور کنبہ پروری کی جانب مائل رہتے تھے۔ عثمان خلافت ہاتھ میں آتے ہی انھوں نے اپنے رشتہ داروں کو ملکوں پر عامل بنانا شروع کر دیا اور حکومت سے متعلق ان کو ذمہ داری کی خدمتیں سپرد کرنے لگے جو صحابہ کہ اگلے وقتوں سے ان خدمتوں کے مستحق رہتے چلے آتے تھے، انھیں یہ امر ناگوار گزرا، اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب پیدا ہو گئے جن کے بیان کرنے میں طول فضول ہوگا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام بڑے بڑے شہروں کے باشندے عثمانؓ سے ناخوش اور ان کے دشمن بن گئے، ان کی کئی جماعتیں جن میں مصر، کوفہ، اور بصرے کے رہنے والے شریک تھے، مدینہ میں آئے اور انھوں نے عثمان پر دباؤ ڈالا کہ وہ عہدۂ خلافت سے علیحدہ ہو جائیں، خلیفہ ممدوح نے ان کی بات دشمنی تو ان لوگوں نے آپ کو قرآن کی تلاوت

کرتے میں شہید کر ڈالا؛ اور ان کا وہ کرتہ جو وہ شہادت کے وقت پہنے ہوئے تھے؛ خون میں تر بتر ہو گیا؛ اگرچہ اُن قاتلوں کے اس فعل میں اس اعتبار سے کتنی ہی لغویت کیوں نہ پائی جاتی ہو کہ انھوں نے آداب خلافت کو نظرانداز کر کے خلیفہ کی آبرو ریزی کی؛ مگر اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ یہ واقعہ اہلِ عرب کی خودداری؛ آزاد مزاجی، اور بلند ہمتی کی ایک واضح دلیل ہے؛

خلافت کے بارے میں اختلاف

عثمان شہید ہو چکے تو اب لوگوں میں یہ اختلاف پیدا ہوا کہ ان کا جانشین کون شخص ہو؟ مصر کے رہنے والے حضرت علی رضؓ کی خلافت چاہتے تھے؛ اور بصرے والے طلحہ رضؓ کی اور کوفہ کے باشندے زبیر بن العوامؓ کو خلیفہ بنانے کے متمنی تھے؛ اور یہ تینوں صاحب اور اصحاب کے مقابلے میں خلافت کے بہت زیادہ آرزومند تھے؛ ملک شام کے اکثر مسلمان بنو اُمیہ سے تھے؛ اور ان کے نزدیک خلافت عثمان رضؓ کے ہاتھوں میں رہنی بہتر تھی یا ان کے بعد اپنے ہی خاندان کا کوئی شخص ان کا جانشین بنانا چاہتے تھے؛ باقی رہے خاص مدینے کے لوگ ان کی مرضی بھی یہی تھی کہ علی رضؓ خلیفہ مقرر ہوں کیونکہ جس زمانہ سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی جانب ہجرت کی تھی۔ یہ لوگ برابر اہلبیت نبوی کے خیر طلب اور مددگار رہتے آئے تھے؛ اور اس وقت بھی اپنے اسی خیال پر قائم تھے؛ پھر علیؓ کی جنبہ داری کے معاملہ میں قوم ربیعہ اور ملکِ یمن کے لوگ بھی مدینہ والوں سے مل گئے تھے اس لئے اگرچہ تمام گروہوں کے مقابلہ میں علی رضؓ کے ہوا خواہوں کی تعداد کئی گنا زیادہ تھی؛ تاہم اتنی خرابی تھی کہ وہ سب لوگ مختلف قبائل اور ممالک کے ہونیکی وجہ سے بمشکل ایک خیال پر قائم رہ سکتے تھے؛ اور یہ بات ضرور تھی کہ وہ مستقل خیال رکھیں؛ سب سے زیادہ تعداد مدینہ والوں کی تھی جو سوا علی رضؓ کے کسی کو خلیفہ نہیں بنانا چاہتے تھے؛ مکہ اور مدینہ کے رہنے والوں میں یوں تو قدیم زمانہ سے چشمک چلی ہی آتی تھی؛ لیکن اسلام کے بعد اس کی بنیاد اور بھی مستحکم ہو گئی؛ کیونکہ ہجرت کے بعد جبکہ مدینہ والوں نے مسلمانوں کی مدد کی اور مسلمانوں کی حالت درست ہو گئی تو انھوں نے مکہ پر فوج کشی کر کے اُسے فتح کر لیا؛ اور مدینہ مسلمانوں کا پایۂ تخت بنا؛ تجارت کا رخ مکّہ سے پھر کر مدینہ کی جانب ہو گیا؛ اور اہلِ مدینہ کا اثر اور اقتدار روز بروز ترقی پذیر ہونے لگا؛ ان اسباب سے مکہ والے اور بھی خار کھانے لگے

تھے، لہذا جبکہ مدینہ کے باشندوں نے علی سے بیعت کرلی تو طلحہ اور زبیر نے بھی چار و ناچار اُن سے بیعت کی، لیکن دل میں اس بات سے ناخوش رہے۔ اس کے بعد یہ دونوں صاحب مکہ کو چلے گئے اور مکہ کے لوگوں نے ان دونوں کی امداد کی، اور بعدازاں یہ دونوں عراق کو گئے تاکہ وہاں اپنے ہواخواہوں کے جتھے سے مل کر اور بھی عزت و اقتدار بڑھا سکیں۔ علی بھی ان دونوں کے معاملہ سے غافل نہ تھے۔ وہ اپنی فوجوں کو ساتھ لے کر ان کے تعاقب میں چلے۔ اور بصرہ کے قریب یہ "جمل" کی مشہور لڑائی ان کی فوجوں میں واقع ہوئی جس میں طلحہؓ اور زبیرؓ دونوں شہید ہوگئے۔ اور خلافت کا منصب بلاغل وغش حضرت علیؓ کے قبضہ میں آگیا۔ انھوں نے اسلامی پایہ تخت کو مدینہ سے منتقل کر کے کوفہ میں قائم کیا۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا کہ علیؓ نے اپنے مدنی ہواخواہوں کو چھوڑ کر اہل عراق پر اعتماد کرنے میں بڑی سخت غلطی کی جس کا نتیجہ اُن کے حق میں برا نکلا۔

حضرت معاویہ اور خلافت

علیؓ نے اب خیال کرلیا کہ خلافت کا میدان انھیں کے ہاتھ رہا اور کوئی ان کے مقابل میں دعویدار خلافت پیدا نہیں ہوسکتا۔ لیکن انھیں یہ خبر نہ تھی کہ ملک شام میں ایک بڑا ذی اثر شخص موجود ہے۔ جو اپنی ذات کے لئے لوگوں سے بیعت کی آرزو رکھتا اور خلافت کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتا ہے۔ اس شخص سے ہماری مراد امیر معاویہ ابی سفیانؓ کے بیٹے ہیں۔ یہ امر پہلے ہی معلوم ہوچکا ہے کہ ابوسفیان اور ان کی اولاد نے محض مجبوری کے عالم میں جبکہ انھیں اپنی کامیابی سے ناامیدی ہوگئی تھی۔ مذہب اسلام قبول کیا تھا۔ اس لئے معاویہ کو خلافت کی آرزو محض دنیاوی اغراض کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ جس وقت حضرت عثمانؓ شہید کئے گئے ہیں معاویہ ملک شام میں امیر تھے۔ اور قریش کے بہت سے چیدہ چیدہ سرداران کے پاس جمع تھے جو ان کے خوش کرنے کے لئے شریک تھے اور رجان و دل سے ان کی امداد پر تیار، کیونکہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ قریش کی برادری میں بنوامیہ کی قوت اور تعداد زمانہ جاہلیت ہی سے بہت بڑھی ہوئی تھی اور راغراض نفسانی کی وجہ سے منصب نبوت کا بنو ہاشم کے خاندان میں جانا انھیں بہت شاق گذر رہا تھا، اس لئے کہ وہ اور بھی اندرونی عداوت رکھتے تھے۔ جس زمانہ میں مسلمانوں نے مکہ سے ہجرت کی اور بنو ہاشم جو بنوامیہ

کے حریف تھے، قریب قریب مکہ سے نکل ہی گئے؛ پھر تو ریاست و امارت کا میدان بنو امیہ
کے لئے خالی رہ گیا؛ مسلمانوں سے جو لڑائیاں ہوئیں ان سبھوں میں عام فوجی افسری بنو امیہ
کے ہاتھوں میں رہنے لگی؛ "اُحد" اور "بدر" وغیرہ کی مشہور لڑائیوں میں معاویہؓ کے والد ابو
سفیان ہی فوج کفار کے افسر ہوتے رہے، اس کے بعد جب یہ لوگ مذہب اسلام میں داخل
ہو چکے اور ابوبکرؓ کی خلافت کا زمانہ آیا تو خلیفہ ممدوح نے ان لوگوں کو جہاد میں بھیجنا
شروع کیا اور رفتہ رفتہ کارگذاریاں دکھانے پر بنو امیہ میں سے ابوسفیان کے بڑے
بیٹے یزید ملک شام کے حاکم بھی مقرر ہو گئے؛ جن کے فوت ہو جانے کے بعد عمرؓ کے
ایام خلافت میں ان کے دوسرے بھائی معاویہ بن ابی سفیان ان کے قائم مقام مقرر
ہوئے اور امیر شام کا معزز عہدہ انھیں حاصل ہوا۔ عثمانؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو انھوں نے بھی معاویہ کو شام
کی امارت پر قائم رکھا؛ امیر معاویہ کی فوجی قوت کا زیادہ تر حصہ قبیلہ قریش ہی کے لوگوں اور خصوصاً
اپنے ہی کنبہ والوں کا جتھا تھا؛ اس طریقہ پر بنو امیہ کے خاندان کی، خصوصاً ابوسفیان کے گھرانے کی حکومت
اسلام کے ابتدائی دور میں بھی قریش پر ویسی ہی مسلسل جمی رہی جیسی کہ اسلام سے قبل تھی! ور بنو ہاشم
نبوت کے کاروبار میں مصروف ہو کر دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کر بیٹھے۔

جنگ صفین عثمانؓ شہید ہو گئے تو معاویہؓ کو خلافت کو حاصل کرنے کا ایک وسیلہ
ہاتھ آ گیا، انھوں نے خلیفہ ممدوح کا خون آلود کرتہ دمشق کی جامع
مسجد میں لوگوں کو دکھا کر انھیں مقتول خلیفہ کا بدلہ لینے پر ابھارا، کیونکہ وہ خود ان کے
عزیزوں میں سے تھے؛ اور علیؓ اور ان کے ساتھیوں پر عثمانؓ کے قتل کی تہمت لگائی،
معاویہؓ نے اس کارروائی کے بعد دیکھا کہ ملک عراق میں علیؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ سے جنگ
چھڑ گئی ہے؛ لہذا انھوں نے اس خیال سے کہ یہی دونوں علیؓ سے بنٹ لیں گے؛
بے مجھے جنگ کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی؛ اپنی متذکرہ بالا کارروائی چند روز تک
ملتوی رکھی؛ مگر جبکہ طلحہ و زبیر دونوں قتل کئے گئے اور علیؓ کامیاب ہوئے تو معاویہؓ
نے عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے پر پھر مستعدی دکھائی اور اس امر کے متعلق افواج
عرب کے ایسے اعلےٰ درجہ کے چالباز لوگوں سے امداد لی؛ جو مذہب اسلام کو اسی نظر سے

دیکھتے تھے، جس سے کہ دنیا کے اور کاروبار کو دیکھا کرتے تھے۔ انہیں پالیٹین لوگوں میں سے ایک شخص عمرو بن العاص بھی تھے جن کو عثمانؓ نے مصر کی حکومت سے علیحدہ کر دیا تھا، مگر معاویہؓ نے ان کو اپنا مقرب بنایا اور ان سے وعدہ کیا کہ اپنی کامیابی کی حالت میں تمھیں مصر کا حاکم مقرر کر دوں گا غرضیکہ معاویہؓ نے کیل کانٹے سے درست ہو کر اور عمرو بن العاصؓ کو ساتھ لاکر "صفین" کی مشہور جنگ میں علیؓ کا مقابلہ کیا۔ یہ لڑائی ۳۷ھ میں ہوئی تھی اور قریب تھا کہ علیؓ کے طرفدار فتحمند ہو جائیں اور معاویہؓ کو شکست اٹھا کر ہمیشہ کے لئے اپنے دعاوی سے بالآخر دست بردار ہونا پڑے کہ عین اس حالت میں جبکہ خوب گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی عمرو بن العاصؓ نے ایک ایسی چال چلی جس نے خلافت کو اہلبیت نبوی سے نکالکر بنو امیہ کے قبضہ میں کر دیا؛ وہ حیلہ یہ تھا کہ عمرو بن العاص نے لڑائی کا رنگ بگڑتا دیکھکر اور معاویہؓ کی فوج کو مغلوب ہوتا پاکر انھیں حکم دیا کہ...... قرآنوں کو نیزوں کی انیوں میں لٹکا کر بلند کریں اور اس طرح پر کچھ کہنے سننے کے لئے لڑائی کو روکنے کا اشارہ کریں؛ علیؓ کے ساتھی اس کارروائی سے دھوکا کھا گئے۔ اور ہرچند علیؓ نے سمجھایا کہ یہ دشمن کا فریب ہے اب میدان تمھارے ہاتھ آتا دیکھا ہے تو جنگ کے التوا اور گفتگو کی مہلت پانے کی درخواست کر رہا ہے؛ تھوڑی دیر کے لئے اس طرف خیال نہ کرو؛ مگر انھوں نے نہ مانا اور نہایت اصرار کے ساتھ علیؓ کو جنگ بند کر دینے پر مجبور کر دیا؛ جسے بالآخر انھوں نے مان لیا۔

پنچوں کا تقرر

جنگ بند ہو گئی اور باہم گفتگو ہو کر یہ قرار پایا کہ دونوں صاحب پنچ مقرر کریں۔ اور پنچایت ہو؛ پھر پنچ لوگ جو فیصلہ کر دیں گے اُسے دونوں گروہ خوشی سے مان لیں گے؛ دونوں فریقوں نے ایک ایک شخص کو اپنی جانب سے حکم مقرر کیا؛ جن میں سے ایک شخص عمرو بن العاص تھے۔ جو معاویہؓ کی جانب سے منتخب ہوئے تھے، اور علیؓ کے ساتھیوں نے ابو موسیٰ اشعری کو منتخب کیا؛ حالانکہ عمرو بن العاصؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ میں فطانت اور ذکاوت کے لحاظ سے آسمان و زمین کا فرق تھا، ابو موسیٰ ایک سیدھے سادھے مرد خداپرست تھے؛ اور عمرو بن نہایت چالاک معاملہ فہم اور دور اندیش، غرضیکہ دونوں فریق اس امر پر راضی ہوئے کہ یہ دونوں صاحب

جو کچھ فیصلہ کر دیں گے وہ سب کو منظور و قبول ہوگا؛ اور اس کے بعد پنچوں کے حکم سنانے کا ایک دن مقرر ہوگیا؛ عمرو بن العاص رض نے ابوموسیٰ کو ایسی پٹی دی کہ ان کی عقل بالکل اپنے قابو میں کرلی۔ انہوں نے ابوموسیٰ سے یہ ظاہر کیا کہ وہ معاویہ رض اور علی رض دونوں کو خلافت علیحدہ کردینے کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ اس کے بعد مسلمان لوگ اپنی پسند کے مطابق کوئی ایک خلیفہ منتخب کرلیں جو ان دونوں کے علاوہ ہو؛ نیک دل ابوموسیٰ کو اس مفید مشورہ کے قبول کرنے میں کوئی قباحت معلوم نہ ہوئی اور وہ راضی ہوگئے؛ مگر عمرو بن العاص کو اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لئے ابھی ایک اور ترکیب چلنی باقی تھی جو انھوں نے یوں پوری کرلی؛ کہ ابوموسیٰ رض کو اپنے سے زیادہ مرتبہ والا اور عمر میں بڑا ہونے کی حیثیت سے قابل تعظیم جتا کر اُن سے کہا کہ پہلے آپ جو کچھ کہنا ہے کہدیں تو پھر میں بھی اپنا خیال ظاہر کردوں گا؛ ابوموسیٰ رض دھوکا کھا کر کھڑے ہوگئے اور انھوں نے باآواز بلند کہا۔

"لوگو! ہم نے اس اُمّت کے بارے میں بہت کچھ غور کیا مگر ہم کو اس کی بہتری اور فلاح کے لئے اس ایک بات سے بڑھ کر اور کوئی بات معلوم نہ ہوسکی؛ جس پر میری اور عمرو بن العاص رض دونوں کی رائے متفق ہوگئی ہے؛ وہ تجویز یہ ہے کہ ہم علی رض اور معاویہ رض دونوں کو معزول کردیں اور مسلمانوں کو اختیار دیں کہ ان کی علیحدگی کے بعد وہ جسے چاہیں اپنا حاکم بنالیں لہٰذا تم لوگ بخوبی سن لو کہ میں نے علی رض کو عہدۂ خلافت سے علیحدہ کردیا ہے؛ تم اپنا کام خود سنبھالو، اور جسے خلافت کے لائق پاؤ اپنا حاکم بنالو؛ ابوموسیٰ اس قدر کہکر بیٹھ گئے تو عمرو بن العاص رض اُٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنی مجوزہ ترکیب حسب ذیل گفتگو کے ساتھ مکمل کردی؛

حضرت عمرو بن العاص کا فیصلہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ انھوں (ابوموسیٰ کی جانب اشارہ کرکے) نے کہا وہ تم سب لوگ سن چکے ہو، انھوں نے اپنے ساتھی (علی رض) کو خلافت سے علیحدہ کیا ہے۔ اور میں بھی ان کو اس عہدہ سے ویسا ہی برطرف کرتا ہوں جیسا کہ خود ان کے حکم (پنچ) نے کیا ہے اور میں اپنے دوست معاویہ رض کو خلافت پر قائم کرتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ عثمان رض کے ولی اور ان کے خون کا معاوضہ چاہنے والے ہیں؛ اور تمام لوگوں سے بڑھکر ان کا مرتبہ پانے کے حق دار ہیں؛

خوارج کا ظہور

جس وقت لوگوں نے یہ گفت گو سنی تو انھیں یقین کُلّی ہو گیا کہ دراصل یہ کارروائی سراسر فریب تھی۔ اور اب اس کا جادو چل گیا ہے، ہم نے غلطی کی کہ اس حیلہ میں پھنس گئے، کاش اس کارروائی کا اثر اگر صرف اسی قدر ہوتا کہ معاویہؓ خلیفہ مقرر ہو جاتے تو بھی کوئی مشکل پیش نہ آتی؛ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس بات نے خود علیؓ کے لوگوں کو دو حصّوں میں منقسم کر دیا؛ ان میں سے کچھ لوگوں نے تو علیؓ کو پنچایت کے قبول کرنے پر ملامت کی اور ناراض ہو کر ان کے حکم سے نکل گئے، جن کا نام "خوارج" ہوا۔ اس طریقہ پر علیؓ دو دشمنوں کے درمیان گھر گئے؛ (۱) امیر معاویہؓ مدّعیٔ خلافت؛ (۲) خود ان کے ناہنجار ساتھی خارجی لوگ، اور یہ دوسرا فرقہ ان کے لئے بہت سخت خطرناک ثابت ہوا؛ اس لئے کہ انھیں لوگوں میں سے ایک نامرد کے ناگہانی تلوار کا وار کرنے سے وہ شہید بھی ہو گئے؛ یہ واقعہ ۴۰ھ میں کوفہ کی مسجد میں ہوا؛

خلافت سے دست برداری

علیؓ کی شہادت کے بعد ان کے مطیع اور فرماں بردار لوگوں نے ان کے بڑے بیٹے امام حسنؓ سے بیعت کی اور معاویہؓ اس وقت تک برابر اپنے لئے خلافت کا مطالبہ کر رہے تھے؛ حسنؓ نے دیکھا کہ وہ خود معاویہؓ سے جنگ نہیں کر سکتے اور ان کی قوت نہیں توڑ سکتے۔ لہٰذا وہ خونریزی سے بچنے کے لئے منصبِ خلافت سے کنارہ کش ہو گئے، اور برضا و رغبت معاویہؓ کو خلیفہ تسلیم کر لیا؛ اس کے بعد معاویہؓ نے ملک شام میں خلافت کی بیعت کی اور اب دارالخلافت کوفہ سے اُٹھ کر دمشق میں منتقل ہو گیا؛ اور حسنؓ کا خلافت سے دست کش ہونا خلفائے راشدین کی خلافت کا خاتمہ تھا؛

خلفائے راشدین کا زمانہ

حالاتِ مندرجہ بالا سے صاف صاف عیاں ہو رہا ہے کہ خلفائے راشدین کی حکومت خدا ترسی پر قائم ہوئی اور انصاف و عدل کے ساتھ مستحکم؛ اس کے حکمران خلفاء بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے؛ ان کے وقتوں میں خلافت کا طرز دینی رتبوں سے ملتا جلتا تھا؛ حکومت دنیاوی سے ان کو کوئی مناسبت نہ تھی؛ ان خلفائے راشدین (رضوان اللہ علیہم اجمعین)

میں سے ہر شخص موٹے جھوٹے کپڑے کا لباس پہنتا تھا؛ ان کے پیروں میں دو کھجور کی چھالوں کی بنی ہوئی نعلین ہوتی تھیں ان کی تلوار کا پرتلا بھی کھجور کی چھال کی رسیوں سے بنا ہوتا تھا؛ وہ خلیفہ بازاروں میں اسی طرح چلا پھرا کرتے تھے جیسے کوئی عام رعایا کا شخص گھومتا پھرتا ہو اور جس وقت کسی چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے کچھ کہتے تھے، تو جواب میں اپنی بات سے کہیں زیادہ سخت گفتگو سنتے تھے؛ وہ پاک طینت لوگ ان تمام باتوں کو دینداری کی قسم سے خیال کرتے تھے؛ اور لوگوں پر خدا ترسی انصاف اور رحمدلی و برتاو کے ساتھ حکمرانی کرتے تھے؛

خلفائے راشدین کی غذا ان کے یہاں کے فقیروں کی غذا سے بھی کم درجہ کی ہوتی تھی وہ لوگ محتاجی یا تنگدستی کی وجہ سے اس قسم کی کمی نہیں کرتے تھے؛ بلکہ ایسا کرنے سے انھیں اپنی غریب رعایا کے ساتھ ہمسری اور ہمدردی کا خیال رہتا تھا؛ علی بن ابی طالبؓ کو ان کی املاک سے بہت بیش قرار آمدنی ہوتی تھی؛ جو وہ سب کی سب فقیروں کو دے ڈالا کرتے تھے، اور اپنا گذارہ اسی قناعت اور صبر کی روش پر کرتے رہتے؛

خلفائے راشدین مال و دولت کی ذرا بھی پروا نہ رکھتے تھے؛ کچھ خلفاء پر ہی موقوف نہیں بلکہ اپنے وقتوں میں تمام اصحاب رسولؐ کا یہی وطیرہ تھا، شاید اس امر کا سبب یہ رہا ہو کہ وہ لوگ نبوت کے زمانہ سے قریب تر تھے؛ اور نبوت کا رعب و داب ان کے دلوں پر بخوبی جما ہوا تھا؛ اور جس قدر نبوت کا زمانہ دور ہوتا گیا رفتہ رفتہ وہ رعب بھی ان کے دلوں سے زائل ہوتا گیا؛ اور وہ دنیا کی طلب پر جھکتے گئے؛

مال و دولت کی کثرت

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے؛ کہ خلفائے راشدین ہی کے آخری عہد میں جاہ و جلال دنیاوی کی چاٹ لوگوں کو پڑ چلی تھی؛ کیونکہ مسعودی نے ذکر کیا ہے کہ عثمانؓ کے زمانہ میں صحابہ نے زمینیں خرید لی تھیں، اور مال جمع کیا تھا، جس دن عثمانؓ شہید ہوئے ہیں ان کے خزانچی کے پاس ایک لاکھ پچاس ہزار دینار اور دس لاکھ درہم نقد موجود تھے، اور وادی القرے اور حنین وغیرہ مقامات میں ان کی اراضیاں تھیں ان کی قیمت کا تخمینہ ایک لاکھ دینار

ہوا تھا، اس کے علاوہ انھوں نے اونٹ اور گھوڑوں کی ایک کثیر تعداد بھی چھوڑی تھی اور زبیرؓ کے ترکہ میں سے صرف ایک ترکہ کی قیمت ان کی وفات کے بعد پچاس ہزار دینار تک پہنچی تھی، اس کے علاوہ ایک ہزار گھوڑے اور ایک ہزار لونڈیاں بھی انھوں نے چھوڑی تھیں۔ اور طلحہؓ کی وہ آمدنی جو صرف عراق سے آتی تھی، روزانہ ہزار دینار کی تھی۔ اس کے علاوہ "سراۃ" کی سمت سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ اس سے بھی بہت کچھ زائد ہوا کرتی تھی؛ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے مربط (جانوروں کے باندھنے کی جگہ طویلہ) میں ہزار گھوڑے بندھتے تھے اور ان کے پاس ایک ہزار اونٹ اور دس ہزار بھیڑ بکریاں تھیں؛ جس وقت انھوں نے وفات پائی ہے تو ان کے ترکہ کا صرف ایک چہارم چوراسی ہزار درم کا قرار پایا تھا؛ زید بن ثابت نے علاوہ اس اس مال ومتاع اور اراضی کے جن کی قیمت ایک لاکھ دینار تھی، سونے اور چاندی کی اینٹیں اپنے ترکہ میں چھوڑی تھیں جو کلہاڑیوں سے کاٹ کاٹ کر ورثا میں تقسیم کی گئیں؛ زبیرؓ نے بصرہ میں مکان بنوایا تھا اور ویسے ہی عظیم الشان مکانات مصر، کوفہ، اور سکندریہ میں بھی تعمیر کرائے تھے، اسی طرح پر طلحہؓ نے کوفہ میں گھر بنوایا تھا، اور مدینہ میں اپنے مکان کو توڑ کر نئے سرے سے پختہ گچ کا تعمیر کرایا جس میں تمام سال لکڑی لگائی گئی تھی؛ سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنا گھر "عقیق" میں بنوایا جو بہت ہی کشادہ اور بلند محل تھا اور اس کے اوپر بہت سے بالاخانہ بھی بنوائے تھے، مقدادؓ نے "مدینہ" میں اپنا مکان اندر اور باہر دونوں طرف سے پلاستر پختہ کرا کے تعمیر کرایا؛ اور یعلیٰؓ بن منبہ نے مرنے کے بعد پچاس ہزار دینار نقد چھوڑے اور اس کے علاوہ مال واسباب اس قدر جس کی قیمت تین لاکھ درم تخمینہ کی گئی تھی۔ (آخر قول تک)۔

خلفائے راشدین کی حکومت قریباً تیس سال رہی جس کے اندر اسلامی فتوحات کو یہاں تک وسعت ہوئی کہ عربی فوجیں مغرب کی سمت میں افریقہ سے لے کر مشرقی جانب میں ملک خراسان کی انتہائی حدود تک پھیل گئیں؛ اور نہر فرات سے اس پار سمرقند تک بڑھ گئیں۔



بنی اُمیّہ کی حکومت

خلفائے راشدین کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ بنی اُمیّہ کے پاس خلافت کیونکر منتقل ہو آئی، جن کا پہلا خلیفہ معاویہ بن ابی سفیان تھا، بنو امیّہ کے زمانہ میں خلافت کو اس طریقہ سے امتیاز حاصل ہوتا ہے کہ وہ ایک قسم کی دنیاوی حکومت ہے۔ جس کا خلیفہ (حکمران) طرح طرح کے حیلۂ فن اور تدبیر ملک داری کے ساتھ اُسے مضبوط کرتا ہے اور لوگوں کو اپنا جاہ و جلال دکھا کر اپنا مقرب بناتا اور اپنے زور قوت کے بڑھانے میں بیدریغ مال و دولت لٹاتا ہے۔ یہ طریق اختیار کرنے کا سبب یہ ہوا کہ حکومت مذکورہ کے بانی معاویہ نے خلافت کو کچھ دینی و اخروی طمع سے لینا نہیں چاہا تھا جیسا کہ پہلے بھی معلوم ہو چکا ہے۔ اور ممکن ہے کہ اگر ملک شام کی زرخیزی اور کثرت محاصل معاویہؓ کو عطا اور انعام کا موقع نہ دیتی تو وہ کبھی اپنے مدعا کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوتے اور اپنی شوکت نہ بڑھا سکتے؛ اس لئے جس وقت بے غل و غش خلافت ان کے قابو میں آگئی۔ تو انھوں نے بے دریغ لوگوں کو انعام و اکرام بانٹنے شروع کئے، خاکر نہ اس قسم کے عطیات بنی ہاشم کو زیادہ دیتے رہتے جس سے ان کی یہ غرض ہوتی تھی کہ ان کے اپنے ہاتھ سے خلافت کو نکال لینے کے باعث جو عداوت اور کینہ اُن کے دلوں میں پیدا ہو گیا ہے اُس کی آگ دبی رہے۔ "زر بر سر فولاد نہی نرم شود" پر عمل کر کے ان کو بگڑنے اور بر سر پرخاش نہ آنے دیا جائے؛ معاویہؓ کی عادت تھی کہ جس وقت بنو ہاشم میں سے کوئی شخص اُن کے پاس آتا تو اُسے بڑی خاطر و مدارات سے ہاتھوں ہاتھ لیا کرتے؛ اور اس کے راضی خوشی رکھنے اور حاجتوں کو پورا کر دینے میں بہت کچھ مبالغہ کیا کرتے تھے؛ اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ بنو ہاشم جب معاویہ کے یہاں آتے تو ان سے اپنے ان حقوق کا ذکر کیا کرتے جو انھیں منصب خلافت کے متعلق حاصل تھے، اور صاف صاف کہہ گزرتے کہ انھیں (معاویہؓ) نے فریبانہ کارروائی کیساتھ یہ منصب ہمارے قابو سے نکالا ہے، معاویہ یہ سب سنتے اور دم نہ مارتے تھے، بلکہ چشم پوشی کر کے انھیں ٹال دیتے اور ضبط و تحمل سے ان

کی زبانیں بند کر دیتے تھے؛ اس قسم کے ان کے بہت سے قصے مشہور ہیں اور وہ اکثر صحیح ہیں۔

حضرت معاویہ کا طرزِ حکومت

معاویہؓ نے روم والوں سے دولتمندی اور عیش پسندی کے طریقے اور اسباب اقتباس کئے۔ اور شاہانہ رعب و جلال کے اظہار میں اُن کی تقلید کی؛ حرس (محافظ سپاہی؛ باڈی گارڈ) مقرر کئے یہ کچھ ملازم ہوتے تھے جو ہاتھوں میں ننگی تلواریں اور برچھے لئے ہوتے ان کے سامنے کھڑے رہتے تھے؛ یا جب وہ کہیں باہر نکلتے یا نماز کو جاتے تو آگے آگے چلا کرتے انھوں نے اپنے واسطے ایک عظیم الشان محل بنوایا جس میں تخت خلافت نصب کیا گیا؛ اور اس کے دروازہ پر دربان و حاجب کھڑا کیا؛ مسجد میں ایک علیحدہ حجرہ تعمیر کرایا کہ جب نماز پڑھنے آتے اسی کے اندر نماز پڑھتے؛ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے یہ سب وسائل اس خوف کی وجہ سے اختیار کئے ہوں۔ تاکہ اُن پر کوئی دشمن ناگہانی حملہ نہ کر بیٹھے؛ جیسا کہ علیؓ پر لوگوں نے اچانک حملہ کیا تھا؛ اور قریب تھا کہ وہی لوگ اچانک ان کو لپیٹ میں لے لیتے لیکن زندگی تھی بچ گئے؛ نیز معاویہؓ نے خز اور دیبا کے بیش قیمت اور شاندار لباس پہننے میں بھی رومیوں کی پیروی کی تھی؛ اور مسلمانوں میں وہ سب سے پہلے فرمانروا ہیں جنھوں نے رومیوں اور فارسیوں کے طرز پر ڈاک کا انتظام کیا؛ اور "دیوان خاتم" کی بنا رکھی؛ جس کی تفصیل آگے چل کر آئیگی؛

معاویہؓ نے جو نئی باتیں اسلام میں جاری کیں ان میں سے ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے خلافت کو اپنی نسل میں میراث کے طور پر مقرر کر دیا؛ حالانکہ اس سے پیشتر خلافت انتخابی تھی یعنی عامۂ مسلمین اپنی پسند اور کثرت رائے سے کسی شخص کو خلیفہ منتخب کر لیتے تھے؛ تمام مسلمانوں میں سب سے پہلے معاویہؓ ہی ایسے شخص ہیں جنھوں نے یہ کام کیا اور اپنے بیٹے یزید سے بیعت کر کے اسے ولی عہد بنایا؛ اور لوگوں سے اس کی ولیعہدی پر بیعت لی اس مقام پر کوئی یہ نہ کہہ بیٹھے کہ علیؓ کے بعد ان کے فرزند حسنؓ سے بھی تو بیعت کی گئی تھی؛ کیونکہ ان سے تو لوگوں نے اپنی خواہش اور رضامندی کے ساتھ بیعت کی تھی، ان کے والد نے ان کے ساتھ خلافت کی وصیت ہرگز نہیں کی؛

اموی خلافت کے اسباب

اگرچہ خود معاویہؓ اور تمام وہ لوگ جنھوں نے ان سے

بیعت کی پوری طرح خیال رکھتے تھے، کہ اہل بیت نبوی بہ نسبت اُن کے منصب خلافت کے زیادہ مستحق ہیں باوجود اس کے جن اسباب نے معاویہؓ کو اہلبیت کے ہاتھوں سے خلافت کو نکال لینے اور پھر اُسے اپنے ہی گھرانے میں مخصوص کر دینے میں مدد پہنچائی، ان پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔ یوں تو بہت سی وجہیں ہیں جنھیں سے بعض کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ لیکن انہیں وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ معاویہؓ نے اپنی قوت و شوکت کے مستحکم بنانے میں اسلام کے مشہور مدبروں اور پالیٹشن لوگوں سے کام لیا۔ جنھیں طرح طرح کے لالچ دلا کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ان لوگوں میں سے ایک شخص عمرو بن العاصؓ ہیں انھیں حکومتِ مصر کا لالچ دیا جس کی وجہ سے انھوں نے لوگوں سے بیعت لینے میں انھیں پوری مدد دی جس کی کیفیت پہلے بیان ہو چکی ہے۔ دوسرے صاحب زیاد بن ابیہ ہیں اس شخص کے باپ کا پتہ معلوم نہیں ہوتا۔ مگر وہ بڑا چالباز اور مدبر تھا۔ معاویہؓ نے ایک ایسا فرضی قصہ گھڑ لیا جس کے ذریعہ سے اُسے اپنے سلسلہ نسب میں شامل کر لیا اور بیان کیا کہ وہ ان کے باپ ابو سفیان کا فرزند اور ان کا بھائی ہے اور اس کا نام زیاد بن ابو سفیان رکھ دیا، یہی زیاد معاویہؓ کا بڑا زبردست مددگار تھا اور ممالک عراق وغیرہ کی طرف سلطنت الواُمیہ کا سکہ جمانے میں اس کا بہت بڑا احسان ہے۔ اسی زیاد کے بیٹے عبید اللہ بن زیاد نے حسینؓ بن علیؓ کو قتل کیا تھا جن کا ان کے ہاتھوں شہید ہونا مشہور عام ہے۔ اُسی وقت سے (جبکہ معاویہؓ نے زیاد کو اپنا برادر قرار دیا تھا) زیاد کی اولاد کا شمار برابر قریش کے خاندان میں ہوتا رہا یہاں تک کہ ۱۵۹ھ میں خلیفہ مہدی عباسی نے اس کے نسب کو عبید رومی کی جانب پھیرا جو کہ قبیلہ سقیف سے تھا، اور تیسرے بزرگوار مغیرہ بن شعبہ ہیں۔ ان سے بھی معاویہؓ نے اپنی خلافت میں کافی امداد لی۔ انہیں مغیرہ کا کام تھا کہ انھوں نے اپنے بیٹے یزید کے واسطے لوگوں سے بیعت لینے اور خلافت کو اپنی نسل میں محدود کر دینے پر معاویہؓ کو مدد دیا تھا اور زیاد بن ابیہ کو ان سے ملانے میں بھی یہی مغیرہؓ بڑے بھاری پیروکار رہے تھے۔

مؤرخ لوگ ان چاروں اشخاص مذکورہ بالا کو عرب کے سب سے بڑے مدبر اور پولیٹشین شمار کرتے ہیں اور اسی خیال سے ایک مؤرخ کا قول ہے کہ میں نے معاویہؓ سے بڑھکر بُردبار اور نہایت غور و فکر کے ساتھ کام کرنے والا شخص نہیں دیکھا۔ اور جبکہ لوگوں کا مجمع ہو اس وقت ان

سبھوں پر رائے میں غالب آ جاتا اور ان سے اپنے اشاروں پر کام لینے والا عمرو بن العاصؓ سے بڑھ کر مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ زیاد بن ابیہ سے بڑھ کر کوئی ایسا آدمی دکھائی نہیں دیا، جس کا باطن ظاہر سے بہت کچھ ملتا جلتا ہو، اور مغیرہ بن شعبہ کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کسی شہر میں آٹھ دروازے ہوں اور ہر دروازے میں ہو کر نکلنے کے واسطے انہیں ایک نئے مکر وفریب کی ضرورت ہو تو اس میں شک نہیں کہ وہ ہر ایک دروازے میں ہو کر نکل جاتے۔

حضرت علی کا طرزِ عمل

معاویہؓ کی کامیابی میں اس بات نے اور بھی مدد پہنچائی کہ علیؓ ملکداری کی چالیں چلنا پسند نہیں کرتے تھے اور حکمرانی کی تدبیروں سے ناواقف تھے۔ اس کے ثبوت میں وہ واقعات پیش ہو سکتے ہیں جو ان کی ذات سے شہادتِ عثمانؓ کے بعد ان سے بیعت کئے جانے کے وقت عیاں ہوئے۔ ان دنوں مغیرہ بن شعبہؓ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں یہ صلاح دی تھی کہ آپ معاویہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ اور دوسرے عاملوں کو انہیں عہدوں پر قائم رہنے دیں جن پر کہ وہ لوگ عثمانؓ کے عہد سے مقرر ہیں۔ پھر جب آپ کا پوری طرح تسلط ہو جائے اور آپ کی بیعت پر سب لوگوں کے دل متفق ہو جائیں۔ لوگوں میں جو اختلاف پھیلا ہوا ہے یہ فرو ہو جائے اور سب مطمئن ہو کر ایک حکومت کے ماتحت ہو لیں، اس وقت جو دل میں آئے کیجئے گا۔ اگرچہ یہ ایک دانا اور دور اندیش شخص کی رائے تھی۔ لیکن علیؓ نے اسے بے اعتباری کی نظر سے دیکھ کر اس پر عمل نہ کیا۔ اور ان کے چچیرے بھائی عبداللہ بن عباسؓ نے بھی انھیں اسی طرح پر سمجھایا تھا، مگر آپ نے اسے ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ مغیرہؓ نے جب یہ دیکھا کہ میرے سمجھانے کا الٹا اثر ہوتا ہے تو وہ چپ ہو رہے اور انہوں نے خیال کیا کہ یہ جیسا کرتے ہیں کرنے دو تم کچھ نہ بولو۔ اس بات کو دل میں ٹھان کر دوسرے دن وہ پھر علی کی خدمت میں آئے اور ان کی ذاتی رائے کو اچھا بتانے لگے۔ اگر علیؓ مغیرہؓ اور ابن عباسؓ کے کہنے پر چلتے تو مذکورہ بالا لوگ (یعنی معاویہ وغیرہ) ان کے دشمن نہ بنتے، اور مغیرہ وغیرہ ان کے طرفداروں میں سے نہ نکل جاتے نہ جمل اور صفین کی لڑائیاں پیش آتیں اور نہ منصب خلافت بنو امیہؓ کے قابو میں جا سکتا۔

مال و دولت کی فیاضی

اس موقعہ پر ایک اور بھی بڑا موثر سبب ہے، جس کو معاویہ رضی اور تمام بنوامیہ نے اپنے زور و قوت کے بڑھانے میں استعمال کیا، جس سے ہماری مراد "مال" ہے، بنوامیہ اسی کے ذریعہ سے اپنے طرفداروں کی جماعتیں بڑھاتے اور دشمنوں کو قابو میں لایا کرتے تھے، ان کا قاعدہ تھا کہ اپنے یہاں آنے والے حاجتمندوں کو بے دریغ انعام و اکرام دیتے رہتے، اور اسی کے وسیلہ سے وہ لوگ علی رضی بن ابی طالب اور ان کی اولاد و احفاد کے مقابلہ میں کامیاب ہوئے، جس وقت میں کہ یہ لوگ اس راہ میں مال کا خرچ کرنا کمینہ پن خیال کرتے تھے، اور اپنی طبیعت کو اس کام سے باز رکھتے تھے، ان کا اعتقاد تھا کہ صرف حق کی پابندی ان کے دعوے کی تائید کے لئے کافی ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ بنو ہاشم کا یہ خیال اوائل اسلام میں صحیح اترا تھا کیونکہ ان دنوں لوگوں کے دلوں پر نبوت کا رعب چھایا ہوا تھا، اور ان کی نفسانی خواہشیں اور شیطانی وسوسے مغلوب تھے، ہمارے خیال میں کوفہ والوں نے محض روپے کے لالچ سے حسین رضی کی بیعت توڑ دی جس کا انجام بیکسی کے عالم میں ان کا شہید ہو جانا ہوا، یہ کہنا چاہیئے کہ اموبوں نے حسین ع کو مال کے زور سے شہید کیا، اور نیز عبداللہ بن زبیر کو بھی ان لوگوں نے مال ہی کے ذریعہ شہید کرایا، اگر عبداللہ بھی روپے کو اسی طرح صرف کرتے جس طرح کہ بنوامیہ کیا کرتے تھے تو اس میں کلام نہیں کہ خلافت انہی کی نسل میں رہتی، بنوامیہ کے ہاتھوں میں نہ جاتی، مگر انھوں نے کعبہ کے مال کا لوگوں کو لٹانا مناسب نہ سمجھکر اس سے ہاتھ روکا اور اپنی ذات کو نقصان پہنچایا، چنانچہ ان کے دشمن اور مقابل عبدالملک نے اپنے مرتے وقت صاف صاف یہ کہدیا کہ "میں اپنے آپ سے بڑھکر کسی کو بھی اس کام (خلافت) کے لئے صاحب قوت نہیں سمجھتا، اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن زبیر بڑے نمازی اور بہت روزہ دار ہیں، مگر اپنی کنجوسی کی وجہ سے وہ حکومت کی قابلیت نہیں رکھتے۔"

مصعب بن زبیر کا واقعہ

بخلاف عبداللہ بن زبیر کے ان کا بھائی مصعب بن زبیر اپنی ذات اور اپنے گھر والوں پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کر دیتا تھا، یہاں تک کہ اس نے سکینہ بنت حسین رضی سے نکاح کرنے پر دس لاکھ درہم

درم صرف کر ڈالے حالانکہ اُنھی دنوں میں اس کے سپاہی تنگدستی سے پریشان ہو کر اُس سے روپیہ مانگتے تھے اور وہ انھیں ایک حبہ تک نہیں دیتا تھا، چنانچہ عبداللہ بن ہمام نے اسی واقعہ کو اس طرح پر عبداللہ بن زبیر کے پاس لکھ بھیجا وہ لکھتا ہے۔

بلغ امیر المؤمنین رسالۃً　　من ناصح لک لا یرید خداعا

بضع الفتاۃ بالف الف کامل　　وتبیت سادات الجنود جیاعا

لابی حفص اقول مقالتی　　وابث ما اثبتکم لارتاعا

(ترجمہ) ایک ایسے خیر خواہ کی جانب سے جو تم کو فریب دینا نہیں چاہتا ہے، امیر المومنین کو یہ پیغام پہنچا دو کہ ایک حسین عورت پورے دس لاکھ درم کا سرمایہ حاصل کر لیتی ہے اور فوج کے سردار دن بھر فاقہ کر کے رات کو بھوکے سو رہتے ہیں؛ اگر میں یہ بات ابی حفص (عمرؓ) سے کہتا اور جو تم سے عرض کر رہا ہوں اس بات کو ان کے سامنے بیان کرتا تو وہ خوف سے کانپ اٹھتے

اپنا سکہ جمانے کے لئے عبدالملک تمام بنو امیہ میں مال کا بے دریغ اور بکثرت صرف کرنیوالا شخص تھا جس وقت حجاج بن یوسف نے کعبہ کا محاصرہ کیا ہے اور ابن زبیر اس کے اندر تھے تو اس نے اپنے ساتھی لوگوں کو حکم دیا کہ کعبہ کو منجنیق سے مسمار کریں۔ مگر وہ لوگ ہیبت کے مارے اس امر کے مرتکب نہ ہوئے، حجاج نے اس بات کو دیکھکر ایک کرسی میدان جنگ میں ڈلوا دی۔ اور اس پر بیٹھکر اپنے سپاہیوں کو کہا "ملک شام کے رہنے والو! تم عبدالملک کے انعاموں کی غرض سے لڑو اور اس کے دشمنوں کو مارو" اس گفتگو کو سنکر وہ سب لوگ فوراً ہی تعمیل حکم میں مصروف ہو گئے"۔

عبدالملک کی فیاضی

بسا اوقات عبدالملک دشمنوں کے جتھوں کو بلا کر مال کے ذریعہ اپنے سر سے ٹال دیتا تھا اس طرح پر کہ وہ روپیہ بکھیر دیتا اور لوگ اُسے چھوڑ کر مال و زر کے لوٹنے میں مصروف ہو جاتے، اس قسم کے واقعات میں سے ایک وہ واقعہ بھی ہے جو عبدالملک کو سعید بن اشدق کے بیٹے عمرو کے ساتھ پیش آیا تھا، جس نے عبدالملک کو ہٹا کر ملک شام پر قبضہ کر لینے کا منصوبہ گانٹھا تھا، اور عبدالملک کو اس کی طرف سے اپنی جان کا خوف پیدا ہو گیا تھا، عبدالملک نے پہلے تو اُسے امان دی اور ایک حیلہ سے اُس کو اپنے

دربار میں بلوایا پھر جب وہ حاضر ہوا تو عہد شکنی کر کے اُسے قتل کرا دیا؛ اس کے ساتھیوں کو اس امر کی خبر ملی تو وہ سب جمع ہو کر آ گئے۔ اور دربار کو گھیر لیا عبدالملک اس کے انجام سے ڈر گیا اور اس نے ایک شخص کو یہ حکم دیا کہ عمرو بن سعید کا سر باغیوں کے سامنے پھینک دے ایک جانب یہ کارروائی کی اور دوسری جانب اس کے بیٹے عبدالعزیز نے روپیوں کا توڑا لے کر مٹھی بھر بھر روپے اشرفیاں باغیوں کے اوپر پھینکنی شروع کیں؛ باغی لوگوں نے اپنے سرگروہ کا سر اور روپیوں کا مینھ برستا ہوا دیکھ کر سر کو تو چھوڑ دیا اور روپے سمیٹنے پر جھک پڑے، اور اُسے لے کر چلتے بنے۔

عبّاسی خلافت میں مالی اثرات

بنو اُمیّہ کے عہد سے بڑھ کر خلفائے عباسیہ کے ایّام میں مال و دولت کا اثر ترقی پر رہا ان کی حکومت کا زور یا ضعف اس انعام و اکرام کی کمی زیادتی پر منحصر ہوتا تھا جو ہر ایک خلیفہ فوجی سپاہیوں کو تقسیم کیا کرتا، خاص کر جس وقت کہ عباسی سلطنت میں ترکوں کا زور بڑھا تو وہ لوگ اپنی امداد کا بڑی بڑی رقموں سے معاملہ کرنے لگے؛ ان کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ جب کوئی نیا خلیفہ تخت نشین ہوتا پہلے اس سے اپنا حق بیعت مانگتے تھے، اور ایک یا دو سال کی تنخواہیں انعام میں لے لیتے تب اس کی بیعت ہونے دیتے تھے،

دُور اندیشی

جن امور نے بنو اُمیّہ کی حکومت کو مدد دی ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ لوگ اپنی سلطنت کو مضبوط بنانے میں طرح طرح کے فریب کھیلے اور قسم قسم کی چالیں چلا کرتے تھے اور جو کام کرتے بہت ہی دور اندیشی اور حکمت عملی کے ساتھ کرتے تھے، چاہے ان باتوں کی وجہ سے مذہب کی توہین اور مذہب والوں کی بے حرمتی ہی کیوں نہ ہو؛ اس لئے انھوں نے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے نواسے کو قتل کرا دیا؛ کعبہ پر آگ اور پتھر برسائے اور نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے چچیرے بھائی اور ان کے داماد کو ممبروں پر کھڑے ہو کر لعنت کہی اور جس شخص نے اُن پر لعنت نہیں کی اُسے جان سے مروا دیا۔

بنو اُمیّہ کے خلفاء

ہم یہ اوپر بیان کر آئے ہیں کہ معاویہؓ نے اپنی نسل میں خلافت کا منصب وراثت کے طور پر مقرر کیا تھا، لیکن یہ منصب دو

ان کے بیٹے یزید کے سوا جس کی ولیعہدی کی بیعت انھوں نے اپنی زندگی ہی میں کرالی تھی ان کی اولاد میں اور کسی کو نصیب نہ ہوا۔ یزید نے بھی محض چند سال تک حکومت کی اور اس تنا میں بڑے بڑے خراب کام کئے منجملہ ان کے ایک امر حسینؓ بن علیؓ کا شہید کرانا بھی تھا، یزید کے مرنے پر لوگوں میں بیعت کے متعلق اختلاف پیدا ہوا۔ اس کا ایک بیٹا معاویہ (ثانی) نام تھا اگرچہ لوگوں نے اُسے خلیفہ مقرر کیا لیکن وہ اپنے تئیں منصب خلافت کا مستحق نہ سمجھتا تھا آخر وہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد وفات پاگیا، معاویہ ثانی کے رحلت کرجانے پر بنو اُمیہ نے ایک اور اموی بزرگ خاندان شخص سے (جو معاویہ کے گھرانے میں نہ تھا) بیعت کی اس سردار کا نام مروان بن حکم تھا سنہ ۶۵ھ میں چند مہینوں تک خلافت کرکے یہ بھی وفات پا گیا اور اس کے بعد خلافت اسی کی نسل میں محدود ہو گئی۔ اور جس قدر بنو اُمیہ کے خلفا اس کے بعد ہوئے سب اُسی کی اولاد میں تھے، جن میں سب سے زیادہ مشہور حکمران عبدالملک بن مروان تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اُس نے سنہ ۶۵ھ سے سنہ ۸۶ھ تک (۲۱) سال حکومت کی۔

دفاتر میں عربی کا اجرا

تمدن اسلام کی تاریخ میں عبدالملک کا ذکر عمدہ پیرائے میں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے ممالک اسلامی کے دفاتر میں عربی زبان کو عام طور پر رائج کیا تھا حالانکہ اس کی حکومت کے زمانہ تک وہ دفاتر اہل ملک کی ہی زبانوں میں لکھے جاتے تھے۔ اور وہیں کے باشندے ان کے اہل کار ہوتے تھے، مصری دفتروں میں قبطی زبان کا رواج تھا اور اس کے کارکن مصر کے رہنے والے قبطیوں ہی میں سے تھے، شامی دفاتر یونانی زبان میں تحریر ہوتے تھے، اور ان کا کاروبار شامی نصاریٰ میں سے کچھ اہلکاروں کے ہاتھوں میں تھا، اور عراق کا دفتر فارسی زبان میں تھا جس کی خدمتیں عراق ہی کے بعض باشندے سرانجام دیتے تھے، عبدالملک نے عام حکم دیدیا کہ تمام دفتروں میں عربی زبان جاری کر دیجائے۔ اور ان کا کاروبار بھی مسلمانوں کے ہی ہاتھوں میں دیدیا تھا۔ اس حکمتِ عملی سے اسلامی حکومت کو جس قسم کا استحکام حاصل ہو سکتا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا، کیونکہ اس طرز عمل نے سلطنت کے تمام ممالک میں عربی زبان کو عام زبان بنا دیا، جس کی وجہ سے وہاں کے رہنے والے

رفتہ رفتہ کئی صدیوں کے گذر جانے پر اپنی حیثیتوں کو ہی بھول گئے اور اپنے تئیں عربوں میں شمار کرنے لگے؛ ایسا کرنے میں عبدالملک کو اس وجہ سے اور بھی امداد ملی کہ عربی زبان مذہبی زبان بھی تھی اور لوگوں نے اسے شوق سے حاصل کرنے کے علاوہ بابرکت اور قابلِ تعلیم زبان سمجھ رکھا تھا؛

عبدالملک کے کارناموں میں سے اس کا عربی خط میں سونے کے سکے بنوانا اور رومانی طراز (مارک) کو عربی میں منتقل کرنا بھی شمار ہوتا ہے۔ جس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی؛ ملکِ عراق میں عبدالملک کی جانب سے حجاج بن یوسف عامل مقرر تھا جو اپنی انتظامی قابلیت اور تند مزاجی کے لحاظ سے مشہور ہے۔ حجاج عبدالملک کا بڑا بھاری مددگار اور اس کی سلطنت کا رکنِ اعظم تھا؛ یہی حجاج ہے جس نے عبداللہ بن زبیر سے جنگ کی جو بنو امیہ کے مقابلے میں اپنے لئے لوگوں سے بیعت لے رہے تھے، حجاج نے مکہ میں ان کا محاصرہ کیا اور کعبہ پر منجنیق چلا کر انہیں قتل کر ڈالا۔ اور عبدالملک کو بے غل و غش خلیفہ بنا دیا؛

حضرت عمر بن عبدالعزیز

بنو امیہ کے مشہور خلفا میں سے ایک خلیفہ عمر بن عبدالعزیز مروان اموی بھی ہیں؛ انھوں نے ۹۹ھ سے سنہ ۱۰۱ھ تک حکمرانی کی، یہ خلیفہ تمام اموی خلفا میں اپنے چال چلن کے اعتبار سے خلفائے راشدین کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے، اور ہو سکتا ہے کہ اس نیک اطواری کی وجہ ان کی وہ قرابت رہی ہو جو انھیں عمر بن الخطاب سے تھی کیونکہ یہ عمرؓ کی نواسی کے بیٹے تھے۔ جس وقت یہ مسندنشینِ خلافت ہوئے تو انھوں نے نیک صفات میں اپنے بزرگ نانا عمرؓ کے زہد و انصاف کی پیروی کی۔ بنو امیہ نے جس وقت سے کھلم کھلا خلافت کا مطالبہ کیا تھا، اس وقت سے اب تک برابر ان کا یہ شیوہ رہا کہ علی کو بر سر منبر برا بھلا کہیں، عمر بن عبدالعزیز نے خیال کیا کہ یہ فعل قبیح اور اسلام کی تعلیم سے بعید ہے، لہٰذا انھوں نے اس بدنما کارروائی کو بند کر دیا؛ لیکن ان کے یہ کام بنو امیہ کے نزدیک قبولیت کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل نہ ٹھہرے، خصوصاً اس لئے وہ اور بھی ان کی نگاہوں میں خار گذرے، کہ انھوں نے بنو امیہ کو املاک کے خریدنے سے روک دیا؛ عمر بن الخطابؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں بنو امیہ کو اس فعل سے روکا تھا، جس کی انھوں نے تعمیل نہیں کی، اب عمر بن عبدالعزیز نے پھر اس قاعدہ کو جاری کیا تو بنو امیہ کے دلوں میں یہ ڈر سما گیا کہ اس شخص کی حکومت زیادہ دنوں رہیگی تو غالباً یہ سلطنت ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گی؛ اسی خیال سے

انہوں نے اس نیک خصلت حکمران کا چراغ زندگی بہت جلد گل کر دیا۔

یزید بن عبدالملک

عمر بن عبدالعزیز کے بعد اُن کا چچا یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا، یہ شخص عیش پسند اور شرابی تھا، گانے بجانے کا بھی بہت شوق رکھتا تھا، سلطنت کے کاروبار کو بالائے طاق رکھ کر صرف دو لونڈیوں کی صحبت میں رہنے لگا جن میں سے ایک کا نام "سلامہ" اور دوسری کا نام "حبابہ" تھا۔ حبابہ نے اس کے دل و دماغ پر قابو پالیا تھا، اور تمام حکومت اُس کے زیر حکم ہو گئی تھی وہ جسے چاہتی برطرف کرتی، اور جس کو چاہتی ملازم رکھتی تھی۔ یزید کو دنیا کے کسی دھندے سے غرض نہیں رہی تھی۔ آخر کار یزید کے بھائی "مسلمہ" نے ایک دن اُسے بہت لعنت ملامت کی اور اس سے کہا، تم عمر بن عبدالعزیز جیسے عادل حکمران کے بعد خلیفہ ہوئے۔ اور اب حالت یہ ہے کہ ایک لونڈی کے عشق میں مبتلا ہو کر سلطنت کے کاروبار کو تج بیٹھے ہو۔ لوگ تم سے ملنے آتے ہیں اور تم کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ فریادی لوگ پہنچتے رہتے ہیں اور تم ہو کہ غفلت کی گہری نیند سو رہے ہو۔ بھائی کی ملامت آمیز گفتگو سے متاثر ہو کر یزید بن عبدالملک نے کہا: "تم سچ کہتے ہو" اور اُس نے ارادہ کیا کہ نہ تو اب شراب پیئے گا اور نہ عیش و عشرت میں مبتلا رہے گا۔ چنانچہ کچھ دنوں تک وہ "حبابہ" سے علیحدہ رہا مگر اس جدائی کی وجہ سے خود "حبابہ" کی آتش شوق بھڑک اُٹھی اور وہ اس فکر میں پڑ گئی کہ کسی طرح خلیفہ سے دوچار رہو۔ چنانچہ ایک روز جمعہ کے دن اُس نے اپنی کسی لونڈی سے کہا کہ "امیر المؤمنین نماز کے لئے نکلیں تو مجھے خبر دینا۔ لونڈی نے اس کے حکم کی تعمیل کی، اور جس وقت خلیفہ نماز جمعہ کے لئے ایوان خلافت سے باہر جانے کو تیار ہوا، اس نے اپنی مالکہ "حبابہ" کو اطلاع کر دی۔ حبابہ عود ہاتھ میں لے کر خلیفہ کے سامنے آکھڑی ہوئی، اور یہ شعر بہت ہی دلکش آواز سے گانے لگی۔

"الا لا تلمه الیوم ان یتبلدا فقد غلب المحزون ان یتجلدا"[1]

---

[1] خبردار آج اُس کے تجاہل پر ملامت نہ کیجیو! کیونکہ غمگین پر اس کا بتکلف صبر کرنا غالب آرہا ہے۔

یزید نے اس شعر کو سُنکر اور حبابہ کی دلفریب صورت دیکھکر اپنا مُنہ ڈھانک لیا اور اُس سے کہا: "ٹھہر تو جا، کیا کرتی ہے؟" مگر حبابہ نے اس کی خفگی کی کوئی پروا نہ کر کے دوبارہ ایک عجیب دلفریبی کے ساتھ یہ شعر گایا:-

لہ فما العیش الا ما تلذ و تشتہی وان لام فیہ ذوالشنان وفندا

نتیجہ یہ ہوا کہ یزید اپنے آپے سے باہر ہو کر دیوانہ وار اُسے لپٹ گیا اور کہنے لگا "واللہ تو نے سچ کہا، جس نے مجھے تجھ سے اُلفت رکھنے کی بابت ملامت کی خدا اُس کا بُرا کرے"! اے لڑکے "مسلمہ" کو میرا حکم سُنادے کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے"۔ اس کے بعد حبابہ کے پاس بیٹھکر شراب ارغوانی کے جام پینے میں مصروف ہو گیا، اور حبابہ برابر سُریلی دلکش تانیں اُڑاتی جاتی تھی۔ غرضیکہ یزید پھر اسی اپنی اگلی سی سرخوشی میں مستغرق ہو گیا۔

وفات کا سبب اس واقعہ کے بعد سے یزید برابر انہیں لذائذ میں مصروف رہا یہاں تک کہ آخر کار حبابہ کے مرنے پر اُسی کے رنج و غم میں خود بھی گھل گھل کر مر گیا، ان دونوں کی وفات کا قصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ ملکِ شام کے ایک سردار کے گھر میں وارد تھا اور حبابہ اس کے ہمراہ تھی۔ یزید نے دل میں خیال کیا کہ "لوگ کہتے ہیں کہ کوئی شخص پورے ایک دن صبح سے لے کر رات ہونے تک دادِ عیش نہیں دے سکتا، اس عرصہ میں اُسے کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ جس سے تمام مزہ کرکرا ہو جاتا ہے میں بھی اس قول کا امتحان کروں گا"۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنے ہمراہیوں سے کہا "کل صبح سے مجھے کسی بات کی اطلاع نہ دینا، اور نہ کوئی خط میرے میرے پاس لانا خواہ وہ کتنا ہی ضروری ہو"۔ یہ حکم دے کر حبابہ کے ساتھ خلوت میں جا بیٹھا، اور مصروف عیش و تنعّم رہا۔ خادموں نے دستر خوان چن دیا تھا جس پر طرح طرح کے لذیذ کھانے اور انواع واقسام کے میوے موجود تھے، حبابہ نے ایک انار اٹھا کر کھانا شروع کیا۔ جس وقت کہ وہ انار کے دانوں کا پھنکا لگا رہی تھی، اتفاق سے ایک سالم دانہ حلق میں جا پھنسا، اور ذرا چھٹو ہوتے ہی مر گئی۔ یزید مجنونوں کی طرح تین دن تک اس کی لاش کے پاس بیٹھا رہا، اُسے دفن

لہ عیش تو صرف وہی ہے جو تجھے لذیذ معلوم ہو اور تو جس کی خواہش کرے، اگرچہ کینہ ور اس کے بارے میں ملامت کرے اور بیوقوف بنادے۔

نہیں کرنے دیتا تھا، آخر کو اس کی لاش بگڑ گئی اور اس میں سے بو آنے لگی۔ یزید بار بار اس کی میت کو سونگھتا اور چومتا تھا۔ مگر اس کے پاس سے نہیں ہٹتا تھا، اس کے عزیزوں نے یہ حالت دیکھ کر لعنت ملامت کی اور اسے اس حرکت سے باز آجانے پر مجبور کیا، بہت ہی رد و کد کے بعد یزید نے دفن کرنے کی اجازت دی، اور اس کے مرنے کے بعد خود بھی صرف پندرہ دن زندہ رہ کر ۱۰۵ھ میں مرگیا۔ اور حبابہ کے پہلو میں مدفون ہوا۔

ہشام بن عبد الملک یزید کے بعد اس کا بھائی ہشام ۱۰۵ھ سے لے کر ۱۲۵ھ تک بیس سال تک حکمراں رہا، یہ خلیفہ نہایت عقلمند اور منتظم تھا لیکن بخیل تھا، اور جو سلطنت سخاوکرم کے ذریعہ سے قائم ہوئی ہو، اس میں کنجوسی کی وجہ سے جس قدر نقصان آسکتا ہے ظاہر ہے۔ ہشام کے بعد یزید کا بیٹا ولید خلیفہ ہوا، یہ خلافت کے قبل ہی سے اپنے باپ کی طرح عیش پرستی، شراب خوری اور گانے بجانے کا بیحد شائق تھا، چنانچہ ان باتوں کی تعریف میں اس کے بہت سے اشعار بھی ہیں، خلافت ہاتھ آئی تو کھل کھیلا، لذائذ نفسانی اور ارتکاب معاصی کی کثرت تو تھی ہی، خیر سے اپنے اپنے خاندان والوں سے بھی بگاڑ کر لیا، اور ان کے ساتھ ایسی بدسلوکیاں کیں کہ آخر انھوں نے برہم ہو کر رعایا میں سے بڑے بڑے سرغنوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور اس پر حملہ کر کے اُسے قتل کر ڈالنے کے بعد ولید بن عبد الملک کے بیٹے یزید سے بیعت کرلی، یزید کا پختہ ارادہ تھا کہ جس قدر خرابیاں سلطنت میں پیدا ہوگئی ہیں ان کی اصلاح کرے گا، لیکن اب معاملہ بہت بڑھ گیا تھا، بنو اُمیہ کی قوت پراگندہ ہو چکی تھی، اور عباسی دعوت شروع ہو چکی تھی، اس وجہ سے وہ اپنے ارادوں میں ناکام رہا۔ اور انجام کار یہ ہوا کہ اس کے جانشین مروان بن محمد بن مروان کے عہد یعنی ۱۳۲ھ میں بنو اُمیہ کے ہاتھوں سے خلافت بالکل جاتی رہی۔

حکومتِ عبّاسیہ

عبّاسیوں کی دعوت

ہم نے ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کا حال بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمانوں نے بنو ہاشم میں خلافت اور نبوت دونوں منصبوں کو اکٹھا کرنا پسند نہیں کیا تھا، اس لئے ان کے علاوہ قریش کے دوسرے گھرانوں میں بیعت کی مگر بنو ہاشم مسلمانوں کے اس فعل کو حق بات سے متجاوز ہونا سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ وہ (خود بنو ہاشم) اس منصب کے لئے تمام دوسرے لوگوں سے بہتر ہیں۔ اور اسکی کوشش کرتے رہتے تھے کہ خلافت پر قابض ہوں، جن بنی ہاشم کو خلافت کی خواہش تھی ان کی بھی کئی قسمیں تھیں :

اوّل علوی : علی بن ابی طالبؓ کی اولاد ان کے بھی دو گروہ تھے : ایک گروہ کا منشا تھا کہ خلافت فاطمہ زہرا کی نسل میں آئے، اور دوسرا گروہ محمد بن حنفیہ کو جو دوسری بیوی حضرت علیؓ کے بیٹے تھے : خلیفہ بنانے کی فکر میں کر رہا تھا،

(۲) عباسی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ کی اولاد : ان دونوں جماعتوں کے لوگ عام لوگوں کو اپنی طرف بلاتے رہتے تھے اور لوگ پردہ پردہ میں ان سے بیعت کرتے رہتے، لیکن ظاہر کرنے کی قوت اور جرأت نہ رکھتے تھے : جس وقت بنو اُمیہؓ کی کمزوری اور اُن کی قوت کی پراگندگی عیاں ہو چلی، تب لوگوں کو بھی ان کی اطاعت سے باہر نکلنے میں آسانی ہونے لگی : خصوصاً اس وجہ سے کہ زیادہ تر لوگ طمع یا خوف کی وجہ سے اموی خلفا کے مطیع بنے تھے، ورنہ دل سے یہی خیال رکھتے تھے کہ خلافت کے لئے بنو ہاشم سب سے بہتر ہیں۔

ابو مسلم خراسانی

انھیں دنوں میں عباسیوں کو خراسان کا رہنے والا ایک فارسی شخص ایسا مل گیا جو بہت ہی دبنگ اور دلیر تھا، اس شخص کا نام ابو مسلم خراسانی تھا، عباسیوں نے اُسے اُس کے وطن خراسان کی جانب بھیجا تا کہ وہاں جا کر لوگوں سے ان کی بیعت لے، اس لئے کہ وہ

مقام اموی خلافت کے مرکز سے دور واقع ہوا تھا، ابو مسلم کو اس عمل میں عجیب قسم کی کامیابی ہوئی، اُس نے خوب خوب کوشش کرکے اور لوگوں کو جنگ و پیکار سے دباکر آخر کار بنی عباس کے لئے ساز وسامان مہیا کردیئے، اور ۱۳۲ھ میں تمام خلافت اُن میں سے پہلے خلیفہ سفاح، کے سپرد کردی، عباسی حکومت کی بنیاد قائم کرنے میں ابو مسلم خراسانی کے احسانات عمرو بن العاص کے ان احسانوں سے بہت بڑھے ہوئے ہیں؛ جو انھوں نے معاویہ کو خلافت دلانے میں کیئے تھے، اس لئے کہ عمرو بن العاص نے معاویہ کو صرف اپنی رائے سے مدد دی تھی، اور ابو مسلم نے عباسیوں کی امداد اپنی تلوار اور اپنی قوم دونوں سے کی،

عباسی حکومت

حکومت بنو اُمیہّ کے بارہ میں یوں جاہے جو کچھ کہا جائے لیکن بنو عباس کی سلطنت سے اس کو یہ امتیاز بہر طور حاصل ہے کہ وہ اصلی عربی حکومت تھی، کیونکہ اس کے عامل۔ قاضی اور تمام ارکان سلطنت اہل عرب تھے؛ صرف چند منشی اور طبیب؛ اور اسی قسم کے بعض پیشہ ور یا اہل ہنر تو بیشک غیر اقوام میں سے تھے، ورنہ خلیفہ سے لیکر ادنی سپاہی تک تمام لوگ خالص عرب ہوتے تھے، مگر بنو عباس کی سلطنت میں فارسی عنصر غالب ہوگیا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ اہل فارس نے ہی حکومت ان کی دلائی تھی جیسا کہ معلوم ہوچکا ہے، اسی لئے بنو عباس نے فارسیوں میں سے سربرآوردہ لوگوں کو اپنا وزیر بنایا؛ عربی حکمرانوں میں وزیر مقرر کرنے کی اوّلیت بنو عباس ہی کو حاصل ہے، انھوں نے اس منصب کا تقرر بھی اہل فارس کی طرز حکومت سے اقتباس کیا تھا، جیسا کہ آگے چلکر کسی موقع پر ذکر آئے گا۔

سفاح و منصور

بنو عباس کا سب سے پہلا خلیفہ ابو العباس سفاح تھا، جس کے کئی بھائی اور چچا تھے، اس نے اُنھیں اپنی قوت بڑھانے میں اپنا بازو بنایا، سفاح کا پایۂ تخت انبار نام ایک مقام بغداد سے مغرب کی طرف دریائے فرات پر واقع تھا، سفاح مرتے وقت تک اسی مقام میں رہا۔ اور اس نے صرف چند سال تک حکومت کی؛ سفاح کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر منصور ۱۳۶ھ سے ۱۵۸ھ تک خلیفہ رہا، ابو جعفر منصور جالبازی، مدبری اور ملکی نظم ونسق میں اسلام کے مشہور اور بڑے بڑے لوگوں میں گذرا ہے وہ دلیر بھی بیحد تھا، اس نے کوفہ کے قریب ایک شہر آباد کرکے اس کا نام ہاشمیہ رکھا تھا جس وقت

یہ شہر خوب آباد ہو چکا، اتفاق سے اُسے وہاں ایک فرقہ سے لڑائی پیش آگئی جس کو راوندیہ کہتے تھے، اس جنگ کی وجہ سے منصور نے اس شہر کو ناپسند کیا اور اس کی ناپسندیدگی کی ایک اور علت بھی تھی، یعنی "کوفہ" کا قرب، منصور کوفہ والوں سے بہت ڈرتا تھا، کیونکہ وہاں کے رہنے والوں نے علیؓ اور حسینؓ کو شہید کر دیا تھا، اس لئے وہ اس کی نظروں میں قابلِ اعتبار نہ تھے، پھر منصور ہاشمیہ سے نکل گیا، اور اس نے شہر بغداد تعمیر کرایا جو کہ اسلامی سلطنتوں میں سب سے زیادہ مشہور رہے، منصور کو معلوم ہوا کہ ابی مسلم کا زندہ رہنا اس کے مرکز کو خطرہ کی حالت میں رکھے گا کیونکہ اور لوگوں کے مقابل میں اُسے بنو عباس کے ہاتھوں سے خلافت کا نکال دینا ویسا ہی آسان تھا جیسا کہ اُن کا اِن کے قابو میں دینا، لہذا منصور نے اُسے دھوکہ سے قتل کرا دیا، اور اس معاملہ میں لوگوں سے یہ عذر پیش کیا کہ میرا سنگِ راہ تھا اس لئے میں نے اُسے دفع کر دیا (ہٹا دیا) منصور کا یہ فعل اسی قسم کا تھا جیسا کہ اس وقت سے گیارہ سو برس بعد محمد علی پاشا خدیو مصر نے مما لیک کے اُمرا سے اور سلطان محمود دوم نے ینگچری سپاہیوں سے سلوک کیا،

منصور کے جانشیں

منصور کا زمانہ شروع سے آخر تک فتوحات ہی میں بسر ہوا۔ منصور کے بعد اس کی اولاد میں سے پے درپے تین شخص اس کے جانشیں ہوئے، پہلے محمد مہدی دوم موسیٰ ہادی اور پھر تیسرے نمبر پر ہارون الرشید خلیفہ ہوا، ہارون کے بعد اس کا بیٹا امین اور پھر مامون الرشید ابن ہارون الرشید نے مسندِ خلافت کو زینت دی، رشید اور مامون کے عہد میں عباسی حکومت ترقی و عظمت کے اعلیٰ زینہ پر پہنچ گئی اور اس کی قلمرو کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا، اسی مبارک عہد میں علوم و فنون کا نشو و نما ہوا، بہت سی کارآمد کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور دولت و ثروت کے چشمے اس قدر جاری ہوئے جن سے تمام اقلیم سیراب ہو گئی۔ چنانچہ اپنے اپنے موقع پر ہم ان تمام باتوں کو مفصل بیان کریں گے

ایرانی اقتدار

اگرچہ منصور نے ابو مسلم خراسانی کو محض اس خوف سے قتل کرا دیا کہ وہ ذی دسترس کا با اقتدار ہے اور ممکن ہے کہ کسی وقت میں خود ہی حکمران بننے کا قصد کر بیٹھے، تو اس کا تدارک نا ممکن ہو جائے گا۔ لیکن تماشہ یہ ہے کہ منصور ہی نے اپنے عہد میں فارس کے بہت سے لوگوں کو اپنے حاشیہ میں معزز عہدوں پر رکھا تھا۔ منصور کے بعد اس کے جانشینوں نے بھی

اسی کے طریقِ عمل پر قدم رکھا، اور فارس ہی کے رہنے والوں کو اپنے یہاں کے معزز عہدوں پر مقرر کیا، جن مراتب میں سے ایک وزارت کا مرتبہ بھی تھا، اور بنو عباس کے عہد میں یہ سب سے بڑا منصب تھا، اس بات کا نتیجہ یہ ہوا کہ رشید کے زمانہ میں اہلِ فارس کا زور بہت کچھ بڑھ گیا تھا اور وہ لوگ جو وزارت پر قابض ہو کر گویا سلطنت کر رہے تھے، برامکہ تھے، رشید نے یہ دیکھکر کہ وہ لوگ خلیفہ کے ہوتے ہوئے حکومت کے کاروبار بلا اس کی رائے اور صوابدید کے خود ہی کر لینے لگے اُن کو بالکل نیست و نابود کر ڈالا۔ جس کا قصہ مشہور ہے،

ترکوں کا تسلّط

مامون الرشید کے بعد ۲۱۸ھ میں اس کا جانشین "معتصم باللہ" خلافت پر قابض ہوا، اس خلیفہ نے ترکوں کو اپنی سلطنت میں بڑے بڑے مناصب دئیے اور انھیں سلطنت کی بہت سی خدمتوں پر بکثرت مامور کیا، عباسی حکومت کے شروع میں ملک ترکستان کے عاملوں کی جانب سے ترکوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے خلیفہ کے حضور میں نذر کے طور پر پیش ہوا کرتے تھے، اور ہر خلیفہ ان غلاموں کی جماعت میں سے حسین اور گرانڈیل جوانوں کو چن کر اپنے حاشیہ کے لوگوں میں بھرتی کرتا رہتا تھا، جن کا نام "ممالیک" رکھا جاتا تھا،

عجمی غلاموں کی کثرت

اس کے بعد عباسی خلفا نے ایسے ترکی غلام بہت کثرت کے ساتھ خریدنے شروع کئے اور وہ لوگ ان غلاموں کی کثرت کی لحاظ سے اپنے مقابل پر فخر کا اظہار کرنے لگے، یہاں تک کہ معتصم کے زمانہ میں ترکی غلاموں کی تعداد ۲۰ ہزار سے متجاوز ہو گئی۔ ان غلاموں نے مذہبِ اسلام اختیار کر لیا تھا، اور علم ادب سے بھی بہرہ ور ہو چلے تھے، جس کی وجہ سے اُن کی مخفی قوتیں عیاں ہونے لگی تھیں، خلفا نے ان کی قابلیت دیکھکر حکومت کے بہت سے کاروبار بھی ان کو تفویض کرنے شروع کر دئیے تھے، ترکی غلام اپنے اقتدار کے موافق برابر حکومت کے اعلےٰ عہدوں پر ترقی پاتے چلے گئے، حتیٰ کہ امارت اور فوجی خدمت کے بلند ترین منصبوں تک جا پہنچے، جس کی وجہ سے حکمرانی کی کنجیاں حاصل کرنے پر دو ہم پلہ قوتیں یعنی فارسی اور ترکی باہم نزاع رکھنے لگیں، ان میں سے جن کا ہتھے چڑھ جاتا وہ کوئی نہ اعلےٰ عہدہ خلیفہ سے حاصل کر لیتا،

عجمی اقتدار اور اس کے نتائج

خلیفہ معتصم باللہ عباسی نے ملکِ مصر میں

خوف (شرقیہ اور تغلبیہ) کے رہنے والوں سے ایک جماعت بنا کر انہیں اپنی فوج میں بھرتی کیا تھا اور اس کا نام مغربی رکھا تھا؛ ان کے علاوہ سمرقند، اشروسنہ، اور فرغانہ سے بہت سے آدمی اکٹھے کر کے اُن کو بھی فوجی خدمت میں رکھا تھا، اور ان کا نام فراغنہ مقرر کیا تھا جو زیادہ تر اسی حاشیہ میں رہتے تھے، یہ دونوں جماعتیں اُن گروہوں کے علاوہ تھیں جو اس کے یہاں خالص عربی فوجوں سے موجود تھے۔ معتصم کے بعد اور خلفا نے بھی نئے نئے گروہ تیار کئے اور دوسری قوموں کے لوگوں کو اپنے یہاں رسوخ و اقتدار بخشا، جس کے سبب سے سلطنت میں بہت سے مختلف عنصر پیدا ہو گئے۔ اور کام میں رکاوٹ ڈالنے والے اجنبی ہاتھ بکثرت پیدا ہو گئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ خلفا کمزور ہوتے گئے، اور عمال و حکام اپنے اپنے صوبوں اور اقلیموں میں رفتہ رفتہ خود مختار بننے لگے، خلفا کی سلطنت اور حکمرانی کا دائرہ سمٹتے سمٹتے اس قدر تنگ ہوا کہ صرف دجلہ اور فرات کے مابین کا حصہ ملک ان کی قلمرو میں داخل رہ گیا؛ اور ابھی چوتھی صدی ہجری شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ یہ قلمرو بھی ان کے قبضہ اقتدار سے باہر نکل گئی۔ اب محض شہر بغداد خلیفہ کے زیر حکومت تھا، اور اس میں بھی اس کی کامل حکومت نہ تھی؛ چنانچہ نمونہ کے طور پر ہم اسلامی حکومت کے وہ ٹکڑے جو چوتھی صدی ہجری کے پہلے ربع حصہ میں راضی باللہ کے عہد میں ہو چکے تھے ذیل میں دکھاتے ہیں۔

ولایات	اُن کے حکام
	خود مختار حکمراں
بصرہ (عراق عرب)	ابن رائق .. .. کے قبضہ میں
خوزستان	بریدی .. .. "
فارس	عماد الدین بن بویہ .. .. "
کرمان	ابی علی محمد بن الیاس .. .. "
رے۔ اصفہان اور کوہستان ..	رکن الدولہ بن بویہ وغیرہ .. .. "

ولایات	اُن کے حکّام
موصل۔ دیارِ بکر۔ مضر اور ربعیہ	بنی حمدان .. .. .. کے قبضہ میں
مصر اور شام	اخشید .. .. .. "
خراسان اور ماوراءالنہر	سامانی خاندان والوں " "
طبرستان اور جرجان	دیلمیوں .. .. .. "
بحرین اور یمامہ	قرامطہ .. .. .. "

خدّام اور فوج کی دخل اندازی

اور جن اُمور کی وجہ سے معاملاً حکمرانی کی صورت زیادہ نازک ہوگئی اُن میں سے ایک بڑی بات یہ تھی کہ حریم خلافت کے خادموں اور فوجی لوگوں کو قصرِ خلافت میں مطلق العنانی حاصل ہوگئی تھی اور وہ لوگ وہاں بہت سخت درازدستیاں اور گستاخیاں کرنے لگے تھے، طرح طرح سے خلفا کی اہانت اور آبروریزی کرتے، اُنھیں سخت سخت ایذائیں پہنچاتے جس کی ایک مثال ترکوں اور مغربیوں کی فوجوں کا وہ سلوک ہے جو اُنھوں نے ۲۵۵ھ میں خلیفہ معتز باللہ عباسی کے ساتھ کیا اور اُسے خلافت سے علیحدہ کر دیا تھا، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اُس نے ان کے انعام واکرام میں کمی کی تھی، یہ بیباک سپاہی خلیفہ کے کمرہ میں گھس گئے اور اس کے پیر پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لائے، اُسے گرزوں سے خوب مارا اور اس کا کرتہ وغیرہ پھاڑ ڈالا، پھر اُسے چلچلاتی دھوپ میں تپتی ہوزمین پر ننگے پیر اور ننگے بدن کھڑا کر دیا؛ بیچارہ خلیفہ گرمی کی شدت سے زمین پر ایک پیر رکھتا تھا اور دوسرا اٹھاتا تھا، پھر کچھ سپاہی اُسے تھپڑ مارتے رہے جن کو وہ اپنے ہاتھوں سے روکتا تھا، اس ظلم وستم کے بعد اُسے پھر اُس کے کمرہ میں داخل کیا اور ابن ابی شوارب قاضی کو اور بہت سے معزز لوگوں کے ساتھ بلاکر خلیفہ کی معزولی پر گواہ بنایا اور پھر بھی خلیفہ کو رہا نہ کیا بلکہ اُسے ایسے لوگوں کے سپرد کیا جو اُس کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے رہے، تین دن تک اُسے کھانے پینے کو کچھ نہ دیا اور اس کے بعد اُسے ایک تہ خانہ میں ڈالکر اوپر سے پختہ گچ کی ڈاٹ لگادی جس کے اندر اس مظلوم ستم رسیدہ حکمران نے عالم بیکسی میں جان دی۔

اگرچہ خلفا کی حالت اس قدر ردّی ہوگئی تھی کہ ادنے سپاہی تک اُنہیں ہر طرح کے رنج والم

پہنچا دیتا تھا، . . . .

لیکن بایں ہمہ ضعف و خواری فارس والوں، ترکوں، مغربیوں اور فرغانہ کے باشندوں میں سے کسی کے دل میں یہ خیال تک نہ آسکا کہ بنی عباس کے قابو سے خلافت کو نکال لیں، خیر مذکورہ بالا لوگ تو عجمی الاصل تھے ان کو اس کی ہمت نہ ہوئی تو تعجب بھی نہیں، لیکن خاص ان اہلِ عرب کو بھی جو خاندانِ قریش کے علاوہ تھے، اس امر کی جرأت نہ پڑی۔

حملۂ تاتار

عباسی خلافت بغداد میں اُس وقت تک برابر قائم رہی جس وقت کہ چین کے صحراؤں سے تاتاری قوم نے آکر اُسے فتح کیا ہے۔ اور اُس کے خلیفہ کو قتل کیا ہے۔ یہ واقعہ ۶۵۶ھ میں پیش آیا تھا، اُس وقت خاندانِ خلیفہ کے لوگ جو تاتاریوں کی بے پناہ تلواروں سے بچے رہے تھے ملکِ مصر کو بھاگ گئے۔ اور انھوں نے وہاں کے پادشاہوں کے پاس جو اُمرا ممالیک کے سلسلے سے تھے پناہ لی۔ سلاطینِ مصر نے اُنھیں بہت اعزاز و اکرام سے اپنے یہاں جگہ دی اور ان کو بدستور خلیفہ سمجھتے اور ویسے ہی عزت و حرمت کرتے رہے، یہاں تک کہ جس زمانہ (۹۲۳ھ) میں سلطان سلیم عثمانی نے ملکِ مصر کو فتح کیا تو اس نے عباسی لوگوں سے خلافت بھی لے لی، عباسی خلفاء کی تعداد پچاس سے بھی زائد کئی شخصوں تک پہنچی تھی، جس میں سے سینتیس نے خاص عراق میں حکومت کی ان لوگوں میں پہلا شخص سفاح بانیٔ خلافتِ عباسیہ اور پچھلا شخص معتصم باللہ تھا۔ اور باقیماندہ لوگ مصر میں گذرے۔ لیکن خلفائے مصر محض نام کے خلیفہ ہوتے تھے، اور اُن کا یہ عہدہ ایک دینی حیثیت سے قابلِ احترام تھا؛ ورنہ دنیاوی حکومت سے انھیں کچھ تعلق نہ رہا تھا؛



اُندلس میں اموی حکومت

مسلمانوں میں سب سے پہلے جو شخص اُندلس میں داخل ہوئے وہ دو آدمی تھے، پہلا طارق بن زیاد اور دوسرا موسیٰ بن نصیر، ان دونوں نے ۹۲ھ کے زمانہ میں جبکہ ملکِ شام میں اموی حکومت اپنے پورے عروج پر تھی اُندلس کو فتح کیا تھا، اور اُس وقت سے سلطنتِ بنو اُمیہؓ کے قیام اور اُس کے کبھی قدر بعد تک بہت سے امیروں نے خلفائے بنو اُمیہ کی جانب سے وہاں حکومت کی تھی، بنو عباس کو خلافت ملی تو ابو العباس سفاح نے اموی لوگوں کا اس قدر قتل عام کیا کہ توبہ ہی بھلی۔ جوان، بوڑھا، عورت، بچہ، جو ملتا وہی بے محابہ ہلاک کر دیا جاتا تھا، گویا اس وقت بنو امیہ پر پناہ پانے کا دروازہ بند تھا، یوں تو بظاہر تمام بنو امیہ قتل ہو چکے تھے، مگر ایک جوان عبدالرحمٰن نامی جو معاویہ بن ہشام بن عبدالملک کا بیٹا تھا، کسی طرح بچکر ملکِ مغرب کو بھاگ گیا تھا، وہاں سے دریا کو عبور کر کے اُندلس جا پہنچا، اندلوں اندلس پر عبدالرحمٰن بن یوسف فہری نامی امیر حکمراں تھا، اموی شہزادہ نے اُسے علیحدہ کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور تھوڑے دنوں تک سفاح کے نام کا خطبہ پڑھتا رہا، اس کے بعد عباسیوں نے اُسے معزول کر دیا، جس کے جواب میں عبدالرحمٰن نے بھی ان کا خطبہ پڑھنا بند کر کے ۱۳۸ھ میں خود ہی حکومت کا دعوای کر دیا اور قرطبہ کو اندلس کا پایۂ تخت قرار دے کر نہایت پرزور سلطنت قائم کر لی، عبدالرحمٰن مذکور کے بعد ۳۱۶ھ تک بہت سے امیر اس کے جانشین ہوئے جو اپنے تئیں امیر ہی کے لقب سے ملقب کیا کرتے تھے، مگر ۳۱۷ھ میں جبکہ اُندلس کی حکومت عبدالرحمٰن سوم کے قبضہ میں آ گئی اُس نے اپنے تئیں خلیفہ کے نام سے مشہور کیا، اور وہ اُن خلفائے بنو اُمیہ میں جو اندلس میں گذرے ہیں سب سے بڑا خلیفہ تھا، عبدالرحمٰن سوم نے کئی مرتبہ اہلِ فرنگ سے معرکہ آرائیاں کیں، اور انھیں بڑی فاش شکستیں دیں، اُس کے مرنے کے بعد کئی اور خلیفہ ہوئے لیکن ان میں ایک بھی اُس کا ہمسر ہو سکا

پانچویں صدی میں ملک اُندلس کئی گروہوں میں منقسم ہوگیا۔ اور ہر گروہ پر ایک علیحدہ رئیس تھا۔ ان رئیسوں میں سب سے بڑے رئیس عباد تھے، جو اشبیلیہ کے عرب تھے، اس کے کچھ عرصہ بعد الفیس عباد کے ہاتھوں میں اُندلس کی عام حکومت آگئی۔ اور چونکہ فرنگ والوں سے جنگ و جدل رہا کرتی تھی اسلئے ان کو مغرب کی حکمران اقوام مرابطین سے مدد لینے کی ضرورت پیش آئی تاکہ ان کو اپنا شریک کرکے اہلِ فرنگ کو دفع کرسکیں۔ مغربی لوگ اندلس میں آئے تو اس ملک کی سرسبزی دیکھکر خود ان کے مُنہ میں پانی بھر آیا، اور کچھ ہی عرصہ کے بعد انھوں نے اسے فتح کرکے اپنی ماتحت ولایت (صوبہ) بنالیا۔ اس کے بعد پے درپے اندلس کے ملک پر مختلف حالتیں گذریں، جو اسکا زور گھٹاتی گئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۹۲ء میں اس پر اہلِ فرنگ کا پورا تسلّط اور مسلمانوں کی حکومت کا وہاں سے کلیتہً خاتمہ ہوگیا؛

اسلامی تاریخ میں اندلس کو بہت کچھ شان و شوکت حاصل ہے۔ اسی کی خاک سے بڑے بڑے علماء اور اہلِ کمال شعراء پیدا ہوئے جن کے علوم و فنون اور تصانیف سے آج کل کی متمدن دنیا میں بڑے بڑے فائدے حاصل کئے جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے اس ملک میں بہت سے مدرسے، کتب خانے قائم کئے، عظیم الشان محل اور عجیب و غریب عمارتیں بنوائیں۔ جن کی تفصیل ہم موقع بموقع بیان کریں گے؛

مصر میں فاطمی حکومت کا دور

اس حکومت کا نشو و نما بلادِ مغرب میں ہوا؛ یہ خاندان حضرت جعفر صادقؓ کے واسطے سے فاطمہؓ بنتِ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی جانب منسوب ہوتا ہے، اس گھرانے کے خلفاء میں سب سے اوّل جو شخص علانیہ دعوت کرنے اٹھا وہ عبید اللہ المہدی تھا جس نے تیسری صدی ہجری کے آخری حصہ میں خلیفہ ہونے کا دعویٰ کیا، اور اسی لحاظ سے اس سلطنت کو عبیدیہ بھی

سکتے ہیں چوتھی صدی ہجری کے وسط میں ۳۵۸ھ جوہر کے ہاتھوں مصر پر بھی ان کی حکومت کا سکہ جم گیا۔ اس سے پہلے ملک مصر عباسیوں کے تصرف میں تھا لیکن جوہر نے اُسے فتح کر کے بعد بنو فاطمہ کے قبضہ میں دیدیا، اور ۳۶۰ھ میں اس پر کامل تسلط کر کے قاہرہ کا عظیم الشان شہر تعمیر کرایا جو آج تک قائم ہے۔ ابتدائی نام "قاہرہ معزیہ" رکھا گیا تھا۔ جس کی نسبت خلفائے بنو فاطمہ میں سب سے اوّل ملک مصر میں آنیوالے خلیفہ "المعز الدین اللہ" کی جانب کی گئی تھی۔ معز الدین اللہ کے بعد اس کے کئی جانشین حکمران ہوئے اور سب ہونے لوبت بہ نوبت بہت استقلال کے ساتھ فرمانروائی کی، یہاں تک کہ ان کو بھی اسی بلا میں مبتلا ہونا پڑا جسمیں خلفائے بنی عباس غیر قوموں مثلاً کردوں اور ترکوں کو دخیل کار بنانے سے مبتلا ہو چکے تھے۔ بنی فاطمہ کے بعد ۵۶۷ھ میں مصر کی حکومت مشہور سلطان صلاح الدین ایوبی کے قابو میں آگئی۔ حکومت بنو فاطمہ کی بہت بڑی بڑی یادگاریں اب تک ملک مصر میں موجود ہیں۔ جو زبان حال سے اپنے بانیوں کا جاہ و جلال ظاہر کر رہی ہیں، ان یادگاروں میں سے ایک تو خود قاہرہ کا شہر شاندار ہے، اور ازہر کی یونیورسٹی بھی بہت بڑی یادگار ہے۔ صلاح الدین کے بعد اس کے بیٹے اور بھائیوں نے بھی عرصہ تک مصر پر حکمرانی کی اور اس خاندان کے زوال پذیر ہونے پر سلاطین مملک کا دور دورہ رہا، یہاں تک کہ ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم خاں عثمانی نے مصر کو فتح کیا؛

اسلامی حکومتوں کی تعداد

جس قدر اسلامی حکومتیں دنیا میں قائم ہوئیں اگر ہم ان سب کو ایک ایک کر کے گنائیں تو بہت طوالت ہو جائے گی، لہٰذا اس وقت ان کا مختصر ذکر کافی ہوگا۔ ہم نے سال چہارم الہلال نمبر ۲ میں ایک جدول شائع کی تھی جس میں تمام اسلامی سلطنتوں کو بیان کر دیا تھا۔ ان کے دارالسلطنتوں اور حکمرانوں کی تعداد معہ مدت حکمرانی اور سنہ جلوس و وفات بھی ذکر کر دی تھی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آغاز اسلام سے اس وقت تک جتنی اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں ان کی کل تعداد ۱۰۴ ہے اور ان کے حکمرانوں کی مجموعی تعداد (۱۱۹۵) جنمیں خلفاء، سلاطین، ملوک، امراء، اتابکر اخشیدیہ، خدیوی لوگ، شرفاء، بائے لوگ اور دائے لوگ وغیرہ سب شامل ہیں؛ خواہ وہ اہل عرب سے ہوئے ہوں، یا فارسیوں، ترکوں، چرکسوں، کردوں، ہندیوں، تاتاریوں، مغلوں اور افغانوں وغیرہ میں سے، اور ان کے پایۂ تخت حسب ذیل مقام رہ چکے ہیں۔ مدینہ، کوفہ، شام

بغداد، مصر، قیروان، قرطبہ، آستانہ، صنعا، عمان اور دہلی وغیرہ۔

اسلامی تمدن کی تاریخ جو آگے چل کر بیان ہوگی اس کی تمہید میں اس مقام تک تاریخی مقدمات لکھے گئے جن سے اسلامی حکومت کی بنیاد پڑنے اور اسلامی تمدن کے نشو و نما پانے کا حال کھلیگا، یہ بات تو دیکھ ہی لی گئی ہے کہ مسلمانوں نے بہت سی حکومتیں قائم کیں، جو مختلف زمانوں تک تمدن کا رنگ دکھاتی رہیں مگر چونکہ عباسی حکومت ان سبھوں میں بہت مشہور اور اصول تمدن کے اختیار کرنے میں ان سبھوں پر شدیدست تھی اسلئے اگلے بیان میں ہم اکثر بغیر تصریح کے وہی امور بیان کرینگے جو عباسی سلطنت کے ساتھ مخصوص تھے اور جنھیں اسلامی تمدن میں قوت ظاہر حاصل ہے۔

اسلامی حکومت اور اُس کی مردم شماری

پچھلے واقعات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ کہ جس وقت میں مسلمانوں کی تعداد دو ہزار سے اوپر نہیں ہوئی تھی اور مدینہ کی شہر پناہ ہو سے باہر کی زمینیں بھی ان کے ملک میں نہیں تھیں؛ اور صحابہ کے علاوہ ہر شخص ان کا دشمن تھا؛ ایسی حالت اور سلسلہ میں مدینہ کے اندر اسلامی حکومت کی بنیاد پڑی اس سلطنت کی حدود یثرب اور اس کے بعض مقامات سے گھری ہوئی تھیں، ان دنوں دارالامارت اور دارالقضا (مسجد نبوی صلے اللہ علیہ وسلم تھی، یا نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کا حجرہ یا صحابہ کے مکانات، سنہ ھ تک اسکی یہی حالت رہی جس کے بعد مسلمانوں نے بنی نضیر کی اراضیاں بھی اس میں اضافہ کر دیں اور اس کے بعد آنیوالے برس میں خیبر کی زمین بھی اسلامی قلمرو میں شامل ہوگئی؛ اور زمانہ مابعد میں رفتہ رفتہ مقامات فدک، وادی القریٰ اور تیما بھی مملکت اسلام میں شامل ہو گئے؛ اس کے بعد مسلمانوں نے مکہ کو فتح کیا؛ اور اسی کے ضمن میں چھوٹے مقامات طائف؛ بنالہ؛ اور جرش پر بھی قبضہ کر لیا، بعد ازاں شمالی سمت میں تبوک اور ایلہ تک اور جنوبی جانب میں نجران، یمن، عمان، بحرین اور یمامہ تک پے درپے فتوحات حاصل کرتے ہوئے اسلامی حدود ملک کو ترقی دیتے گئے۔

سنہ ۱۱ھ میں جب نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دنیا سے رحلت فرمائی؛ اس وقت اسلام کی سطوت تمام جزیرہ عرب پر سایہ ڈال چکی تھی، اور خود نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اپنی مملکت کو شمالی سمت میں تبوک اور ایلہ سے لیکر جنوب میں سواحل یمن تک اور مشرق کی طرف خلیج فارس سے شروع ہو کر مغربی سمت میں بحر قلزم تک وسیع دیکھ لیا تھا۔

حضرت ابوبکر حکمران ہوئے اور مرتدوں کے جھگڑے سے فراغت پائی تو انھوں نے عراق اور شام کو فتح کرنے کے لئے فوجیں روانہ کیں اور عمر بن الخطاب نے ان دونوں ملکوں کی فتح کا تکملہ کیا جس کے ساتھ ہی مصر کو بھی قبضہ میں لے آئے، اسلامی فتوحات کا زیادہ تر حصہ صرف انھیں خلیفہ دوم کے ہاتھوں انجام پایا۔ عمر رضی کے جانشین عثمان رضی ہوئے اور انھوں نے بھی کئی جدید ممالک فتح کئے، لیکن ان کے شہید ہونے کے بعد مسلمان لوگ فتوحات سے غافل ہو کر اس باہمی فساد میں مبتلا ہو گئے جو عثمان کے قتل ہو جانے کے بعد ان میں پھوٹ پڑا تھا۔ یہاں تک کہ جس وقت خلفائے راشدین کا مبارک عہد ختم ہو گیا تو معاویہ رضی نے عنانِ خلافت اپنے ہاتھ میں لی، اس زمانہ میں مصر، شام، نوبہ، افریقہ، عراق، فارس، آذربائیجان، آرمینیہ، جرجان، طبرستان، اور اہواز وغیرہ ممالک پر اسلامی پھریرا اُڑ رہا تھا۔

اسلامی صوبے

خلیفہ کا قیام مدینہ یا (کوفہ) میں رہا کرتا تھا اور وہ اپنے عاملوں کو ولایتوں کی جانب بھیجا کرتا تھا، اس زمانہ میں اسلامی مملکت کا سب سے بڑا صوبہ ملک شام تھا جس کے ماتحت حمص، قنسرین، اردن، فلسطین اور سرحدوں کے اخبار (چھاؤنیاں) تھے، اس کے بعد عراق کا ملک تھا جس کا سب سے بڑا صوبہ سواد کا علاقہ تھا یعنی وہ خطہ زمین جو دجلہ اور فرات کے مابین واقع ہے اور اس کا پایہ تخت کوفہ تھا جو نہر فرات کے کنارہ پر ایک عظیم الشان شہر ہے۔ سواد کے علاوہ۔ بصرہ، قرقیسیہ، رے، اصفہان، نہاوند، آذربائیجان، حلوان، حمدان، اور ماذوان وغیرہ بھی علیحدہ علیحدہ صوبے تھے، عرب کے صوبے مکہ۔ طائف، عمان بحرین اور صنعا تھے، اور براعظم افریقہ میں مصر معہ اپنے ماتحت مقامات افریقہ کے مثلاً بلاد مغرب اور نوبہ جو وادی نیل کی بلندی میں ہیں ایک جداگانہ ملک تھا، خلفا کا قاعدہ تھا کہ ملک شام کے سوا اور مقامات پر اپنی طرف سے براہِ راست مدینہ ہی سے عامل مقرر کر کے بھیجا کرتے تھے؛ اور ملک شام کا عامل خود دمشق میں رہتا تھا؛ اور اپنی ماتحت ولایتوں اور چھاؤنیوں میں اپنی طرف سے عاملوں کا تقرر کرتا تھا۔

عمر بن الخطاب کے زمانہ میں معاویہ بن سفیان رضی ملک شام کے عامل بنائے گئے۔ ان کی امارت خلفائے راشدین کے آخری زمانہ تک برابر قائم رہی، اس کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو خلیفہ بنا کر مرکز خلافت دمشق میں منتقل کر لیا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ عرب کے تمام ملک نے معاویہ کی بیعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی؛ اور وہاں کے رہنے والے علی رضی اور ان کی بیعت پر قائم تھے حسین رضی کے شہید ہو جانے کے بعد یہ جزیرہ بنو امیہ کے

قابو میں نہیں آیا، بلکہ عبداللہ بن زبیر کے زیر اثر رہا، یہاں تک کہ حجاج بن یوسف ثقفی نے عبدالملک بن مروان کے عہدِ خلافت یعنی ۷۲ھ میں اُن کو قتل کر ڈالا جس کے بعد یہ جزیرہ بھی بنو اُمیہ کے سلطنت میں شامل ہو گیا۔

اموی حکومت کی وسعت بنو اُمیہ کے زمانہ میں اسلامی قلمرو بہت وسیع ہو گئی۔ انھوں نے مغرب کی جانب اندلس اور تمام مغربی ملک کو فتح کر لیا تھا، بنو اُمیہ اسپین کی طرف سے یورپ میں داخل ہوئے اور بڑھتے چلے گئے۔

فرانس پر حملے یہاں تک کہ انھوں نے کوہِ پیرینیز کو عبور کر کے مملکتِ فرانس پر حملے کئے اور اس میں داخل ہوئے، اہلِ عرب فرانس کے ملک میں بڑھتے بڑھتے ۱۱۴ھ میں دریائے رون تک پہنچ گئے تھے اہلِ فرنگ غنیم کی چیرہ دستی دیکھکر کانپ اُٹھے، اُنھیں یہ خوف پیدا ہوا کہ مبادا ہم کو بھی وہی روز بد دیکھنا نصیب ہو جو اسپین کو دیکھنا پڑا ہے؛ لہٰذا انھوں نے اپنی پوری قوت کیساتھ اہلِ عرب کی مدافعت میں زور لگایا، اور فریقین میں تورس اور ریواکتیہ کے مابین کئی سخت خونریز لڑائیاں ہوئیں اور کئی دنوں تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا؛ اس عرصہ میں لڑائی کی صورت متذبذب رہی، کبھی اہلِ عرب کا پلہ بھاری رہتا تھا اور کبھی فرانس والے غالب آجاتے تھے، اس جنگ کے حالت میں بجز چند مختصر اشارات کے اور کوئی تفصیل امور نہیں بیان کئے گئے ہیں، ہاں اہلِ فرنگ نے خود ان واقعات کا مفصّل حال لکھا ہے؛ جس میں موقع بموقع اہلِ عرب کی دلیری اور ہمت کو ظاہر کیا ہے؛ اور اس کے معترف ہوئے ہیں؛ یہ جنگ مشہور فرانسیسی سپہ سالار "شارل مارٹل" کے عہد میں ہوئی تھی، جو کہ امپرور شارلمین کا دادا تھا، فرانس کے مؤرخوں نے بہت سی ہولناک لڑائیوں کا تذکرہ کیا ہے جو مذکورہ بالا شارل اور اہلِ عرب کے مابین ۷۳۲ء میں ہوئیں اور اہلِ عرب کے اسپین کی جانب پسپا ہونے اور ان کے سپہ سالار عبدالرحمٰن کے شہید ہونے پر رک گئیں۔ تاریخ ابن اثیر میں لکھا ہے کہ اندلس کا امیر عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی ۱۱۴ھ (قریباً ۷۳۲ء مسیحی) میں ممالکِ فرنگ کی طرف جہاد کرتا ہوا بڑھا تھا مگر وہ معہ اپنے ساتھی مجاہدین کے شہید ہوا اس لئے زیادہ راجح خیال یہی ہوتا ہے کہ شارل مارٹل مذکور نے اس فوج سے جنگ کی تھی؛

حملۂ فرانس کے اثرات اس بارہ میں جو باتیں اعتبار اور تامل کی مقتضی ہیں منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر اہلِ عرب اس لڑائی میں کامیاب ہو جاتے تو

اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ فرانس میں اسلام پھیل گیا ہوتا۔ اور اس کے بعد تمام یورپ میں اس کی اشاعت ہو کر رہتی کیونکہ ان دنوں اہلِ فرانس ہی یورپ بھر میں سب سے زیادہ عربوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ جس طرح تمام عالم اسلامی اور برّاعظم ایشیا و افریقہ کے اکثر حصوں کے باشندوں کی زبان عربی سُننے میں آتی ہے ویسے ہی آج برّاعظم یورپ کے رہنے والوں کی زبان بھی عربی ہی ہوتی۔ لیکن خداوند پاک کی حکمتیں جو اس نے اپنی مخلوقات میں رکھی ہیں ایسی ہیں جن کو انسانی عقلیں نہیں پا سکتیں۔ خدا جانے اہلِ عرب کی اس ناکامیابی میں کیا راز تھا۔

شارل مارٹل کی لڑائی عربوں کے ساتھ تور اور پوائیٹیرز کے مابین



اسلامی مملکت کی تقسیم

اموی خلیفوں کی فتوحات کا سلسلہ بلادِ فارس اس کے بعد خراسان اور پھر دیگر ممالک میں جاری رہا، یہاں تک کہ وہ ہندوستان کی حدود تک پہنچکر رُک گیا، بنی اُمیہ کے زمانہ میں اسلامی قلمرو کی جو تقسیم تھی اُس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ شام - اس کے چار صوبے (یا گورنریاں) تھیں۔

(۲) کوفہ (۶) مدینہ ؛

(۳) بصرہ جو کہ فارس، سجستان بحرین اور عمان پر مشتمل تھا؛ (۷) افریقیہ ؛

(۸) مصر ؛

(۴) آرمینیا ؛ (۹) یمن ؛

(۵) مکہ ؛ (۱۰) خراسان ؛

اور جس وقت خلافت بنو عباس کے ہاتھوں میں پہنچی ہے۔ اس وقت ولایات (صوبجات) کی ترتیب مندرجہ ذیل صورت پر ہو گئی تھی؛

۱۔ کوفہ اور سواد ؛ ۲۔ بصرہ اور مہرجان قباد ؛ کنارہ دجلہ تک اور وہ حصہ ملک جو دجلہ کے اس پار بحرین اور اس کے بعد عمان تک چلا گیا ہے ؛ ۳۔ حجاز اور یمامہ ؛ ۴۔ یمن ؛ ۵۔ اہواز (خوزستان اور سوز یانہ) ۶۔ فارس ؛ ۷۔ خراسان ؛ ۸۔ موصل ؛ ۹۔ جزیرہ (مابین النہرین) آرمینیا ۱۰۔ شام، ۱۱۔ مصر اور افریقیہ ۱۲۔ ملک سندھ۔ حدود ہند میں ؛ ۱۳۔ اندلس ؛

عباسی سلطنت کے حدود عباسیوں کے عہد میں مملکت اسلامی کا دائرہ بہت کچھ وسیع ہوا، یہاں تک کہ عہد اسلام میں آج تک جتنی وسعت اسلامی قلمرو کو حاصل ہوئی ہے وہ سب سے زیادہ اُن کے عہد میں تھی، اس کا کچھ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ بعض بعض صوبے عباسیوں کی حکمرانی سے خارج ہو کر خود مختار بن گئے تھے، مثلاً اندلس جبکہ بنو امیہ اس کے مالک بن بیٹھے یا کچھ دوسرے صوبے خود سر ہو گئے ؛ مثلاً طاہری سامانی ؛ اغلبی اور طولونی وغیرہ حکومتیں ؛ اگرچہ یہ خود سر حکمران تھے ؛ لیکن سب لوگ خطبہ عباسی خلیفہ کا ہی پڑھتے تھے، ایک اندلس تو ضرور اس کلیہ سے خارج تھا، مگر ہمارے خیال میں کتنی ہی جداگانہ حکومتیں کیوں نہ رہی ہوں، پھر بھی اسلامی سلطنت تو بہر حال تھی ؛ اور مسلمان لوگ اس پر حکمران، عباسی مملکت کے حدود شمال میں ترکستان کے بالائی حصہ تک ایشیا مائنر اور کوہستان پرینیز تک سپین میں، جنوب میں بحر عرب، بحر اعظم ہندوستان اور صحرائے افریقیہ تک، مشرق میں ملک سندھ اور پنجاب تک ملک ہندوستان میں اور مغرب میں بحر اطلانٹک اوشن تک پھیلی ہوئی تھیں، اور اس کا رقبہ یورپ کے رقبہ سے دوگنا تھا؛

صوبوں کے نام اس وسیع سلطنت کی عظمت کا بیان کرنے کے لئے ہم پہلے اس کے صوبوں کے

نام ذیل میں لکھتے ہیں۔ اور بعد ازاں مقدار بیان کریں گے۔

۱	سواد	۱۱	بصرہ	۲۲	جرجان	۳۳	دیار مضر
۲	اہواز	۱۲	ہمذان	۲۳	طبرستان	۳۴	طریق فرات
۳	فارس	۱۳	ماسبذان	۲۴	تکریت	۳۵	قنسرین اور عواصم
۴	کرمان	۱۴	مہرجان قذق	۲۵	شہرزور	۳۶	حمص
۵	مکران	۱۵	الیغارین	۲۶	صامغان	۳۷	دمشق
۶	اصفہان	۱۶	قم اور کاذان	۲۷	موصل	۳۸	اردن
۷	سجستان	۱۷	آذربائجان	۲۸	دیار ربیعہ	۳۹	فلسطین
۸	خراسان	۱۸	رے	۲۹	ازرن اور میافارقین	۴۰	مصر
۹	حلوان	۱۹	قزوین	۳۰	طرون	۴۱	حرمین
۱۰	کوفہ	۲۰	زنجان	۳۱	آرمینیا	۴۲	یمن
		۲۱	قومس	۳۲	آمد	۴۳	یمامہ اور بحرین
						۴۴	عمان

صوبوں کا نظم و نسق

عباسی مملکت اسلامیہ کے اتنے صوبے تھے اور یہ اندلس کی سلطنت سے علاوہ ہیں۔ جس کے حکمران بنی امیہ تھے، اندلس کی اموی حکومت عباسی سلطنت کی ہمعصر تھی اور اس نے بحر متوسط کے کئی جزیرے مثلاً سسلی اور مالٹا وغیرہ بھی فتح کر لئے تھے، مذکورہ بالا صوبجات میں سے ہر ایک صوبہ کا ایک والی (گورنر) یا عامل (حاکم) ہوا کرتا جسے خلیفہ یا اُس کا وزیر یا نائب مقرر کیا کرتا تھا؛ جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا؛ ابتدائی اعمال کی جنھیں آج کل صوبے کہتے ہیں۔ کل تعداد ۴۴ صوبوں تک پہنچی تھی؛ اور ہر ایک صوبہ کا ایک خزانہ (بیت المال) ایک دیوان خراج اور ایک یا اس سے زائد قاضی ہوتا تھا، اس سلطنت کے رہنے والے لوگ اس زمانہ کی متمدن قوموں میں سب سے بڑھے ہوئے تھے جن میں عرب اہل فارس، ترک، مغل، کرد، تاتاری، افغان، ہنود، ارمن، سریان، کلدان، روم، گاتھ، قبطی، نوبی اور بربری وغیرہ قومیں شامل ہیں اور عربی، فارسی، پہلوی، ہندی، رومی، سریانی، ترکی، کردی، ارمنی، قبطی، اور بربری زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان باشندوں میں سے بعض اس قسم کے تھے

کہ ان کی اصلی زبان بالکل نیست و نابود ہو کر عربی ان کی مادری زبان بن گئی تھی؛ جیسے شام، مصر اور مغرب و عراق کے رہنے والے لوگ اور بعض ایسے تھے کہ ان کی اصلی زبانوں میں عربی زبان کے الفاظ کثرت کے ساتھ مل جل گئے تھے؛ مثلاً فارسی، ترکستانی، ہندوستانی اور افغان وغیرہ اور آج تک ایشیا کی بہت سی قومیں اس عظیم الشان تمدن کے اثر سے اپنی زبانوں کو عربی خط میں لکھتی ہیں؛

اسلامی قلمرو کی مردم شماری

اس موقع پر ہم کو اس سلطنت کی ان دنوں کی مردم شماری پر غور کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بات ہماری طاقت سے ہے ذرا بالاتر؛ کیونکہ اہل عرب کو اپنی مملکت کے رہنے والوں کی مردم شماری کرنے کا خیال نہ تھا، البتہ ہم ان صوبوں کی آج کل کی مردم شماری پر غور کرتے ہیں اور ان اعداد کو ان مقامات کے مقابل لکھ کر اس بات کا ذکر کرتے ہیں وہ مقامات کس حکومت کے ماتحت ہیں، اس کے بعد ہم اس کا آج کل کی حالت سے مقابلہ کریں گے۔

موجودہ حکومتیں اور آبادی

ملکوں کے نام	آج کل کس حکومت کے تحت ہیں	ان کی آبادی
تمام ملک ایران؛	شاہ عجم	۹۰۰۰۰۰۰
افغانستان؛	خود مختار	۴۰۰۰۰۰۰
بلوچستان؛	انگلستان	۵۰۰۰۰۰
سندھ؛	"	۳۰۰۰۰۰۰
ترکستان	روس	۴۰۰۰۰۰۰
کارکیشیا (قوقاسیا)	"	۵۰۰۰۰۰۰
اربینیا اور کردستان	ٹرکی	۲۵۰۰۰۰۰
عراق } جزیرہ	"	۲۵۰۰۰۰۰
شام } فلسطین	"	۲۷۱۱۰۰۰

ملکوں کے نام	آج کل کس حکومت کے ماتحت ہیں	ان کی آبادی حال
جزیرہ عرب	ٹرکی	۵۰۰۰۰۰۰
ممالک مصر	"	۱۰۰۰۰۰۰۰
نوبیہ اور کچھ حصہ سوڈان کا	سوڈان[1]	۱۰۰۰۰۰۰
طرابلس الغرب	ٹرکی	۱۰۰۰۰۰۰
جزائر عرب	فرانس	۴۴۲۹۰۰۰
ٹونس	"	۱۵۰۰۰۰۰
مراکو	خود مختار	۹۰۰۰۰۰۰
سپین	"	۱۷۰۰۰۰۰۰
قبرس	انگلستان	۲۰۹۰۰۰
کریٹ	ٹرکی	۲۹۴۰۰۰
میزان کل		۷۲۶۴۳۰۰۰

گزشتہ اور موجودہ شہروں کا فرق

یہ تو آج ان ملکوں کی مردم شماری ہے مگر بہت ایسے اسلامی شہر ہیں جو اس وقت بمقابلہ اس حالت کے جو انھیں اسلامی عہدِ حکومت میں حاصل تھی گویا بالکل ویران اور تباہ ہو چکے ہیں۔ اور خاصکر ملکِ عراق یا وہ حصہ جو سواد کے نام سے مشہور ہے اور اسمیں بھی بخصوص طور پر بغداد، بصرہ، کوفہ اور تمام ملکِ عراق کے شہر۔ اصطخری نے شہر بصرہ کی ایسی حالت بیان کی ہے جسے مطالعہ کرنے سے عقل چکرا جاتی ہے۔ ہم اس زریں زمانہ میں ملکِ عراق کی حالت کا نقشہ کھینچنے کی غرض سے اس عبارت کو ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بصرہ قدیم زمانے میں بصرہ ایک بہت بڑا شہر ہے جو اہل عجم کے زمانہ میں نہ تھا، اُسے صرف اہل عرب نے آباد کیا ہے اس میں کوئیں وغیرہ کا پانی نہیں ملتا۔ بلکہ نہریں ہی

[1] جسکی ایک عظیم الشان اسلامی حکومت کا خاتمہ ابھی ہی ہوا ہے، یعنی سلطان سکوٹو کے مقبوضات کو سرکار انگلشیہ نے فتح کرلیا۔

نہریں ہیں، بعض اہلِ اخبار نے لکھا ہے کہ بلال بن ابی بردہ کے زمانہ میں بصرہ کی نہروں کا شمار کیا گیا تھا
تو ایک لاکھ بیس ہزار نہروں سے زیادہ نکلی تھیں جن میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں چلا کرتی تھیں، مجھکو اس
مذکورہ تعداد کے صحیح ماننے میں کلام تھا، یہاں تک کہ میں نے خود ان مقامات کو جا کر دیکھا، پس
بسا اوقات صرف ایک تیر پرتاب کی مسافت میں کئی چھوٹی چھوٹی نہریں دیکھیں جن میں چھوٹی
کشتیاں چلتی تھیں، اور ہر ایک نہر کا ایک نام تھا، جس کے ساتھ یا تو وہ اپنے کھدوانے والے کی
طرف منسوب ہوتی تھی یا اس سمت کی جانب جدھر کو بہہ کر وہ گرتی تھی، پھر میں نے اپنے دل میں
تجویز کی کہ یہ نہر اس قدر مسافت کے طول و عرض میں رہی ہوگی۔ لہٰذا آپ اس مسافت کا
خیال کر لیں جس میں (۱۲۰۰۰۰) نہریں یا نالیاں کھد سکتی ہیں کہ وہ کس قدر ہو گی، اور
اس کے اندر رہنے والوں کی تعداد کتنی ہو سکتی ہے۔

بغداد کی گزشتہ حالت یہ حالت تو بصرہ کی تھی، اب بغداد کی طرف توجہ کیجئے جو کہ دار الخلافت اور دار السلام تھا، اس کی حالت کا
بھی اسطخری نے ان الفاظ میں خاکہ کھینچا ہے، جیسا کہ خود اس نے اپنے زمانہ ہجری کی چوتھی صدی
میں معائنہ کیا تھا، وہ لکھتا ہے۔ ولفرش قصور الخلافة[1] وبساتینها من بغداد الی
نهر بین فرسخین علی جدار واحد حتی تتصل من نهر بین الی شط دجلة ثم
یتصل البناء بدار الخلافة مرتفعا علی دجلة الی الشماسیة نحو خمسة امیال
ویحاذی الشماسیة فی الجانب الغربی الحربیة فیمتد نازلا علی دجلة الی آخر
الکرخ الخ پھر لکھتا ہے وبین بغداد والکوفة (ا ربین دجلة والفرات) سواد
مشتبك غیر ممیز تخترق الیه انهار من الفرات، اس کے بعد ان نہروں کی تعداد
لکھی ہے جو دجلہ سے نکال کر فرات میں گرائی گئی تھیں۔

---

[1] دار الخلافت کے محلات اور باغات بغداد سے نہر بین کی طرف ایک قطار میں دو فرسخ تک برابر چلے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ نہر بین
پر جا کر وہاں سے دریائے دجلہ کے کنارے پھر یہ عمارتیں اوپر کو ہوتی ہوئی شماسیہ کی طرف جو قریباً پانچ میل کے فاصلہ
پر ہے دار الخلافت سے جا ملتی ہیں اور شماسیہ مغرب کی طرف مقام حربیہ کے محاذ میں واقع ہے، پھر یہ بستی دجلہ
کی طرف اترتی ہوئی کرخ کے پرلے سرے تک پھیلتی چلی گئی ہے، اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اور بغداد و کوفہ
(یا دجلہ و فرات) کے درمیان بڑی گنجان آبادی ہے جس میں کچھ تمیز نہیں ہوتی اور دریائے فرات سے چھوٹی
چھوٹی کر بہت سی نہریں اس کی طرف آتی اور سیراب کرتی ہیں۔

پس خیال کرنا چاہیئے کہ مذکورہ بالا آبادی کا اس حالت سے کب مقابلہ ہو سکتا ہے جو آج کل بغداد کی ہے اس لئے کہ موجودہ حالت میں تمام ولایتِ بصرہ کی مردم شماری ۲۰۰۰۰۰ ہے اور ولایت بغداد کی مردم شماری ۸۵۰۰۰۰ ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں ولایتوں کی موجودہ مردم شماری اس تعداد سے کہیں کم ہے جو اُس زمانہ میں اکیلے شہر بغداد کی رہی ہوگی، اور اسی امر پر دمشق وغیرہ ممالک اسلام کے بڑے بڑے شہروں کا اندازہ کرلو؛ جو ان دنوں نہایت کمزور حالت میں ہیں؛ اور اس موقع پر چند اور شہر بھی تھے؛ جو آج اسم بلا مسمّے رہ گئے ہیں، جیسے مصر میں فسطاط؛ عراق میں کوفہ؛ افریقہ میں قیروان اور حوران میں بصرہ وغیرہ جن کے ذکر کا یہاں پر موقع بھی نہیں ہے

مصر کا ماضی وحال

باقی رہا ملک مصر اس کی بابت مؤرخین عرب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مسلمانوں نے اُسے فتح کیا ہے تو وہاں کے رہنے والوں میں سے صرف مردوں کی تعداد نوجوانوں سے لے کر ادھیڑ عمر والوں تک (جنمیں کوئی عورت بچہ۔ بوڑھا شامل نہ تھا) اسی لاکھ تھی۔ صرف اسکندریہ میں ۳۰۰۰۰۰ آدمی تھے لہذا اگر ہم اس تعداد پر عورتوں، بچّوں، اور بوڑھوں کی تعداد کا اضافہ کردیں تو کل تعداد ۳۰۰۰۰۰۰۰ بڑھ جائیگی اور یہ تعداد اُسی ملک کے آج کل کے باشندوں کی تعداد سے تگنی ہے، گو اس روایت کے صحیح ہونے میں کلام بھی کیا جاتا ہے، لیکن مؤرخینِ عرب کے اقوال کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اس زمانہ میں مصر کی حالت بہت اچھی تھی؛ اور وہاں کی زرخیزی اور ارزانی قابلِ تعجب۔ جس کی وجہ سے اس کی آبادی بھی حد سے بڑھی ہوئی تھی؛ مقریزی کا بیان ہے کہ سنہ ھ میں ہشام بن عبد الملک نے اپنے عامل عبید اللہ بن الحجاب کو جو مصر کا خراج وصول کرنے پر متعین تھا حکم دیا کہ ملک مصر کی پیمائش کرے اُس نے بذاتِ خاص اس کی پیمائش کی تو اس کی صرف اس زمین مزروعہ کا رقبہ جو دریائے نیل سے سیراب ہوتی تھی ۰۰۰۰۰۰۰ ۲ فدان نکلا، یہ رقبہ آج کل کی زیرِ کاشت زمین سے چوگنا ہے باوجودیکہ حکومتِ مصر اس وقت مزروعہ اراضی کی سرسبزی اور زرخیزی کے باب میں بہت کچھ توجہ سے کام لے رہی ہے۔ اور جس قدر وقت ممکن ہوتا ہے اس کی آبادی میں کوشش کرتی ہے؛ اس پر بھی وادیٔ نیل کی زیرِ کاشت زمین ساٹھ لاکھ فدان سے کہیں کم ہے اور تمام وادیٔ نیل کی مساحت یعنی وجہ بحری اور صعید دریائے نیل کے دونوں سمت کی زمین

چھ ملین فدان سے کچھ ہی زائد ہے اسلئے یہ امر محال معلوم ہوتا ہے۔ کہ آغاز اسلام میں وادیٔ نیل کی مساحت اس سے بیگنی رہی ہے۔ لیکن یہ بات خیال میں آتی ہے کہ اہل عرب نے اس خطہ کو بھی جو اس وادی کی جانب شرق بحر احمر کے قریب تک چلا گیا ہے۔ اور وہ خطہ بھی جو اسی کی غربی سمت میں وادی نظروں تک پھیلا ہوا ہے کاشت میں لے لیا ہو؛ کیونکہ مع اس زمین کے جسیں لو جبیں لگی ہیں اور وہ صحرائی لیبیا میں واقع ہے اور دریائے نیل اور بحر احمر کے مابین والی زمین اور بحر احمر سے لے کر بحر روم تک کے مابین کا وہ حصہ اراضی جو عریش تک ہے، اس تمام خطہ کی مساحت چار لاکھ میل مربع سے بڑھ جائیگی اور چار لاکھ میل مربع ایک سو ستاسی ملین فدان کے برابر ہوتے ہیں اتنا معلوم ہو جانے کے بعد یہ کچھ تعجب خیز امر نہ ہوگا۔ کہ اس قدر وسیع خطہ میں سے تین ملین فدان زمین زیر کاشت رہی ہو اور یہ بھی مستبعد نہیں کہ وہاں کے باشندوں کی تعداد تیس ملین سے کم نہ ہو۔

مصر کی مساحت

ہمارے اس قول کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ مؤرخین عرب ملک مصر کی مساحت قریب قریب اتنی ہی بیان کرتے ہیں جتنی کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں؛ مقریزی لکھتا ہے ملک مصر کی سرزمین کی آخری حالت جس کا اعتبار کیا گیا حسب ذیل تھی، اس کی مدت کاشت ساٹھ دن تھی اور زمین کی مساحت .... ۱۸ فدان جس میں سے ابن المدبر کے زیر نگرانی واہتمام تیسری صدی ہجری کے وسط میں ...... ۲۴ فدان زمین مزروعہ تھی اور اسمیں کلام نہیں کہ جب تک اس زمین میں ..... ۴۸ کسان ہمیشہ تردد نہ کرتے رہیں۔ اس کا خراج پورا نہیں ہوتا..... الخ

اسی قسم کی آبادی اُن بڑے بڑے اسلامی شہروں کو بھی سمجھنی چاہیئے جو اپنے اپنے ملک کے صدر مقام تھے جیسے اندلس میں قرطبہ، غرناطہ اور طلیطلہ اور عراق و شام کے بے شمار بلاد جو اس زمانہ میں عظیم الشان شہر تھے، اور آج چھوٹے چھوٹے گاؤں رہ گئے ہیں

پوری آبادی کا اندازہ

لہٰذا اگر ہم ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھیں جنھیں ہم اوپر بیان کر آئے ہیں تو یہ امر بعید از قیاس نہ ہوگا کہ مملکت اسلامی کی مردم شماری اس کے پورے عروج کی حالت میں بیس کروڑ سے لے کر پچیس کروڑ تک رہی ہو اور یہ تعداد تمام یورپ کی آبادی کے قریب قریب برابر ہے؛ چنانچہ سلطنت اسلام کی دولتمندی کا

بیان کرتے ہوئے، پھر کہیں اس کا تذکرہ کریں گے۔

اسلامی سلطنت کے امورِ مملکت

اسلامی حکومت

اسلامی حکومت کا سنہ ۱ھ میں مدینہ کے اندر آغاز ہوا، ان دنوں مسلمان صرف صحابہ تھے جن کی تعداد چند دہائیوں سے زیادہ نہ تھی اُن میں سے کچھ مہاجر تھے؛ اور تھوڑے سے انصار، اس لئے اُنھوں نے اسلامی حکومت کی بنیاد مساوات برادرانہ برتاؤ اور ایک دوسرے کی مدد کرتے رہنے پر رکھی، ہم ذکر کر چکے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے مابین بھائی چارہ کی رسم قائم کی تھی اور اس رشتہ برادری کی مضبوطی یوں فرمائی تھی؛ کہ تمام مسلمانوں کا مال اور ان کے کاروبار ایک کر دیئے تھے جس پر ان کے قول "مَنْ تَرَكَ كَلًّا فَإِلَيْنَا وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهِ"[1] سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح پر تمام لوگوں کے کاروبار کا ایک کر دینا اتحاد کی زیادتی کا موجب تھا، اور ان دنوں حکومت کے تمام کاروبار صرف نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ذات پر منحصر تھے؛ حکومت، انتظام ملک؛ اور دین؛ صرف یہی تین اس وقت حکومتِ اسلامی کے کاروبار تھے؛ چنانچہ مسلمانوں نے سب سے پہلے نماز، زکوٰۃ اور اس کے علاوہ اور اسی قسم کی باتیں اپنے اوپر فرض قرار دیں جو دینداری کی قسم سے شمار ہوتی ہیں؛ ہم ان اُمور میں صرف اُسی ایک پہلو سے بحث کرنا چاہتے ہیں؛ جو ایک حکومت کے قیام میں دخل رکھتا ہو؛

باجماعت نماز ادا کرنے کا نفع دنیا میں باہمی اتحاد کا بڑھنا اور امام کی اطاعت کا عادی ہونا ہو سکتا ہے، باقی رہی زکوٰۃ وہ حکومت کی بیخ دبنیاد اور اس کے کاروبار کی اصل ہے۔ اس لئے کہ وہ بیت المال (خزانہ) کی جڑ ہے جسے ہم صیغہ مال سے تعبیر کرتے ہیں۔

نماز اور زکوٰۃ کا نظام

یہ امر مخفی نہیں کہ سلطنتوں کے انتظامات مختلف طریقوں پر ہوتے ہیں، جن میں ملکی، جمہوری، مطلق اور مقید چار قسم

---

[1] جس نے کسی قسم کا بوجھ (یعنی قرضہ وغیرہ) وہ ہمارے ذمہ اور جس نے مال چھوڑا وہ اس کے وارثوں کا ہے؛

کی حکومتیں پائی جاتی ہیں اور ہر سلطنت کے قواعد و ضوابط دوسری حکومت کے آئین و قوانین سے جدا ہوتے ہیں۔ جن کا بیان کرنا مشکل ہے۔ لیکن جس قدر حکومتیں ہیں وہ سب آخر کار دنیاوی باتوں میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ وہ باتیں یہ ہیں: (۱) مال۔ (۲) سپاہ۔ سلطنت خواہ کوئی سی ہو اور اس کے قواعد و قوانین چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اس میں مال اور سپاہ کا وجود ضرور ہوگا۔ کیونکہ بغیر ان دونوں چیزوں کے سلطنت کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ اور اکثر صورتوں میں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ قیام حکومت کی ابتدائی حالت میں بہ نسبت حالتِ مابعد کے ان دونوں باتوں کا وجود زیادہ ضروری پایا جاتا ہے۔ اسلامی حکومت کے اوائل میں خود مسلمان لوگ سپاہی تھے، اور نماز کے ذریعہ سے ان کا اتحاد اور ان کے باہمی برادرانہ تعلقات فوجی نظام تھے، اور زکوٰۃ سے وہ مال مراد ہے جو فوج کے قائم رکھنے کے لئے لازم ہوتا ہے لہٰذا اسلامی سلطنت کے بنیادی امور صرف ایک آیت میں درج ہیں: "وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ" زکوٰۃ سے اس رشتہ اتحاد کا مزید استحکام مقصود تھا جو اسلام کی بنیاد ہے: وہ اس طرح کہ مالدار مسلمانوں سے کچھ رقم ان کے زائد مال میں سے لے کر غریب مسلمانوں کو دیدی جاتی تھی گویا کہ لینے میں زکوٰۃ اور دینے میں صدقہ کے طور پر مستعمل ہوتی تھی، چنانچہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کرتے ہوئے اُن سے یہ بات فرمائی تھی: کہ تم عنقریب ایک صاحب کتاب قوم کے پاس پہنچو گے: ان کو اس بات کی گواہی دینے کی جانب بلانا کہ پرستش کے قابل کوئی معبود بجز اللہ پاک کے نہیں ہے۔ اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں: اگر وہ لوگ اس کو مان لیں تو انہیں بتا دینا کہ خداوند پاک نے رات اور دن میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں: وہ لوگ اس کو بھی تسلیم کر لیں تو پھر کہنا کہ حق تعالیٰ نے اُن پر ایک صدقہ بھی فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے لے کر انھیں میں کے غربا کو دیا جاتا ہے۔ جس وقت وہ لوگ اس کی بھی اطاعت کریں۔ تو خبردار پھر ان کے عمدہ مالوں کو ہاتھ نہ لگانا (یعنی ان کے مال و دولت سے تعرض نہ کرنا) اور مظلوم کی آواز سے بچتے رہنا: اس لئے کہ اس کی آہ اور جناب باری کے مابین کوئی حجاب نہیں ہے۔ اسی قول کو بہ نظر غور دیکھنے سے ہمارا دعویٰ صاف صاف ثابت ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ کی حکمت زکوٰۃ مالداروں پر فرار دینے اور فقیروں کے حوالے کرنے میں ایک قابل قدر حکمت مخفی ہے، اس لئے کہ یہ بات غریبوں کو راضی کرنے والی ہے جنکی

تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے؛ خاص کر ایامِ جاہلیت میں جو کہ ظلم اور خود نمائی کا زمانہ گذرا ہے ایسا برتاؤ ہونا اور بھی مناسب تھا؛ اسلام کمزور کی امداد اور اُسے طاقت ور کا ہم پلّہ بنا دینے کے لئے آیا تھا، اور اس نے اپنا یہ عمل پورا کیا؛ اسی وجہ سے جو لوگ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے دشمن تھے۔ وہ سب سردارِ قوم تھے، جن کو یہ بات بڑی لگتی تھی کہ اپنی قوم کے غریب لوگوں کو اپنے مال و دولت کا حصّہ دار بنائیں؛ اور وہ مسکین ان کے بھائی بنیں اور واقعہ بدر کبریٰ کے بعد سنہ ۲ھ میں غنائم اور جزیہ (ٹکس) کی آمدنی اور بھی زیادہ ہوتی جس کا مفصل بیان آگے چل کر آئے گا اس وقت سے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) اور ابوبکرؓ کے عہد میں سلطنت کے کاروبار کا انحصار ان امور پر رہا، زکوٰۃ جو مالدار مسلمانوں سے لے کر غرباء کو تقسیم کی جاتی تھی؛ جنگ و جدال سے حاصل شدہ مالِ غنیمت جو مجاہدین کے مابین بانٹا جاتا تھا اور ذمّی یعنی یہود اور نصاریٰ میں سے جو اہلِ عرب مسلمانوں کی ذمّہ داری میں آگئے تھے، ان پر جزیہ وغیرہ محاصل کا مقرر کرنا ان تمام کاموں کے والی اور افسر خود نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) یا ان کے خلیفہ ہوتے تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) اور خلیفہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جس قدر مال کہیں سے آتا تھا وہ تمام مسلمانوں پر برابر تقسیم کر دیا جاتا تھا، چھوٹے، بڑے، آزاد غلام اور مرد و عورت کا کوئی امتیاز و تفریق نہ تھی؛ لیکن اگر مالِ غنیمت ہوتا تھا، تو اس میں سے خلفاء بھی اپنا حصّہ لے لیا کرتے تھے؛ جو آگے چل کر بیان ہوگا؛ قاعدہ یہ تھا کہ جس وقت باہر کے ملکوں سے مال و متاع مدینہ میں آتا مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں لا کر رکھ دیا جاتا اور نبی (صلعم) یا خلیفہ اُسے بلا کسی قید اور ضبط اپنی مرضی کے موافق لوگوں میں تقسیم کر دیتے یہاں تک کہ اس میں سے کچھ باقی نہ رکھا جاتا تھا۔

مالیاتی دفتر کا قیام جس وقت عمر بن الخطاب کے عہد میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہو نئے نئے ملک مسلمانوں کے قبضہ میں آنے لگے اور عرب والے رومیوں اور فارسیوں سے ملے جلے تو ان کی آمدنیاں بڑھ گئیں اور یہ کیفیت ہوئی کہ چاروں طرف سے مال و دولت پھٹ پڑا، اس لئے وہ مجبور ہوئے کہ اُسے ضبط و قید میں رکھیں اور آمد و خرچ کا تعین کریں، عمرؓ کو خیال گذرا کہ آمدنیوں کو دفتروں میں ضبط کیا جائے، اور اس میں سے ہر سال لوگوں کو بقدر استحقاق وظیفہ دینے کے بعد جو رقم باقی بچے اُسے وقت ضرورت کے لئے محفوظ رکھا جائے۔ لہٰذا

عمرؓ نے ۲۰ھ میں اور (بقولِ بعض ۱۵ھ میں) یہ انتظام شروع کیا؛ اس عمل کو دیوان کے نام سے تعبیر کرتے ہیں؛ اور ایسا کرنے میں رومیوں اور فارسیوں کی پیروی کی گئی تھی۔

وظائف کا تعین

عمرؓ نے اپنے گرد و پیش کے مسلمانوں پر غور کی نظر ڈالی تو ان کے کئی طبقے اور درجے پائے جو حکومتِ اسلامی کے قیام و توسیع میں ان کے موثر ہونیکے لحاظ سے قائم ہوتے تھے، اس لئے ان کو مناسب معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر شخص کا وظیفہ اس کی خدمات کے لحاظ سے مقرر کریں، مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے قرابتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رشتہ داروں کو ایک خاص طرز پر ممتاز بنایا جسے ہم آگے چلکر بیان کریں گے۔ دفتروں کی درستی اور ترتیب میں ایک محرر خلیفہ کی جانب سے مقرر ہوا؛ جو ان کی دیکھ بھال اور حساب کتاب میں مشغول رہتا تھا،

بیت المال

پھر جس زمانہ میں مدینہ کے اندر بکثرت مال آنے لگا اُس وقت عمرؓ نے ایک خزانہ یا گھر بھی تعمیر کرا دیا؛ جس کا نام بیت المال رکھا گیا؛ بیت المال کا قائم کرنا عمرؓ کی اوّلیات میں سے ہے؛ اگرچہ ہم ابوبکرؓ کے عہد میں بھی بیت المال کا ذکر سنتے ہیں۔ لیکن یہ صرف ایک قیاسی بات ہے؛ اس لئے کہ ابوبکرؓ کے پاس اس قدر مال کہاں بچتا تھا جسے وہ کسی خزانہ یا مکان میں جمع کراتے؛

سلطنت کے عہدیدار

۴۱ھ میں خلفائے راشدینؓ کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، اُس وقت سلطنت کے عہدہ دار حسبِ ذیل تھے (۱) خود خلیفہ (حاکم عام) (۲) ان کے عمّال دیگر ممالک اور شہروں میں (۳) کاتب جو ان کے خطوط رکھتا تھا؛ اور خزانہ کے مداخل و مخارج کا حساب بھی رکھتا، ایک خاص خادم جسے لوگ حاجب کہا کرتے تھے (۵) خزانچی جو بیت المال کا نگراں ہوتا تھا (۶) قاضی جو مقدمات کا فیصلہ کیا کرتا؛

نظم و نسق میں توسیع

خلافت بنو اُمیہؓ کے ہاتھوں میں جاتا ہی اُس کا شاہانہ انتظام اور دنیوی حکمرانی کی صورت اختیار کرتا تھا، اب مسلمانوں کا میل جول عجمی لوگوں سے بڑھ گیا تھا اور حکومت کے کاروبار بھی اصولِ ترقی کے موافق بڑھتے اور وسعت پانے لگے تھے، بنو اُمیہؓ نے چند نئے صیغے جن کو انھوں نے رومیوں اور فارسیوں سے اقتباس کیا تھا، اور بھی بڑھا دیئے تھے، پرشکوہ سلطنت اور دولتمندی ثروت

کے اقتضائے سے ان کو حشم و خدم رکھنے حاشیہ نشین اور حاجب و حارس مقرر کرنے کا بھی شوق ہوا، اور اس طرح رفتہ رفتہ بنی امیہ کے عہد میں حارسوں، دیوانِ خاتم، ڈاک، اور دفتر خراج کی بنیاد پڑ گئی جن کا بیان آگے چل کر آئے گا۔

جس وقت حکومت کی باگ بنوعباس کے قبضہ میں پہنچی، غیر قوموں سے میل ملاپ کے بواعث زیادہ ہونے لگے، خلفا کو عیش پسندی اور آرام طلبی کی چاٹ پڑ گئی، لہذا انھوں نے ایسے عہدیدار کو بڑھایا جو سلطنت کے کاروبار میں ان کے قائم مقام اور نائب ہو سکیں، انھوں نے وزارت اور محاسبت وغیرہ کا عملہ بڑھایا، اور اسطرح اعلے منصوبوں کی ضرورت و حالت کے موافق مختلف شاخیں ہوتی گئیں، پھر اس کے بعد ہر ایک اسلامی حکومت نے اپنی اپنی ضرورت کے موافق نئے عہدوں کو اپنے یہاں داخل کرنا شروع کیا، جس کے سبب بغداد کے عہدے اور امورِ مملکت قرطبہ سے جدا اور ان دونوں مقاموں کے محکمے قاہرہ کے محکموں سے الگ تھے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

محکموں کی شاخیں اسلامی حکومت کے دورِ اوّل میں جبکہ اس کے اندر ایک قسم کی طلبپسند سادگی تھی خود خلیفہ بذاتِ خاص تمام کاموں کی نگرانی کیا کرتا تھا، اس کے عمال اس وقت تک متقی و پرہیزگار لوگ ہوتے تھے اور اس بات کی بالکل حاجت نہ پڑتی تھی کہ کوئی ان کی کارگذاری کی نگرانی رکھے یا ان کی پوشیدہ باتوں کی تحقیق کرے، خلیفہ کے پاس کچھ ذاتی مال و ملک یا جاگیر تو ہوتی نہ تھی جس کے حساب کتاب کی ضرورت پڑے، بلکہ اس زمانہ میں تو یہ حالت تھی کہ جس وقت خلیفہ اپنے کسی عامل کو خط لکھتا تھا تو اپنے ہاتھوں سے اس پر مہر لگاتا یا بسا اوقات خط بھی اپنے ہی دستِ خاص سے لکھا کرتا تھا،

جدید اصلاحات مگر جس وقت کہ خلفار کا اقتدار بڑھا، اور خلافت کا معاملہ دینی پہلو سے ہٹ کر حکومتِ ملکی سے تبدیل ہو گیا، خلفار نے کاہلی اور قیصر و کسرے کی پیروی کو اپنا شیوہ بنایا اور ان کاموں پر اپنی جانب سے قائم مقام مقرر کئے، لہذا انھوں نے ایک ایسا عہدہ رکھا، جس کا عہدہ دار الحکومت کے تمام کاموں کا نگراں رہے، اس خدمت کے انجام دینے والے وزیر کہلائے، اور جو عہدیدار عمال صوبجات کا نگراں رہتا تھا اس کا نام صاحب دیوان

البرید" ہوا"، اور جو شخص خطوط اور فرمانوں پر مہر لگانے اور انھیں لفافوں میں بند کرنے کی خدمت پر متعین ہوتے وہ صاحب دیوان توقیع (یا) خاتم کے نام سے موسوم ہوئے، اور جن عہدہ داروں کو خلفاء کے املاک و اراضیات کی حفاظت سپرد ہوتی وہ لوگ عمال دیوان الضیاع کہے جاتے تھے اور جو عہدیدار حاشیہ نشینوں اور خدام خلفاء کے حساب کی نگرانی کرتے، وہ عمال دیوان خاص کہلاتے، نیز بعد زمانہ میں خلفاء کی حضارت نے یہ ضرورت بھی پیدا کردی کہ سکے ڈھلوائیں اور نشان (طراز) سلطنت منقوش کرائیں اس لئے انھوں نے دار الضرب (ٹکسال) اور دیوان الطراز کی بنیاد رکھی، اسکے علاوہ چند عدالتیں بھی قائم کیں جنہیں سے بعض درخواستیں پیش کرنے کی غرض سے تھیں اور کچھ اس کے سوا دوسری باتوں کے لئے۔ مثلاً دیوان الترتیب اور دیوان العزیز۔ یہ آخری عدالت باب عالی کے مشابہ تھی

دفتروں کی توسیع

خلفائے راشدین کے عہد میں جو شخص کاتب (میر منشی) ہوکرتا تھا وہی عمرؓ کے ترتیب دیئے ہوئے دفتر کا سارا کاروبار بھی سنبھالتا تھا، جس قدر خراج وجزیہ وغیرہ کی رقمیں آتیں ان کو آمدنی میں اور جو کچھ فوجوں کی تنخواہوں اور عاملوں اور قاضیوں وغیرہ کے مشاہروں میں خرچ ہوتا اُسے مصارف میں درج کیا کرتا، اسی کے ساتھ عاملوں سے خط وکتابت رکھنے کی خدمت بھی انجام دیتا، پھر جب زمانے میں حکومت کے محکمے اور کاروبار وسیع ہوئے تو اسی ایک محکمہ کی مختلف شاخیں ہوکر کئی محکمے بن گئے، چنانچہ جتنا حصہ خراج اور جزیہ کے حسابات سے مخصوص تھا وہ عملہ الگ ہوکر دیوان خراج کے نام سے موسوم ہوگیا، اور جو حصہ فوجی اور ملکی اخراجات سے وابستہ تھا اس کا عملہ جدا ہوکر دیوان الزمام والنفقہ (بخشی گری) کے لقب سے ملقب کردیا گیا۔ اور جس کام کا تعلق فوجیوں کے ناموں کا رجسٹر مرتب رکھنے اور ان کے طبقوں اور تنخواہوں کو قلمبند کرنے سے تھا، اس کے عملہ کو دیوان الجند (فوجی دفتر) سے موسوم کیا گیا، پھر اور آگے بڑھکر اسی فوجی دفتر سے دیوان الاساطیل (بیڑہ جات جہاز کا دفتر) اور دیوان الثغور (سرحدی چھاؤنیوں کا دفتر) وغیرہ کی نئی شاخیں پیدا ہوئیں، صوبہ جات کے حاکموں اور عاملوں وغیرہ سے خط وکتابت رکھنے کے لئے ایک جداگانہ دفتر قائم کیا گیا، جس کے لئے دیوان الرسائل یا دیوان الانشاء کا نام تجویز ہوا۔

بیت المال کی شاخیں ابتدا میں بیت المال مسلمانوں کے تمام مالوں اور ہر قسم کی رقموں کا عام مخزن تھا، پھر اموی لوگوں اور عباسیوں کے زمانہ میں اس کی بھی کئی شاخیں ہوگئیں جن میں سے کوئی شاخ صرف صدقہ کے مالوں کے لئے تھی اور کوئی جرمانوں اور تاوانوں کی آمدنیوں کے لئے اور کوئی اموالِ وراثت جمع رہنے کے واسطے اور چندان کے علاوہ دیگر متفرق رقموں کی غرض سے، پھر اسی طرح اور کاموں میں بھی شاخیں نکلتی گئیں جیسے کہ ایک قضا کے عہدے سے بڑھ کر دفتر فوجداری اور محاسبت اور پولیس کا محلہ مقرر ہوا، اور اسی کی مانند اور عملے جن کا شمار نا ممکن ہے؛

چونکہ ہم اس موقع پر اساسی (اصولی اور بنیادی) دفتروں اور ان کی تواریخ پر غور کرنے کے خواہاں ہیں اور ان کے تمام حالات سے بحث کرنا چاہتے ہیں اور بہ صورت اس وقت تک فائدہ نہ ہوگی تا وقتیکہ ہم ان کے اصول اور آغاز کی حالت پھر ان کے شاخ در شاخ ہوتے رہنے کی کیفیت پر غور نہیں کریں گے، لہذا ہم پہلے خلافت اور اس کے توابع اور ملحقات سے ابتدا کر کے بعد از اں صوبوں کی گورنریوں اور پھر وزارت کے عہدوں کا بیان کریں گے۔ پھر فوج اور مال کے لئے ایک علیحدہ باب خاص کریں گے۔ اور دوسرے کاروبار کو بھی اسی کے ساتھ ملحق کر دیں گے۔

خلافت
اور اس کے حقوق و شرائط

خلافت کی حقیقت خلافت ایک قسم کی حکمرانی ہے جو اسلام کے ساتھ خاص ہے اور اس کے سوا کسی قوم و ملت میں پیشتر سے نہیں تھی، اگرچہ خلافت خود مختارانہ شخصی حکومت کی قسم سے ہے، مگر وہ رومی قیصروں اور امیروں اور فارسی کسراؤں کے طرز حکومت سے یہ امتیاز بھی رکھتی ہے۔ کہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کی حکومت پر مشتمل ہے۔ اسی لحاظ سے وہ عام مخلوق کو ان کے دنیوی و اخروی کاروبار میں شرعی احکام کے مطابق

عملدرآمد کرنے پر آمادہ کرتی ہے، اور قیصرو کسریٰ کی حکومتیں صرف عقلی دلائل کی بنا پر عام خلقت کو محض دنیوی مفاد حاصل کرانا چاہتی ہیں۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں حکومتوں (یعنی خلافت اور دنیوی سلطنت) کے درمیان ایک بین فرق ہے، اور بہت بڑا تفاوت، لیکن نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے۔ اس لئے کہ جو شخص خلقِ خدا کا حاکم اور ان کے کاروبار کا مطلق العنان نگراں ہوتا ہے وہ یا تو کسی مفروض قانون کا پابند ہو کر لوگوں سے اس کے مطابق عملدرآمد کراتا ہے اور یا اپنی خواہشوں اور غرضوں کے موافق ان سے کام لیتا ہے، متمدن دنیا کے اکثر حاکم اور بادشاہ اپنی رعایا پر ایسے قوانین کے ذریعہ سے عمل کرتے ہیں جو انتظامی غرض کو مدِ نظر رکھکر سلطنت کے عالی مرتبہ مشیروں اور قوم کے دانشمند لوگوں نے بنائے ہوں انہیں قوانین کی پیروی کرانی حکامِ ملک کا شیوہ ہوتا ہے، اسلام سے قبل رومیوں اور فارسیوں کی یہی حالت تھی۔ اور آج کل یورپ کے خودمختار بادشاہوں کا طرزِ عمل بھی اسی قسم کا ہے، باقی رہی خلافت تو وہ دینی اور شرعی قوانین سے جکڑی ہوئی ہے جن کے ذریعہ سے خلیفہ اپنی قوم پر حکمرانی کرتا اور اس شریعت کے پیغمبر کا نائب بنکر عام مخلوق کو اس کا پابند بناتا ہے، اسی قسم کی باتوں میں سے خلافت کا امامت پر مشابہ ہونا بھی ہے۔ اور مسلمانوں نے خلیفہ کا نام امام بھی اسی مشابہت سے رکھا ہے کہ جیسے نماز کے امام کی پیروی کی جاتی ہے اسی طور سے خلیفہ کے احکام واجب التعمیل ہوتے ہیں۔

خلافت کی شرطیں خلافت کی شرطیں چار ہیں جن میں سے اکثر کا خلیفہ میں پایا جانا ضروری ہے وہ شرطیں حسب ذیل ہیں

(۱) علم۔ (۲) عدالت (۳) کفایۃ (نیک چلنی اور اعتبار کے قابل ہونا) (۴) عقل و حواس کی صحت و سلامتی، ان کے علاوہ ایک پانچویں شرط اور بھی ہے جس کے بارے میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔ وہ شرط قریش کا نسب ہے یعنی قبیلہ قریش کے سوا اور کسی خاندان کا شخص خلافت کا دعویدار نہیں ہو سکتا اس صورت میں یہ بات دشوار ہو گئی۔ کہ کوئی عجمی شخص خلیفہ کے نام سے مسلمانوں کے معاملات کا والی بنجائے۔ اس شرط کی اصل ایک حدیث نبوی ہے جو قریش والوں نے انصار کے مقابلہ میں ان کی طرف سے حصولِ خلافت کی خواہش ہونے پر بطور حجت پیش کی تھی۔ جیسا کہ بیعتِ ابی بکر رضؓ کے ذکر میں بیان ہو چکا ہے، یہ شرط اسلامی حکومتوں میں بہرحال پورے طور پر ملحوظ نہیں تھی

چنانچہ قریش والوں کے علاوہ اور کسی شخص نے کبھی خلافت کا مطالبہ نہیں کیا، اگرچہ خلفاء کے آخری زمانہ میں ان کی کمزوری بیحد بڑھ گئی تھی اور والیانِ ملک کا زور بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا تھا، کہ انھوں نے خلیفہ کو تمام دنیوی قوتوں سے الگ کر دیا تھا اور خلفاء کو بے قابو بنا کر خود مختار حکومتیں قائم کرنے کے بعد اپنے آپ کو سلاطین کے لقب سے ملقب کر لیا تھا، باوجود ان تمام حالتوں کے ان سلاطین میں سے کسی کے دل میں خیال نہ آیا کہ وہ خلافت کا دعوے کریں یا خلیفہ بن بیٹھیں، یہی بنی بویہ سلجوقی لوگ غزنوی اور طاہری وغیرہ سلاطین جن کی نہایت قوی اور خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں ان میں سے بعض تو ایسے تھے جو خود خلفاء پر حاوی ہو گئے تھے اور ان کو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا، لیکن انھوں نے اپنے تئیں سلطان کے سوا کسی اور نام سے موسوم نہیں کیا، بلکہ اور خلفاء کی خوشامدیں کرتے رہتے تھے تاکہ وہ انھیں مسندِ حکومت پر قائم رکھیں، سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر میں بھی یہی برتاؤ کیا، کیونکہ جس وقت اس نے آخری فاطمی خلیفہ سے حکومتِ مصر کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، اس وقت کوئی شخص اس کا روکنے والا نہیں تھا، اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی دعویدار ملک و حکومت ہو سکتا تھا، انتظامِ ملک کی کنجیاں اس کے قبضہ میں تھیں مگر جب اس نے مستقل حکمران بننے کا ارادہ کیا تو عباسی خلیفہ کا نام خطبوں میں پڑھوایا اور اپنے تئیں خلیفہ نہیں کہلایا، بلکہ صرف سلطان کے لقب پر اکتفا کی، خاندانِ قریش کے علاوہ اور قبیلہ کے جس شخص نے سب سے پہلے اسلامی خلافت حاصل کی وہ سلطان سلیم فاتح عثمانی تھا اس نے ۹۲۳ھ میں منصبِ خلافت حاصل کیا، ائمہ مذہب حنفی کی دلیل در بارہ صحتِ خلافت بنی عثمان یہ ہے کہ خلیفہ مندرجہ چار حقوق کے پائے جانے پر خلیفہ ہو سکتا ہے:

۱۔ تلوار کا استحقاق اس کے معنی یہ ہیں کہ طالبِ خلافت کی دعوت پر اتنے مددگار ہونے چاہئیں کہ ان کے مقابلے پر روئے زمین پر کوئی دوسرا سر نہ اٹھا سکے، اور اس میں کلام نہیں کہ جس دن سلطان سلیم نے مصر کو فتح کرنے کے بعد حصولِ خلافت کی خواہش کی ہے اس کی یہی حالت تھی:

۲۔ انتخاب کا استحقاق یعنی اہلِ عقد کی تصدیق جو کہ اماموں اور علماء کی ایک مجلس ہوتی ہے اس بارہ میں انھوں نے یہ حجت قائم کی ہے

کہ یہ مجلس اسلام کے اوّل عہد میں مدینہ کے اندر تھی، پھر وہاں سے دمشق میں منتقل ہو آئی، بعدؔ بغداد میں اور اس کے بعد مصر کے دار السلطنت قاہرہ میں لہذا اس کا قاہرہ سے قسطنطنیہ میں منتقل ہوجانا بھی کچھ ناجائز نہیں ہوسکتا؛ اس لیے جس وقت سلطان سلیم نے مصر کو فتح کیا ہے وہ اپنے ہمراہ علماء ازہر کی ایک جماعت کو قسطنطنیہ لے گیا تھا؛ پھر ان کے حلقہ میں چند ترکی علماء کا اضافہ کرکے ایک باقاعدہ مجلس مرتب کرلی تھی جس نے اس کے انتخاب پر تصدیق کی اور خلافت کی تلوار اس کو سپرد کی چنانچہ آج تک یہ رسم جاری ہے کہ عثمانی خلفاء کو علماء کے ہاتھوں سے مسند نشینی کے وقت تلوار حمائل کرائی جاتی ہے اور یہ رسم آج کل جامع ایوب میں ادا ہوتی ہے۔

۳۔ وصیت کرجانا یعنے خلیفۂ وقت اپنے بعد جس شخص کو خلیفہ بنانے کی وصیت کرجائے جس دن سلطان سلیم نے مصر کو فتح کیا ہے وہاں کا آخری عباسی خلیفہ متوکل تھا جس نے سلطانِ ممدوح کے لیے خلافت کی وصیت کی تھی۔

۴۔ حرمین کی حمایت چنانچہ جس وقت سے عثمانی سلاطین خلافت کے متولّی ہوئے ہیں سوا ان سات برسوں کے جن میں صنعا کے اماموں نے دسویں صدی ہجری کے اندر ان متبرک مقامات پر حکمرانی کی اور بجز ان سات سالوں کے جن میں ان امکنہ مقدسہ کی حکومت وہابیوں کے قابو میں رہی، ان چودہ برسوں تک تو بے شک انھیں اس خدمت کا موقع نہیں ملا۔ باقی آج تک وہی لوگ حرمین شریفین کے حامی و نگراں ہیں۔

امانتوں کی حفاظت یہ امانتیں کیا ہیں؟ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے تبرکات جو آستانہ علیہ میں محفوظ ہیں۔ مسلمانوں کا قول ہے کہ آثار نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) بغداد میں تاتاریوں کی دست برد سے محفوظ رہے تھے؛ جن کو عباسی خلفاء اپنے ساتھ مصر لے گئے۔ اور اس وقت سے برابر ملکِ مصر میں رہتے چلے آئے یہاں تک سلطان سلیم ان کو قسطنطنیہ میں لے آیا، اور وہ اب تک ایک چاندی کے صندوق میں باسفرس کے کنارہ پر سرائے قدیمہ کے ایک کمرہ میں محفوظ ہیں۔

خُلفاء کی بیعت کا طرز

بیعت لینے کی صورت خلفائے راشدین کے عہد میں خلافت شوریٰ کے ذریعے سے ہوتی تھی، یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ شوریٰ کیا چیز ہے۔؟

اس کی یہ صورت تھی کہ خلیفہ وقت جس شخص میں اس امر کی صلاحیت وقابلیت پاتا تھا کہ وہ خلافت کے کاروبار عمدگی سے نباہ سکے گا اُسے اپنے بعد جانشینی کے لئے نامزد کردیتا تھا، جیسا کہ ابوبکرؓ نے عمرؓ کی نامزدگی کے باب میں کیا تھا؛ لیکن ابوبکرؓ نے ان کو اسی وقت نامزد کیا جبکہ اپنے ساتھیوں سے اس معاملے میں رائے لے لی تھی۔ اور جس حالت میں خلیفہ کو یہ خوف ہوتا تھا کہ ان کا کسی خاص شخص کو نامزد کرنا قیل وقال کا باعث ہوگا تو وہ ایک گروہ کو متعین کردیتے تھے؛ کہ انہی میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کرلیا جائے جس کی مثال عمرؓ کا طرزِ عمل ہے۔ خلفائے راشدین میں سے کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ وہ خلافت کو اپنی نسل کے لئے بطور وراثت مخصوص کریں؛ یہاں تک کہ جس وقت عمرؓ نے ایک جماعت کو شوریٰ کے طور پر نامزد کیا، تاکہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرلیں تو اپنے فرزند عبداللہ کو بھی اسی جماعت میں نامزد کیا تھا، لیکن ساتھ ہی اس امر کی بھی ممانعت کردی تھی کہ انھیں خلافت کے لئے انتخاب نہ کریں؛ چنانچہ آخر کار لوگوں نے اسی گروہ میں سے عثمانؓ بن عفان کو خلافت کے لئے چن لیا؛ یہ خلیفہ عثمانؓ شہید ہوئے اور کسی شخص کے لئے وصیت نہ کرسکے لہٰذا لوگوں نے بلاشوریٰ کے علیؓ کو خلیفہ منتخب کرلیا؛ علیؓ کا اس طرح پر بلا ان سے دریافت کئے منتخب ہوجانا بہت سے بڑے بڑے صحابہ کو ناگوار گزرا، کیونکہ وہ لوگ عثمانؓ کی شہادت کے وقت اور ملکوں میں منتشر تھے؛ اور علیؓ کی بیعت میں حاضر نہ ہوسکے؛ اسی لئے ان میں سے کسی نے تو بیعت کرلی اور کوئی اس خیال سے رُک گیا کہ سب لوگ کسی شخص کی خلافت پر اجتماع کرلیں تو ہم بھی اس سے بیعت کریں، ان لوگوں نے خلافت کے معاملے کو یونہی چھوڑ رکھا تھا تاکہ وہ مسلمانوں کے مابین شوریٰ کے قاعدہ سے عمل میں آئے اور اہلِ شوریٰ جسے چاہیں متولیِ خلافت بنائیں؛ پھر اس کے بعد مشہور فساد کا واقعہ پیش آگیا اور جو کچھ گذرا وہ سب پر ظاہر ہے

جس وقت حضرت علیؓ شہید ہوئے ان کے شیعوں نے قصد کیا کہ خلافت کو انہی کی نسل میں مخصوص کر دیں، ان لوگوں نے یہ خیال اس لحاظ سے کیا تھا کہ اولاد علیؓ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے جگر گوشہ تھے، چنانچہ ان لوگوں نے علیؓ سے اس امر کے متعلق اس حالت میں جبکہ وہ بستر موت پر پڑے تھے دریافت بھی کیا کہ "کیا ہم حسنؓ سے بیعت کریں" ؟ جس کے جواب میں علیؓ نے فرمایا کہ "میں تم کو منع نہیں کرتا، اور نہ ایسا کرنے کا حکم دیتا ہوں" تم خود اس معاملے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ مگر شیعان علیؓ نے ان کے فرزند حسنؓ سے بیعت کر ہی لی، لیکن یہ معاویہ بن ابی سفیان کے لئے خلافت سے دست کش ہو گئے اور عہدۂ خلافت معاویہ کے قابو میں آنے سے کاروبار خلافت بنو امیہ کے گھرانے میں چلا گیا۔

خلفائے راشدین کا طرز حکومت

اس میں شک نہیں کہ خلفائے راشدین کا طریقہ جو ان مقدس لوگوں نے انتخاب خلفا کے معاملے میں برتا ان تمام طریقوں میں افضل تھا جو آج تک کی متمدن قوموں نے بڑی کوششوں اور کاوشوں کے ساتھ اختیار کئے ہیں، خلفائے راشدین کا طرز عمل جمہوری، شاہی، اور شوریٰ تینوں طریقوں کا جامع تھا، جمہوری اسطرح پر تھا کہ خلیفہ کا انتخاب عام اہل قریش میں سے بلا کسی حصر اور تعین کے ہوتا تھا اور شوریٰ اس طرح کہ انتخاب عام مشورہ سے ہوتا تھا، اور مطلق العنان حکمرانی اس میں یوں پائی جاتی تھی کہ جب کوئی خلیفہ منتخب ہو کر کاروبار مملکت کی باگ پر قابض ہو جاتا تھا تو وہ بلا قید و بندش جو چاہے کر سکتا تھا، لہذا جب ان امور مذکورہ بالا پر چاروں شرطیں بھی اضافہ کر دی جائیں جو ہم نے ابھی بیان کی ہیں، تو یہ حکومت بلاشبہہ تمام اقسام حکومت سے افضل و اعلےٰ ہو جائے گی، اس لئے کہ جب مطلق العنان حاکم منصف ہو، اور اسی کے ساتھ علم، لیاقت، انتظام اور سلامت حواس سے بھی بہرہ ور ہو تو پھر کاروبار سلطنت کے ترقی دینے اور اس کا دائرہ وسیع کرنے اور اپنی رعایا کو موافق رکھنے میں اس سے بڑھ کر کوئی حاکم صاحب قدرت نہ ہو سکے گا، یہ سب فائدے اس خوبی و خصوصیت کے علاوہ ہیں جو ان خلفا میں تقویٰ اور زاہدانہ زندگی کی پائی جاتی تھی جیسا کہ خلفائے راشدین کے حالات دیکھنے سے واضح ہوتا ہے

موروثی حکومت کا آغاز

مگر جبکہ اسلامی حکومت بنو امیہ کے قابو میں آئی اور وہ لوگ ملک شام میں رومیوں سے ملے جلے اور حکومت کے ان طریقوں سے واقف ہوئے جو اہل روم کے یہاں زیر عمل تھے جن میں سے ایک طریقہ نسلاً بعد نسلٍ ایک شخص کے گھر

. . . . . ہیں حکومت کا قائم رہنا بھی تھا؛ تو معاویہ کو بھی رشیوں کی دیکھا دیکھی یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنی نسل میں بھی موروثی طور پر حکومت کا سلسلہ قائم کریں؛ لیکن ابتداءً وہ ایسا کرتے ہیں جھجکے اس لئے کہ ان کو معلوم تھا کہ اس میں خلفائے راشدین کے طرز عمل کی مخالفت ہوگی؛ لہذا انھوں نے اپنے بعض خواص اور مقرب لوگوں سے اس معاملہ میں مشورہ کیا تو مغیرہ بن شعبہ نے ان کو ہمت دلائی اور سب سے زیادہ جرأت انھیں اس خیال نے دلائی کہ اگر اپنے بعد خلافت کے معاملہ کو یونہی بلا کسی وصیت وغیرہ کے چھوڑ جائیں گے تو باہم نفاق اور فساد بڑھے گا، ادھر بنو ہاشم دعویدار خلافت ہوں گے؛ ادھر بنو امیہ اپنے سوا کسی غیر کی خلافت تسلیم نہیں کریں گے؛ اسلئے یہ صورت ایسی حالت میں کہ نبوت کی دہشت لوگوں کے دلوں سے نکل گئی ہے؛ ملکی طبیعت غالب آچکی ہے اور لوگ عصبیت کیجانب رجوع ہو گئے ہیں؛ آخر کار فساد پھوٹنے کا باعث ہوگی؛ لہذا اس فتنے سے بچنے کی خاطر انھوں نے اپنے بیٹے یزید کے لئے بیعت کا سرانجام کیا؛ اور پیش بندی کے طور پر اس خیال سے کہ کہیں ان کے بعد پھر کوئی فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو اپنی زندگی ہی میں یزید کے واسطے بیعت طلب کی اور آہستگی کے ساتھ اس امر کو دیکھنا چاہا کہ لوگ کیا خیال ظاہر کرتے ہیں مگر کوئی خرابی اور دنگہ نہیں دیکھا؛ اسی قاعدہ پر ان کے بعد ان کے جانشینوں نے بھی عملدرآمد رکھا، مگر عمر بن العزیزؒ نے اس قاعدہ کو توڑ کر خلفائے راشدین کا طریقہ اختیار کرنا چاہا؛ مگر عام لوگوں کی شورش کے باعث نہ کر سکے اور ان کی مدت خلافت بھی کچھ طویل نہ تھی؛ جس کے بعد بنو امیہ نے پھر وہی معاویہ والا طرز اختیار کر لیا؛

عباسی عہد حکومت میں مامون الرشید نے بھی ایسا ہی قصد کیا تھا چنانچہ اس نے علی بن موسیٰ بن جعفر صادق رضؓ کو جو امام علی رضؓ کے نسل سے تھے، اپنا ولیعہد بنا کر ان کا نام "رضا" رکھا تھا؛ لیکن بنو عباس اس کے اس فعل سے سخت ناراض ہو گئے؛ اور مامون الرشید کی بیعت کو توڑ کر اس کے چچا ابراہیم بن المہدی سے بیعت کر لی؛ اور اگر مامون جھٹ پٹ اس معاملہ کی تلافی کرنے پر آمادہ نہ ہو جاتا تو خلافت اس کے ہاتھ سے نکل ہی چکی تھی اس لئے اپنا ارادہ فسخ کر کے اس نے وراثت کے طور پر ہی خلافت قائم رکھی اور اسی کے موافق عباسی اور فاطمی وغیرہ دیگر مسلمان خلفاء کا عمل درآمد رہا؛

بیعت اور اس کی قسم

بیعت سے مراد اطاعت کا اقرار ہوتا تھا یعنی جب کسی شخص نے کسی امیر سے بیعت کی تو گویا اس نے اس کی فرمانبرداری کا اقرار

کرلیا۔ اور اپنی ذات کے تمام معاملات کا اُسے مختار بنا دیا اور اب خلافِ طبع ہو یا حسبِ منشاء غرض جس بات کا بھی حکم اس امیر کی جانب سے ہوگا وہ اُس کے ماننے میں ہرگز انکار نہیں کرے گا اور کسی امر میں امیر کے حکم سے انحراف و سرتابی کا مرتکب نہ ہوگا۔ اہلِ عرب کا دستور تھا کہ جب وہ کسی امیر سے بیعت کرتے تھے تو اپنے ہاتھوں کو اس کے ہاتھ میں دیتے، اس طرزِ عمل سے اقرار کی مضبوطی کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔ اور چونکہ یہ صورت مشتری و بائع کے فعل سے مشابہ ہوتی تھی لہذا بیعت کے نام سے موسوم ہوئی جو لفظ "باع" کا مصدر ہے۔ بعد میں رفتہ رفتہ ہاتھوں کا ملانا بیعت قرار پاگیا۔ اور عرفِ لغت کے اعتبار سے بھی بیعت کا مدلول یہی امر ہے۔ اسلام میں سب سے مقدم بیعت۔ بیعت عقبہ تھی اور اسی بیعت کے اُصول پر وہ قسمیں بھی ہیں جو خلفائے اسلام اقرار اطاعت کراتے وقت بطریق حلف لیا کرتے تھے اور جتنے طریقوں سے قسم کھائی جاتی ہے ان سب طریقوں سے قسم کھلواتے :

بیعت کی عبارت یمین (قسم) بیعت کی عبارت حکومتوں اور حالتوں کے ساتھ بدلتی گئی، گو اس کا مقصودِ مدعا ایک ہی رہا۔ جس وقت انصار نے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) سے مقامِ عقبہ میں بیعت کی ہے : تو انھوں نے یوں کہا تھا۔ "یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم لوگ آپ کو پناہ دہی سے اُس وقت تک بے تعلق ہیں جب تک کہ آپ ہمارے گھر کو نہ تشریف لے چلیں۔ لہذا جب آپ ہمارے وطن میں پہنچ جائیں گے تو ہماری پناہ میں آجائیں گے : اس وقت جن باتوں سے ہم خود اپنا اور اپنے بال بچوں کا بچاؤ کرتے ہیں آپ کو بھی اُن باتوں سے محفوظ رکھیں گے"

اس مقام پر ایک اور عبارت بھی ہے جو مقامِ عقبہ میں بیعت کے لئے استعمال کی گئی تھی، اور یہ بیعت بیعتِ نساء کے نام سے مشہور ہے : وہ عبارت حسبِ ذیل ہے "ہم نے بیعت کی اس اقرار پر کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے : چوری نہیں کریں گے : زنا نہ کریں گے : اپنی اولاد کو (بیٹوں کو) قتل نہ کریں گے : اور کسی پر بہتان نہ باندھیں گے : نہ کسی امرِ معروف میں نافرمانی کریں گے۔

جس زمانہ سے ابو مسلم خراسانی نے بنی عباس کے لئے بیعت طلب کرنی شروع کی تو اس کی عبارت یہ ہوتی تھی : "میں تم سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ اور اہلبیتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رضامندی کے لئے ان کی اطاعت کرنے پر بیعت لیتا ہوں اور تم پر اس قول کے نباہنے کے لئے خداوند پاک کا عہد اور اس کا میثاق ہے۔ تم روزینہ کا مطالبہ نہ کرو گے اور نہ کسی قسم کا لالچ کرو گے۔

جب تک کہ تمھارے حکام از خود تمھیں روزینہ دینا شروع نہ کریں، اگر تم اس کے خلاف کرو تو تمھاری عورتوں پر طلاق، غلام کا آزاد کرنا اور پاپیادہ کعبۃ اللہ کا سفر کرنا لازم ہوگا۔

طریقۂ بیعت

جب کسی خلیفہ کی بیعت کرنی چاہتے تھے تو دستور یہ تھا کہ سب سے پہلے اکابر سلطنت بیعت کرتے تھے اور ان کے بعد اصحاب مناصب میں سے جو ان سے دوسرے درجہ پر ہوتے، عباسی عہد حکومت میں سب سے پہلے خلیفہ سے بیعت کرنے والے فوجی لوگ اور سپہ سالار اور بغداد کے قاضی ہوا کرتے تھے اور اکثر اوقات ان لوگوں سے قسم لینے پر فوج کا میر منشی مقرر ہوتا تھا۔ اور لوگوں کا نام لے کر پکارا جاتا تھا اس کے بعد وزیر یا اس کا قائم مقام اُٹھکر خلیفہ کے سر پر اپنے ہاتھوں سے عمامہ باندھتا اور اُسے چادر اُڑھاتا تھا۔ جس وقت بیعت کی کارروائی ختم ہوجاتی تو خلیفہ کے روبرو بہت سے القاب پیش کئے جاتے تھے، جن میں سے کسی ایک لقب کو پسند فرماکر وہ اپنے لئے خاص کر لیتا۔ اس قسم کے القاب صرف مسلمانوں ہی کے زمانہ میں ایجاد ہوئے تھے۔ عباسی حکومت کے پہلے دور میں یہ القاب بہت ہی سادے سادے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً امین۔ مامون اور رشید۔ مگر جب معتصم کا زمانہ آیا تو ایک بزرگی کا نام اس کے لقب پر بڑھایا گیا۔ اور اس کا نام "المعتصم باللہ" قرار پایا۔ پھر اس کے بعد خلفائے عباسیہ کی عادت ہی یہ ہوگئی۔

جلوس خلافت

جب خلیفہ سے اس کے محل میں بیعت کرلیجاتی تو پھر خلافت کا جلوس اس کے سامنے حاضر کیا جاتا۔ یہ بہت سے گھوڑے ہوتے تھے یا جڑاؤ سازوسامان سے آراستہ اور ان کے سائیس بھی زرق برق وردیاں پہنے ہوا کرتے تھے، پھر خلیفہ سوار ہوتا اور بڑے بڑے عمائد سلطنت گھوڑوں پر سوار اس کے گرداگرد حلقہ باندھ لیتے۔ خلیفہ کے روبرو ایک شخص ننگی تلوار ہاتھ میں لئے پیادہ پا چلتا اور فوجیں سیررا۔ دورویہ صف بستہ رہتیں انہیں صفوں کے بیچ میں شاہراہ پر ہوکر موکب خلافت قصر خلافت تک جاتا۔ جو کہ بغداد کا دیوان عام تھا، خلیفہ کے دیوان عام میں جلوس کرنے کے بعد حسب حالت و موقع ممالک غیر اور صوبجات ماتحت سے تہنیت جلوس پیش کرنے کے لئے آنے والے وفد حاضر دربار ہوتے اور لوگ تہنیت نامے پیش کرتے تھے۔

بیعت کی عبارت میں تبدیلی

بیعت کی عبارت اور جشن جلوس خلافت کی کیفیت میں تغیر حکومت کے ساتھ ساتھ اختلاف پیدا ہوتا رہا لیکن

نتیجہ و اصول سب کا ایک تھا، مدعائے اصلی یہ ہوتا تھا کہ کتاب و سنت کے حکم کیمطابق عمل کرنے پر خلیفہ اور اس کی رعیت کے مابین باہمی عہد و پیمان لیا جائے، خلفائے راشدین کا طریقہ تھا کہ بیعت لینے کی عبارت میں اختصار مدنظر رکھتے تھے۔ جیسا کہ آپ حکومتوں کی سیدھی سادھی ابتدائی حالت کے بیان میں ان کے طرز عمل کی سادگی ملاحظہ کر چکے ہوں گے۔ پہلے تو بیعت کی عبارت زبان سے کہی جایا کرتی تھی، بعدازاں لکھ کر محفوظ رکھی جانے لگی، اور ابتداءً چند کلمے ہوا کرتے تھے، پھر رفتہ رفتہ کئی سطروں تک نوبت پہنچی کیونکہ اس میں حشو الفاظ کی بھرتی اور طوالت کی جانے لگی تھی جس کا مقتضی حکومتوں کا دولت مندی کے زعم میں مستغرق ہونا تھا، اور عزت وعظمت کے ساتھ یاد کئے جانے کی خواہش کا پیدا ہو جانا، اسلئے کہ جس وقت حکومت وسلطنت کا اقتدار جم جاتا ہے تو تمام حکمرانوں کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی نمائش اور زیبائش کو بہت کچھ ترقی دینے لگتے ہیں؛ چنانچہ آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں بیعت کی جو عبارت خلیفہ یا حاکم بامر اللہ عباسی کے لئے لکھی گئی وہ اس قدر لمبی تھی کہ اس کتاب کے چار صفحے اس سے بھرے جا سکتے ہیں۔

ولیعہد کی بیعت

ہم نے خلافت کے موروثی ہو جانے کے بعد کی حالت بیان کرتے ہوئے یہ ذکر کیا تھا کہ خلفا اپنے بیٹوں کے واسطے ولیعہدی کی بیعت لیا کرتے تھے یا اولاد نہ ہونے یا اس کے صغیر سن ہونے کی صورت میں اپنے اور قرابتداروں کو ولیعہد بنایا کرتے تھے، وہ لوگ اس بیعت لینے کے واسطے بھی ویسا ہی جشن ترتیب دیتے تھے، جیسا کہ خلفاء کی بیعت لینے کے وقت ہوا کرتا تھا، نیز خلفا کو جس وقت ایسا کرنا منظور ہوتا کہ کسی شخص کو ولیعہدی کے لئے نامزد کریں تو اپنے ارادے کو اہل الرائے لوگوں سے ظاہر کر کے ان سے مشورہ لیتے جس طرح کہ خلیفہ منصور عباسی نے کیا، کیونکہ اس نے جس وقت اپنے فرزند مہدی کے لئے بیعت لینی چاہی اور جعفر اس معاملے میں اس پر معترض ہوا تو منصور نے لوگوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا، چنانچہ جلسہ ہوا اور مقرر لوگوں نے کھڑے ہو کر تقریریں کیں، شاعروں نے نظمیں پڑھیں، چونکہ ان سبھوں میں مہدی کی تعریف زیادہ کی گئی تھی، اس لئے مہدی کی بیعت غالب رہی؛

خلفاء کا یہ بھی دستور تھا کہ جب اپنے بیٹوں یا بھائیوں میں ایک سے زائد شخصوں کو خلافت قابل دیکھتے تھے تو ایک بیٹے یا بھائی سے ولیعہدی کی بیعت لیتے اور شرط لگا دیتے کہ اس کے

جانشین فلاں یا فلاں شخص ہو جیسا کہ یزید بن عبد الملک نے جس وقت اپنے ولیعہد کی بیعت لینی چاہی اور اس وقت اس کا بیٹا بہت ہی کم عمر تھا تو اس نے اپنے بھائی ہشام سے اس شرط پر بیعت کی کہ اس کے بعد میرا بیٹا ولید بن یزید جانشین ہو اور اکثر صورتوں میں جب کوئی ضروری اور لازمی بات خیال میں آجاتی تو وقتاً فوقتاً شرائطِ بیعت میں کچھ تغیر و تبدل بھی کر دیا کرتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خلیفہ اپنے کسی بیٹے کی ولیعہدی کی بیعت لیتے ہوئے اُس شخص کو نامزد کر دیتا جو ولیعہد کا جانشین ہو سکے اور ولیعہد کو اختیار دے دیتا تھا کہ وہ چاہے تو نامزد شخص کو خلیفہ بنائے اور چاہے نہ بنائے جیسا کہ خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے بیٹے مامون کے لئے ولیعہدی کا حکم لکھتے ہوئے اور اس کے بعد اپنے دوسرے فرزند قاسم کو نامزد کرتے ہوئے مامون کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ اگر اس کی مرضی ہو تو قاسم کی ولیعہدی قائم رکھے ورنہ اُسے علیحدہ کر دے۔

عہد یا اقرار نامہ یہ ایک تحریر ہوتی تھی جسے خود خلیفہ یا اس کا کاتب (میر منشی) لکھا کرتا تھا اور اس پر خلیفہ اپنی اور اپنے خاندان والوں کی مہریں ثبت کر کے ولیعہد کو یا اس کے متولی کو سونپ دیتا تھا، کہ اسے وقتِ ضرورت کے لئے محفوظ رکھے، یہ اقرار نامہ کسی امانتدار کے مکان یا خزانہ یا مسجد یا کعبہ میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔ جیسا کہ رشید نے ان دو تحریروں کو جو اس نے اپنے دونوں بیٹوں امین اور مامون کے لئے لکھی تھیں۔ اور جن میں بعد مامون کے قاسم کو نامزد کیا تھا، خانہ کعبہ میں دلعبۃ رکھوا دیا تھا۔

خلافت کی علامتیں

خلافت کی تین علامتیں تھیں۔ چادر، انگوٹھی اور عصا

چادر یہ چادر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چادر تھی، جسے وہ برابر اوڑھتے رہتے تھے۔ اور آخر کار کعب بن زبیر بن ابی سلمان نامی ایک مشہور عربی شاعر کو انعام میں دیدی تھی کعب نے دراصل نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہجو کی تھی، اور مسلمانوں کے مقابلے میں بھاگ گئے تھے، جس

زمانہ میں اہل اسلام نے مکہ کو فتح کیا ہے کعب کے بھائی بجیر ابن زہیر نے ان کو یہ لکھ بھیجا کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے بہت سے ایسے لوگوں کو مکہ میں قتل کرڈالا ہے۔ جنھوں نے ان کی ہجو کی تھی، یا انھیں اذیت دی تھی، اور قریش کے جتنے شاعر باقی بچے ہیں وہ جہاں تہاں بھاگ گئے ہیں۔ لہذا اگر تمھارے دل میں کچھ خواہش ہو تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت جلد حاضر ہو جاؤ، کیونکہ وہ کسی ایسے شخص کو جو توبہ کرتا ہوا ان کے پاس آئے قتل نہیں کرتے، کعب کو اس کے سوا اور کسی صورت میں بہتری نظر نہ آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب رجوع کر کے توبہ کریں۔ وہ مدینہ میں آئے اور اپنے آپ کو نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے حوالے کر دیا۔ اور اپنے اس مشہور قصیدے کے ساتھ جس کا مطلع یہ ہے بانت سعاد فقلبی الیوم متبول ؛ متیم اثرھا لم یفد مکبول نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی مدح کی، آنحضرت نے ان کی بہت کچھ خاطر و مدارات فرمائی، بعض صحابہ نے کعب کو قتل کرنا چاہا، آپ نے انھیں منع کر دیا، اور اپنی چادرِ مبارک کعب کو عطا فرمائی؛ چادر کعب کے گھرانے میں اس وقت تک موجود رہی جبکہ معاویہ بن ابی سفیان نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ان سے چالیس ہزار درم کے معاوضہ میں خرید لی؛ اس کے بعد سے اموی اور پھر عباسی خلفا میں وراثتہً منتقل ہوتی رہی؛ ابو الفدا نے ذکر کیا ہے کہ وہ چادر عباسیوں کے ہاتھ سے نکل کر تاتاریوں کے قبضہ میں چلی گئی تھی؛ مگر اب یہ چادرِ مبارک آستانہ (استنبول) سرائے قدیمہ کے اندر . . . (تبرکات نبوی) صلے اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے؛ شاید ابو الفدا یہ معلوم ہونے پر کہ تاتاریوں نے بغداد کو بہت کچھ تاخت و تاراج کیا تھا اور عباسی خلفا بدحواسی میں مصر کی طرف بھاگ گئے تھے؛ اس وہم میں پڑ گیا ہو کہ تاتاریوں نے خلیفہ کے محل سے جو سامان لوٹا تھا اُسی میں یہ چادر بھی چلی گئی مگر دراصل عباسی لوگ چادر کو اپنے ساتھ مصر لیتے گئے تھے؛ جب سلطان سلیم نے مصر کو فتح کر کے عباسیوں سے خلافت لے لی تو چادر بھی اس کے ساتھ لے لی؛

انگوٹھی یا مہر خلفا نے مہر کا رکھنا محض نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ مشابہت حاصل کرنے کی غرض سے اختیار کیا تھا؛ اس لئے کہ جس زمانہ میں نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے قیصر اور کسرے کو دعوت اسلام کے خطوط لکھنا چاہے تو ان سے کہا گیا کہ اہل عجم کسی ایسی تحریر کو نہیں مانتے جس پر اوّل یا آخر میں مہر نہ ہو۔ لہذا نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک چاندی کی مہر بنوائی اور

اس پر "محمد رسول اللہ" کھدوایا۔ یہ مہر نبوت نوبت بہ نوبت ابوبکرؓ، عمرؓ، اور عثمانؓ تک پہنچی اور عثمانؓ کے ہاتھ سے چاہ ارلیس میں گر گئی۔ اس کے بعد باوجود بڑی تلاش کے جب اس کا پتہ نہ لگا تو عثمانؓ نے اسی کے مثل ایک اور مہر بنوالی؛ عثمانؓ کے بعد جتنے لوگ خلافت کے متولی ہوئے سب اپنے لئے مہریں بنواتے رہے؛ جن سے خطوط کے شروع یا آخر میں گیرو، مٹی یا سیاہی کے ذریعہ سے مہر لگاتے تھے؛ اس کے بعد خطوط بند کرنے کے بعد موم لگا کر ان مہروں سے نشان دیتے رہے۔ موم سے مہر کرنے کا عمل خلفا میں سب سے پہلے معاویہؓ نے فریب ہی سے بچنے کے لئے اختیار کیا تھا؛ کیونکہ انھوں نے ایک بار زیاد بن ابیہ کو جو کوفہ میں ان کا عامل تھا یہ لکھا کہ عمر بن زبیر کو ایک لاکھ درم دیدو اور وہی خط عمر کو دیدیا کہ اُسے زیاد کے پاس لے جائیں۔ عمر بن زبیر نے سو کو دوسو بنا دیا؛ زیاد نے اتنی ہی رقم انھیں ادا کر دی، جب اس خرچ کا حساب معاویہؓ کے سامنے پیش ہوا تب یہ فریب کھلا؛ اسی وقت سے معاویہؓ نے خطوط اور شقوں کی نگرانی اور ان کے لپیٹنے یا شکن ڈالنے کے بعد دونوں کناروں پر مہر کرنے کا حکم دیدیا؛

بلاذری نے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں میں دیوان زمام وخاتم کی بنیاد سب سے پہلے زیاد بن اُبیہ نے ولایت (گورنری) عراق کے زمانہ میں رکھی، اُس نے اس طریقہ کو اہل فارس سے حاصل کیا تھا، بلاذری کا بیان ہے کہ اسلام سے قبل فارس کے حکمرانوں کی کئی ایک مہریں ہوا کرتی تھیں جن میں سے ہر ایک ایک خاص غرض کے لئے مستعمل ہوتی تھی، ایک مہر رازداری کی تھی، ایک خطوط اور مراسلات کی ایک فرمانوں اور جاگیر ناموں کی؛ اور ایک مہر خراج کے لئے مخصوص تھی، جو شخص ان مہروں کے لگانے پر مامور ہوتا تھا وہ صاحب زمام کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا؛

معاویہؓ کے عہد سے بنی عباس کے زمانہ حکومت کے اوسط تک دیوان خاتم کا شمار بڑے اہم دفتروں میں ہوتا رہا اس کے بعد یہ سررشتہ بالکل نابود ہو گیا؛ کیونکہ اب ان تمام کاموں کی انجام دہی خلیفہ کے قابو سے نکل کر امیروں، وزیروں، اور سلاطین وغیرہ کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تھی خلیفہ ہارون الرشید عباسی نے بجائے فضل بن یحییٰ کے جعفر بن یحییٰ کو وزیر بنانا چاہا تو یحییٰ برمکی سے یوں کہا تھا؛ یا ابت! میں چاہتا ہوں کہ اپنی انگوٹھی کو داہنے ہاتھ سے نکال کر بائیں میں پہن لوں؛ گویا کہ انگوٹھی کے ساتھ وزارت کا کنایہ تھا؛ خلفا کی مہر بہت عزت اور عظمت کی

چیز شمار ہوتی تھی، جس وقت وزیر وغیرہ عہدہ داران حکومت اُسے کسی خط پر لگانے کے لئے اپنے ہاتھ میں لیتے تو خلافت کی تعظیم دینے کے لئے کھڑے ہو جاتے، جب کسی تحریر پر مہر کرنی ہوتی تو سیاہی یا رنگین مٹی اس پر مل کر کاغذ چھاپ لیتے یا کسی نرم شے پر لگاتے تھے، مثلاً معلوم ہوتا کہ اس کے نقش بخوبی اُبھر آئے کبھی مہر تحریر کے آخر میں کی جاتی تھی اور کبھی شروع میں جس کے ساتھ تسبیح، تحمید یا خلیفہ کے نام کے مسلسل اور مسجع فقروں کی عبارت بھی ملائی جاتی تھی، یا جو ان کا جی چاہتا، وہ عبارت ملا دیتے، یہ گویا تحریر کی صحت کی سند ہوتی تھی، اور بلا اس عبارت یا مہر کے تحریر نکمی اور غیر مستند سمجھی جاتی تھی، مہر کو علامت بھی کہتے تھے۔

طغرا

جس زمانہ میں سلطنتیں قائم ہونے لگیں تو سلطانوں نے بھی علامت خلافت کے انداز پر اپنی علامتیں مقرر کیں اور ان کا نام طغرا رکھا، طغرا ایک قسم کی تحریر ہوتی تھی جو بقلم جلی لکھی جاتی اور اس میں بادشاہ کا لقب ہوا کرتا تھا، سلاطین کے ہاں طغرا خطوط اور فرمانوں پر خود شاہی دستخط کے قائم مقام متصور ہوتا تھا، اور پھر اس کی حاجت نہیں رہتی تھی کہ سلطان اپنے دستِ خاص سے اس پر کوئی چیز لکھے، یا کچھ نشان کرے، سلجوقی حکومت میں دیوان انشا کا نام ہی دیوان طغرا رکھا گیا تھا۔

طغرائی

بعض لوگوں کا قول ہے کہ اس تحریر کا نام طغرا اس لئے رکھا گیا کہ یہ حسین بن ابی اسمٰعیل کی طغرائی کی جانب سے منسوب ہے جو مشہور قصیدہ لامیۃ العجم کا مصنف ہے حسین بن ابی اسمٰعیل مذکور سلطان مسعود سلجوقی کا وزیر تھا، وہ بہت خوشنویس تھا، اور اس طغرا کو نہایت عمدہ طور سے لکھا کرتا، لہٰذا یہ تحریر اُسی کے نام سے ملقب ہو گئی، کیونکہ وہی سب سے پہلا شخص ہے جس نے ایسی تحریر لکھی تھی، یہ شخص ۵۱۵ھ میں مقتول ہوا، گمان غالب اس بات کا ہے کہ عثمانی طغرا کی اصل بھی یہی ہے، اور وہ سلطان مراد کے کف دست کی صورت نہیں، جیسا کہ الہلال نمبر ۱ جلد ۱۰ میں لامارٹین اور جواتین کی سند سے بیان ہوا ہے۔

انگوٹھی کی عبارتیں

خلفاء مہروں پر اپنے نام نہیں کھدواتے تھے بلکہ وہ اس پر ایسی عبارتیں منقوش کراتے جن میں کوئی پند و نصیحت ہوتی تھی، چنانچہ ابوبکرؓ کی مہر پر نعم القادر اللہ[1] منقوش تھا، اور عمرؓ کی مہر پر یہ عبارت کندہ تھی

[1] اللہ ہی سب سے بڑھ کر قادر ہے۔

"کفیٰ بالموت واعظاً یا عمر"[۱] عثمانؓ کی انگوٹھی پر کندہ تھا "لتصبرن اولتندمن"[۲] اور علیؓ کی مہر پر "الملک للّٰہ"[۳] خلفائے بنی امیہ اور بنو عباس بھی اسی طریق کے پابند رہے، ان میں سے ہر ایک کے واسطے ایک خاص فقرہ تھا، جسے اُس نے اپنی مُہر پر کندہ کرایا تھا، اور اکثر اس مہر کی عبارت میں اور خلیفہ کے نام میں کوئی معنوی مناسبت بھی ہوا کرتی تھی اس لئے کہ مامون کی مہر کا نقش تھا عبد اللّٰہ یومن باللّٰہ مخلصاً[۴] اور واثق کی مہر پر "اللّٰہ ثقۃ الواثق"[۵] کندہ تھا۔ متوکل کی انگوٹھی پر علی اللّٰہ توکلت۔ اور معتمد کی خاتم پر "اعتمادی علی اللّٰہ وحدہ"[۶] جیسی منقوش تھا علیٰ ہذا القیاس۔

تبرکات نبوی ان دونوں نبی (صلے اللّٰہ علیہ وسلم) کے تبرکات کو علامات خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو آستانۂ علیا کے محل موسوم سرائے قدیمہ کے اندر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ایک خاص کمرہ میں چاندی کے صندوق کے اندر محفوظ ہیں۔

یہ تبرکات حسب ذیل ہیں:۔ (۱) چادر (۲) نبی (صلے اللّٰہ علیہ وسلم) کا ایک دندان مبارک (۳) حضور اطہر کے چند موئے مبارک (۴) آپ کی پاپوش مبارک (۵) علم نبوی صلے اللّٰہ علیہ وسلم کا کچھ باقی حصہ (۶) دو لوہے کے برتن جن کی بابت کہا جاتا ہے کہ اُن میں حضرت خلیل اللّٰہ علیہ السلام زمزم کا پانی پیا کرتے تھے۔ (۷) امام ابی حنیفہ کا جبہ (۸) سیدنا یحییٰ علیہ السلام کا ذراع۔ ہر سال رمضان شریف کی ۱۵ تاریخ کو ان تبرکات کی زیارت ہوتی ہے۔ جلالتمآب سلطان المعظم مع اپنے جلوس سواری کے محل موصوفہ کی جانب تشریف لے جاکر وہاں رسم زیارت ادا فرماتے اور ان متبرک چیزوں سے برکت حاصل کرتے ہیں۔ اس موقع پر سلطنت کے بڑے بڑے ارکین اور عہدہ دار بھی سلطان کے ہمرکاب ہوتے ہیں۔

عصا خلافت کی تیسری علامت تھی، جب کوئی نیا خلیفہ مسند نشین ہوتا تو چادر، انگوٹھی، عصا اُس کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ بنو امیہ اور بنی عباس میں یہ دستور ہمیشہ جاری رہا۔

---

[۱] اے عمر موت کافی واعظ ہے۔ [۲] یا صبر یا ندامت [۳] ملک اللّٰہ ہی کا ہے۔ [۴] بندۂ خدا خدا پر اخلاص کے ساتھ ایمان لاتا ہے۔ [۵] خدا کا بھروسہ پکا ہے۔ [۶] میرا بھروسہ اللّٰہ ہے اور وہی میرے لئے کافی ہے۔

خلافت کی نشانیاں

خلافت کی نشانیاں بھی تین تھیں، خطبہ، سکہ، اور طراز۔ (مارکہ)

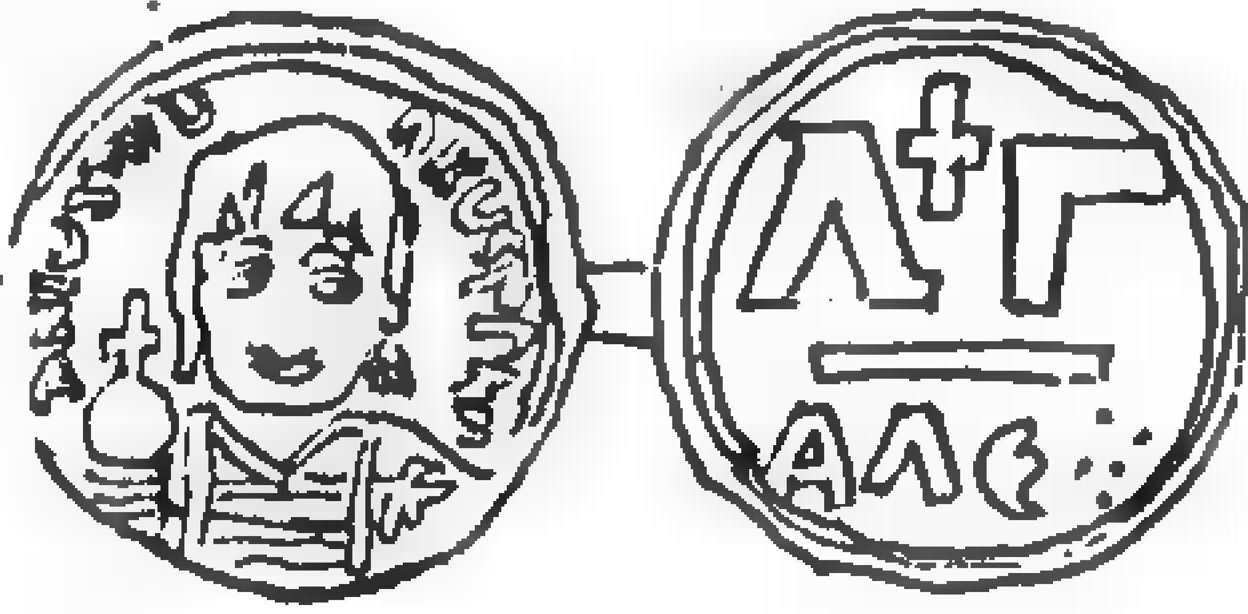
خطبہ خلافت کے نشانات میں سے ایک یہ تھا کہ نماز میں منبروں پر خلیفہ کے لئے دعا مانگی جائے۔ اس کی اصلیت یوں تھی کہ خلفاء بذات خاص نماز پڑھانے کا کام انجام دیتے تھے، وہ لوگ نماز کے فرائض کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے دعا اور صحابہ کے واسطے رضائے خدا کی استدعا پر تمام کیا کرتے تھے۔ جس زمانہ میں خلفاء نے ممالک فتح کئے اور ان پر عامل اور والیوں کا تقرر کیا۔ تو یہ حکام اپنی ولایتوں میں امامت کے متولی ہونے لگے۔ ان کا یہ دستور ہو گیا کہ جب نماز پڑھاتے تو اسے خلفا کے لئے دعا کرنے پر ختم کرتے۔ سب سے پہلے جس والی نے یہ کام کیا وہ عبداللہ بن عباسؓ تھے۔ جب حضرت علیؓ کے عہد میں حاکم بصرہ مقرر ہوئے تو منبر پر ایستادہ ہو کر کہا "اللھم انصر علیا"۔ پھر ان کے بعد بھی یہ طرز برابر جاری رہا۔ رفتہ رفتہ کسی ملک میں خلیفہ کے لئے دعا کا مانگا جانا وہاں اس کی حکومت ہونے کی علامت قرار پا گیا۔ بغداد میں خلفاء کی حالت کمزور ہونے لگی۔ تو وہ امیر اور سلطان جو خلیفہ پر قابو پا لیا کرتے تھے۔ اس دعا میں خلیفہ کے شریک بن گئے۔ اور خلفاء کے ناموں کے بعد اپنے ناموں کو ذکر کرنے لگے۔ اس کے او بعد والے زمانے میں خود سلاطین خاص اپنے ہی واسطے مستقل طور پر دعا منگوانے لگے۔ مگر خلفائے راشدین کے حق میں دعا کرنا آج تک جاری ہے۔ اور تمام اسلامی ملکوں اور اسلامی آبادیوں میں ہر ایک جماعت جمعہ کے وقت ان کے لئے دعا کرتی ہے۔

سکہ خلافت یا علے الاطلاق شاہی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ نقود (روپیہ پیسہ اور اشرفی) پر ایک لوہے کے ٹھپہ سے نقش ابھارے جاتے ہیں جس میں خلیفہ یا سلطان کا نام کھدا ہوتا ہے۔ اس کو سکہ کہتے ہیں اور سکہ حکومت کے لئے نہایت ضروری چیز ہے۔

اسلام سے پیشتر اہل عرب کے نقود اسلام سے قبل کسریٰ اور قیصر کے سکوں سے کام

چلاتے تھے، جو درہم اور دینار کہلاتے تھے، دینار سنہری اور درہم روپہلی سکے ہوتے تھے، ایسے جیسے آج کل ہمارے ہاں غنی اور ریال ہوتے ہیں۔ اہل عرب سونے کو "عین" اور چاندی کو "ورق" سے تعبیر کرتے تھے، ان کے یہاں کچھ سکے تانبے کے بھی رائج تھے، جن میں سے "حبہ" اور "دانق" کا نام مشہور ہے، لیکن ان تمام نقدیات کا مرجع وزن تھا، کیونکہ دینار سے وہ سونے کا ٹکڑا مراد تھی، جس کا وزن ایک مثقال ہو اور اس پر اس بادشاہ یا شہنشاہ کا سکہ ہو جس نے اسے ضرب کیا ہو، درہم سے ایک درم کے ہموزن چاندی کا سکہ مراد ہوتا تھا جس کو "وافی" بھی کہتے تھے، آج کل دینار اندازاً دس فرانک کے برابر ہوتا ہے۔ اہل عرب کے یہاں دینار دس درم کا ہوتا تھا اور بسا اوقات اس کی قیمت ۱۲ تک دس اور پندرہ کے مابین بدلتی رہتی تھی، یا حالات کے موافق کبھی اس سے بھی بڑھ جاتی، گویا درہم فرانک کے برابر ہوتا تھا، یا بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ ایک چاندی کا درم تقریباً چار غروش مصری کے مساوی ہوتا تھا۔

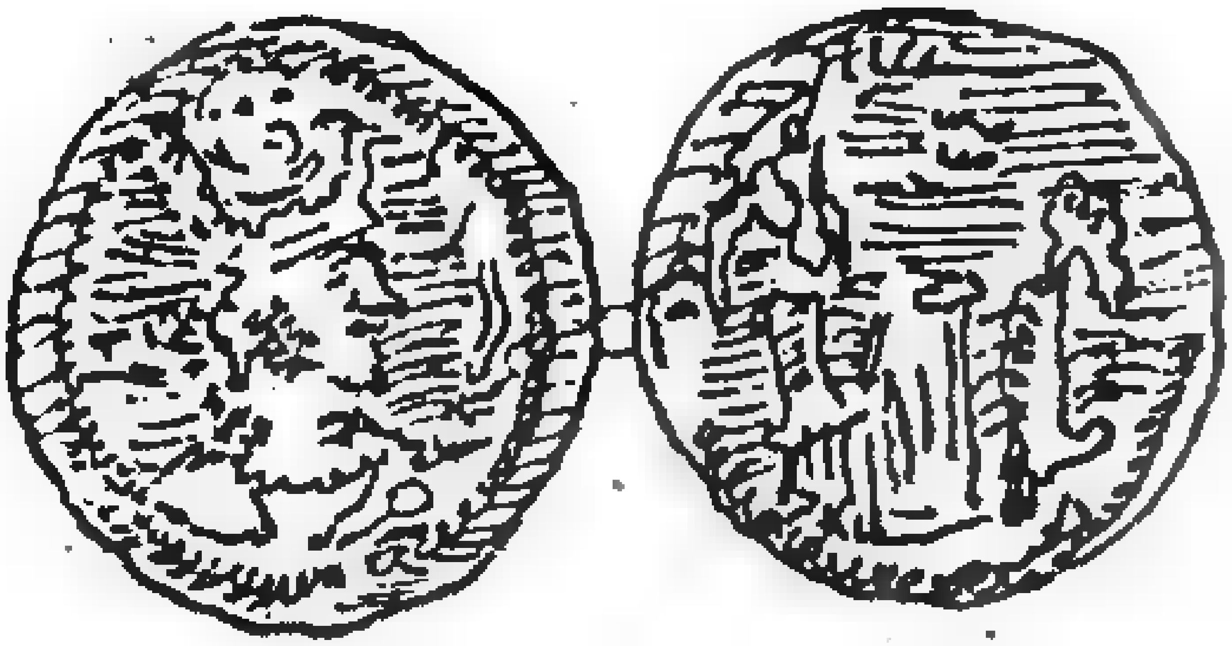
احکام السلطانیہ کے مصنف نے بیان کیا ہے کہ فارسی درہم تین وزنوں کے ہوا کرتے تھے (۱) مثقال کے وزن سے بیس قیراط بھر اسی کو دراہم بغلیہ کہتے تھے، (۲) جس کا وزن ۱۲ قیراط ہوتا تھا (۳) وہ درم جو وزن میں دس قیراط ہوتا مصنف مذکور کے علاوہ اور لوگوں نے ایسے درموں کا ہونا بھی بیان کیا ہے، جن میں سے صرف ایک درم کا وزن چھ مثقال ہوتا تھا اور ان کو "بھاری بھری درہم" کہتے تھے، اور ایک درم پانچ مثقال کے برابر ہوتا، جسے "ہلکا تمری درہم" کہتے ہیں۔ یہ سب درم ملک فارس کے سکے تھے۔



(دینار رومی)

دینار اسلام سے قبل عرب والوں کے یہاں دو طرح کے دینار پائے جاتے تھے (۱) ہر قلی یا رومی (۲) کسروی یعنی فارسی درم بھی ایسے ہی تھے۔ لیکن گمان غالب یہ ہے

کہ ان کے لین دین میں رومی دینار اور فارسی درہموں کا استعمال ہوتا تھا، اسی وجہ سے ہرقلی دینار انھیں بہت عزیز اور بہت پسند تھے، یہاں تک کہ ان کی خوبصورتی اور چمک دمک کو انھوں نے ضرب المثل بنا رکھا تھا۔

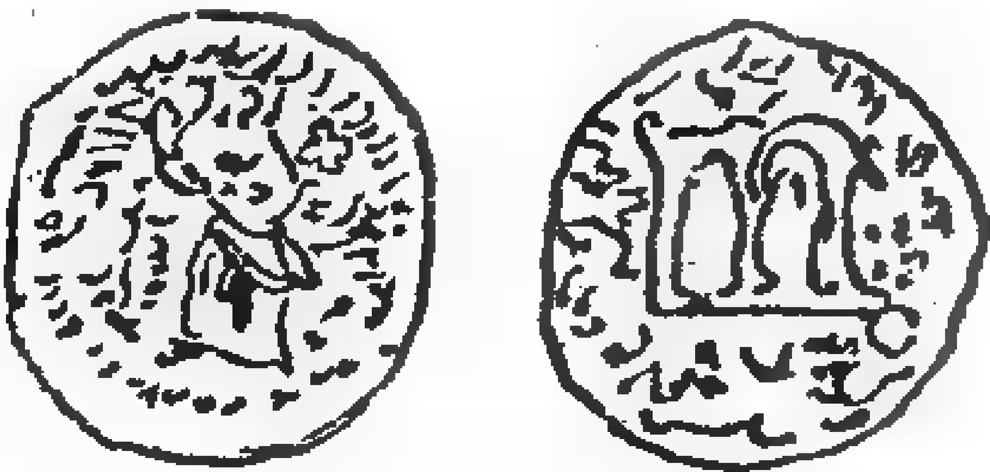


دینار فارسی

دینار لاطینی زبان کا لفظ ہے اس کی اصل ایک ایسے چاندی کے ٹکڑے پر دلالت کرتا ہے، جو دس "آس" کے مساوی ہو "آس" رومی درہموں میں سے ایک قسم کا درہم ہوتا تھا، اسی لئے پہلے پہل دینار مضروب ہوا تھا، دینار کا لفظ لاطینی زبان والوں کے یہاں لفظ ( ) سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں دس۔ اس دینار کا وزن سات رومانی اوقیہ یا ایک رطل (لیبرہ) کے دسویں حصّہ کے برابر ہوتا تھا، یعنی وہ لوگ ایک لیبرہ چاندی کو سو دیناروں پر تقسیم کرتے تھے، اس کے بعد ان لوگوں نے طلائی دینار مضروب کیا، اس وجہ سے ان کے یہاں دو قسم کے دینار ہوگئے۔ ایک چاندی کا اور دوسرا سونے کا۔ لاطینی لوگوں سے اہلِ فارس نے سیکھ کر اپنے یہاں بھی ویسے ہی سکے مضروب کئے، اور انھیں ناموں سے موسوم کیا۔

اسلامی سکّے

اہلِ عرب ظہورِ اسلام اور ملکوں کو فتح کرنے کے بعد حکومتِ اسلامی کے زمانۂ قیام تک رومی اور فارسی سکوں سے لین دین کرتے رہے، مگر قیامِ سلطنت کے بعد ان کو اپنا تمدن قائم کرنا منظور ہوا، اس تمدن کی ضروریات میں سکہ بھی داخل تھا، لہٰذا انھوں نے پہلے پہل اپنے اور اہلِ روم و فارس کے مابین مشترک وضع کے درہم و دینار مضروب کئے، ان سکوں میں سے ایک سکہ وہ تھا جسے



۱۵ھ میں خالد بن الولید نے بمقام طبریہ مضروب کرایا، یہ سکّہ بالکل رومی دینار کے ہمشکل تھا، اس میں ایک طرف صلیب تاج اور چوگان وغیرہ کا نقش تھا، اور دوسری طرف یونانی حروف میں خالد کا نام (XAAEA) اور بہ حروف ( ) منقوش تھے اس شکل ناقل پر ڈاکٹر مولر مشہور جرمن مؤرخ

گمان کرتا ہے کہ یہ حروف "ابو سلیمان" کے مقطع ہیں؛ جو خالد کی کنیت تھی۔



(نقود معاویہ بن ابی سفیان)

ایک اور دوسرا قطعہ بھی تھا جو معاویہ کے نام پر مضروب ہوا تھا، لیکن اس کی شکل فارس کے ایک دینار سے نقش و نگار وغیرہ میں ملتی ہوئی تھی، صرف اتنا فرق تھا کہ اس پر معاویہ کا نام تھا؛ اور فارسی دینار پر نہیں۔ اس کی شکل بھی ہم نے ڈاکٹر سوئیر مذکور سے نقل کی ہے؛ دمیری نے ایک قسم کے نقود کا ذکر کیا ہے؛ جن کو "بغلیہ" کہتے تھے، وہ کہتا ہے کہ "راس البغل" نے اسے عمر بن الخطاب کے لئے ایک کسروی سکہ سے مضروب کیا تھا؛ جس پر بادشاہ کی تصویر تھی، اور کرسی کے نیچے فارسی عبارت میں "نوش خور" لکھا تھا؛ جس کے معنی ہیں آرام سے کھاؤ۔

جودت پاشا مرحوم کا بیان ہے کہ میں نے ایسے نقود بھی دیکھے؛ جن کو امیروں اور والیوں نے خلفائے راشدین کے عہد میں مضروب کرایا تھا؛ ان سکوں میں سب سے قدیم سکہ طبرستان کے قصبہ برزنک میں ۲۸ھ کے اندر مضروب ہوا تھا؛ جس کے دائرہ پر خط کوفی میں "بسم اللہ ربی" لکھا ہوا تھا، اور ایک قسم کا سکہ ۳۸ھ کا ضرب کیا ہوا دیکھا جس کے دائرہ پر بھی یہی عبارت موجود پائی اور ایک سکہ ۶۱ھ میں بمقام یزد مضروب ہوا تھا جس کے دائرہ پر پہلوی خط میں "عبد اللہ بن زبیر امیر المومنین" منقوش تھا، مگر یہ سکے اسلامی حکومتوں میں رواجاً معتبر نہ تھے؛ بلکہ اکثر ان کے لین دین رومی اور فارسی نقود سے ہوتے تھے۔

اسلامی سکوں کی ابتدا (۶۵ھ-۸۶ھ) عبد الملک بن مروان کے عہد حکومت میں یہ صورت پیش آئی کہ اس خلیفہ نے طراز (مارکہ) کو رومی سے عربی میں بدلنا چاہا جس کا بیان آگے آئے گا؛ شہنشاہ روم کو یہ بات ناگوار گزری، اس نے خلیفہ عبد الملک کو دھمکی دی، کہ تم طراز کو بدلو گے تو میں اپنے دیناروں پر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف شان الفاظ منقوش

کرادیں گا، عبدالملک کو اس بات کے سننے سے سخت صدمہ گزرا، اس نے مسلمانوں کے بڑے بڑے ذی وجاہت اور اہل الرائے لوگوں کو جمع کرکے ان سے اس بارہ میں رائے لی، انھیں لوگوں میں سے کسی نے اسے بتایا .... کہ اس معاملہ میں امام محمد باقر سے جو اہل تشیع کے بارہ اماموں میں سے ایک امام ہیں۔ اور اس وقت مدینہ میں رہتے تھے، مشورہ لو، اگرچہ عبدالملک کو گوارا تو نہ تھا کہ بنو ہاشم کے کسی امام سے کچھ مدد مانگے اس لئے کہ وہ حکومت اور ملک داری میں اس کے مدمقابل بنتے تھے، لیکن مجبوری تھی اُن سے مدد لئے بغیر کام بھی نہ چل سکتا تھا، اس لئے انھیں بلوانا ہی پڑا، عبدالملک نے اپنے عامل کو جو اس کی طرف سے مدینہ میں مقرر تھا لکھا: "محمد بن علی بن حسین رضؓ کو بہت عزت کے ساتھ میرے پاس بھیج دو۔ اور انھیں ایک لاکھ درم سفر خرچ کے لئے اور تیس ہزار درم خرچ خانگی کے واسطے نذر کرو، اس کے علاوہ خود وہ یا جو لوگ ان کے ہمرکاب سفر کرنے پر آمادہ ہوں، سب کے لئے سفر کے سامان میں آسانی پیدا کرنے کی کوشش کرو، چنانچہ جب امام محمد باقر دمشق میں آگئے۔ تو عبدالملک نے ان سے شاہنشاہ روم کی نیت کا حال بیان کر کے اس بارہ میں مشورہ چاہا، کیونکہ رومی شاہنشاہ اسلام کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر آمادہ تھا، امام موصوف نے فرمایا تم اس بات سے پریشان نہ ہو، اسی وقت کاریگروں کو بلاؤ وہ تمھارے سامنے ہی بیٹھ کر درم اور دینار کے سکے تیار کریں، ان پر توحید باری اور ذکر رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) منقوش کراؤ۔ درم اور دینار کے ایک طرف ذکر خدا ہو اور دوسری جانب ذکر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور درم و دینار کی گولائی میں اس شہر کا نام ہو جہاں وہ مضروب ہو اور سنہ جس میں ضرب کیا گیا۔ علاوہ بریں تیس درہموں کو تینوں قسم کے درہموں میں سے منگا کر وزن کرو دس وہ جن کا وزن دس مثقال فی درہم ہوتا ہے۔ اور دس چھ مثقال فی درہم وزن والے اور دس درہم پانچ پانچ مثقال کے، ان تینوں کا وزن ۲۱۰ مثقال ہو گا۔ مجموعی وزن کو تیس پر تقسیم کرنے سے فی درہم سات مثقال کا وزن پڑے گا۔ کانچ کے باٹ ڈھلوائے جائیں جو سات مثقال سے کم یا بیش نہ ہوں، اس کے بعد دینار دس مثقال وزن کے اور درم سات مثقال کے مضروب کیے جائیں"

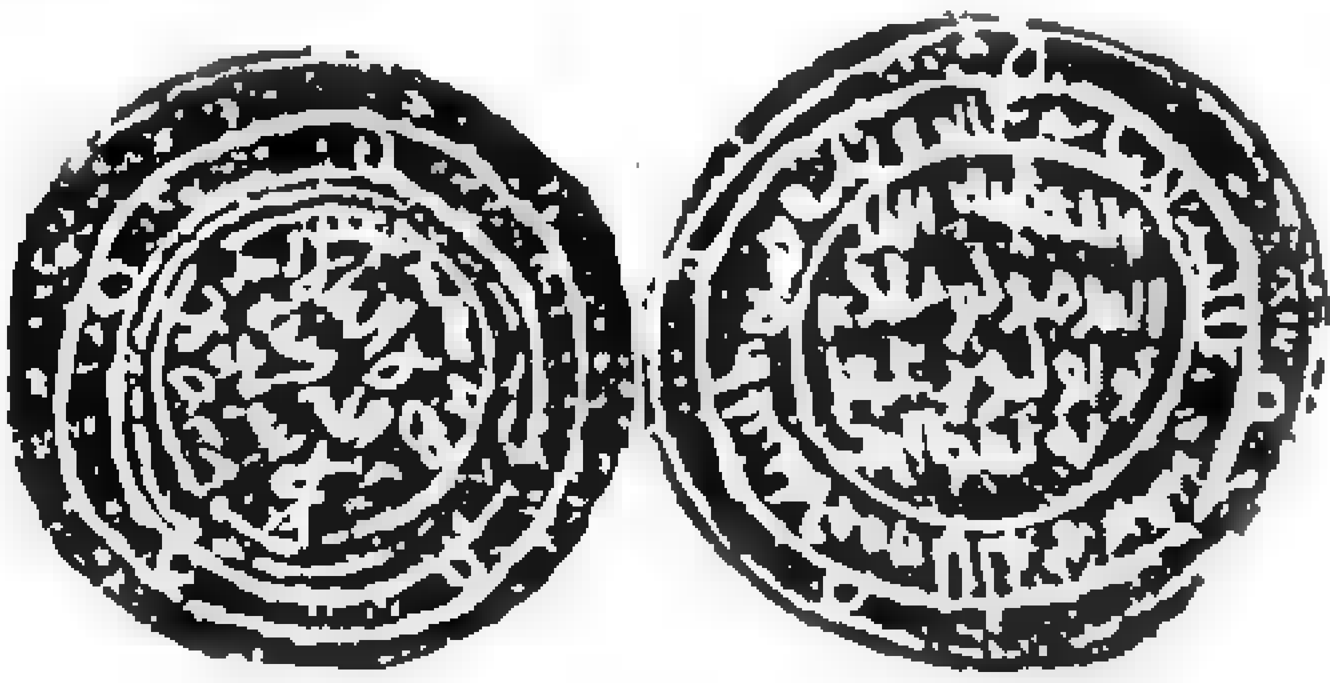
عبدالملک نے اس رائے پر عمل کر کے اپنے سکے تمام اسلامی ممالک میں بھجوا دیئے۔ اور لوگوں کو انھیں کا لین دین کرنیکی ہدایت کی۔ ان درہموں اور دیناروں کے علاوہ اور سکوں سے معاملہ

کرنے والوں کو قتل کی دھمکی دی، اور ہدایت کی کہ اس کے پہلے کے رائج سکے بیکار کر کے ٹکسالوں میں داخل کر دیے جائیں تاکہ وہ دوبارہ اسلامی سکوں کی شکل میں مضروب کیے جائیں۔

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ دمیری کا قول ہے، لیکن ابن اثیر نے یہ رائے خالد بن یزید بن معاویہ کی جانب منسوب کی ہے، اور ابن اثیر کے علاوہ اور لوگوں نے اُسے بعض دوسرے شخصوں کی جانب بھی منسوب کیا ہے، عبد الملک کے ضرب کرائے ہوئے دینار "دینار دمشقی" کے نام سے منسوب ہیں، عبد الملک کے عامل "حجاج" نے جو ملک عراق کا گورنر تھا، یہ حکم دیا کہ دینا کی قیراطوں سے پندرہ قیراط کا درم مضروب ہو، اس کے بعد عراق کے امراء (حکام) اکثر حالتوں میں بنی اُمیہ کے لئے سکے ضرب کرتے رہے۔

اموی سکے

بنو اُمیہ کے سکوں کا نقش ایک جانب بیچ میں "لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ" اور اس کے گرد "بسم اللّٰہ ضرب ھذا الدرھم ببلد کذا سنۃ کذا" ہوتا تھا اور دوسری طرف وسط میں "اللّٰہ احد اللّٰہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہٗ کفوا احد" جس کے گرد "محمد الرسول اللّٰہ ارسلہ بالھدیٰ ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون" منقوش ہوتا تھا، یہ عبارت دینار اور درم دونوں پر یکساں نقش کی جاتی تھی۔

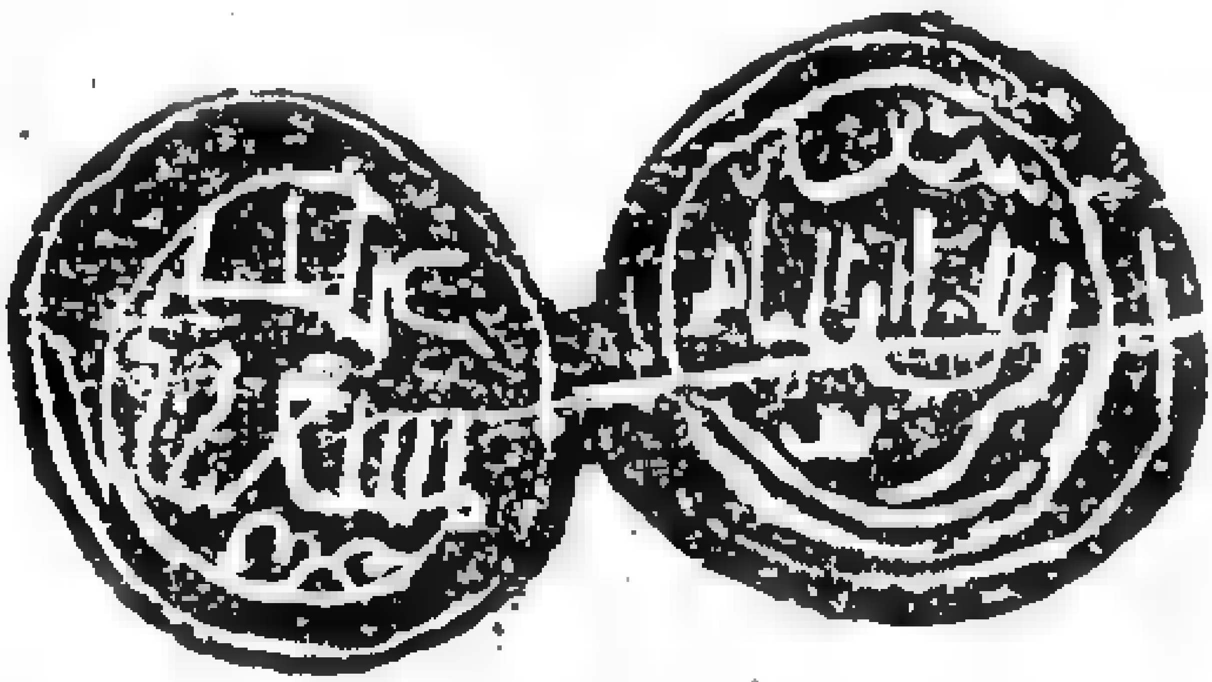


نقود عبد الملک بن مروان

اسی وقت سے مسلمانوں نے رومی اور فارسی سکوں کا استعمال بند کر دیا۔ بنو اُمیہ کے نقود میں، سب سے زیادہ جید سکے وہ تھے، جن کو عمر بن ہبیرہ نے مسکوک کرایا تھا، اور وہ "ہبیریہ" کے نام سے مشہور تھے، ان کے علاوہ دو سکے اور بھی تھے (۱) خالدی منسوب بہ خالد بن عبد اللہ البجلی (۲) "یوسفیہ"، یوسف بن عمرو کے مضروب کئے ہوئے، یہ سب لوگ اموی خلفا کی جانب سے ملک عراق پر عامل تھے، چنانچہ جس وقت عنان خلافت بنو عباس کے ہاتھ میں گئی ہے۔ تو خلیفہ منصور عباسی وصول خراج کے وقت سوائے ان تین سکوں کے زمانہ بنی اُمیہ کے دوسرے سکے ہرگز نہیں لیا کرتا تھا۔

اسلامی سکّوں کی خصوصیت

اسلامی نقود کی تاریخ نہایت طویل ہے جس کے بیان کا یہ موقع بھی نہیں، ہماری کتاب تاریخ "مصر الحدیث" میں اکثر نقود اسلامی کی شکلیں اور ان کے مضروب کرانے والوں کے نام مذکور ہوئے ہیں۔ مگر مختصراً اس قدر کہنا ضروری ہے کہ اسلامی مسکوکات مسلمانوں کی تمام دار السلطنتوں اور ان کے مشہور شہروں میں جو ممالک عراق، شام، اندلس، خراسان، اور ہندوستان وغیرہ میں واقع ہیں، مضروب ہوئے تھے، اور وہ سب سکے، شکل، جسامت، اور عبارت میں ایک دوسرے سے ویسے ہی جدا ہوتے تھے، جیسے زمانہ اور حکومتیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ پہلے ان کی تحریر خط کوفی میں ہوا کرتی تھی۔ بعد ازاں مروجہ خط نسخ میں لکھی جانے لگی۔ یہ تغیر ۶۲۱ھ میں العزیز محمد بن صلاح الدین الایوبی حاکم مصر کے عہد میں ہوا۔



(نقود العزیز بن صلاح الدین)

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام اوائل میں دوسری صدی ہجری کے آغاز تک سکوں کی عبارت میں اس شہر کا ذکر نہیں کیا کرتے تھے جس میں وہ مضروب ہوا ہو بلکہ جس وقت ضرب کی تاریخ کا ذکر کرتے تو اس کے پہلے سنہ کا لفظ لکھتے تھے۔ بعد میں اس لفظ کو بھی لفظِ "تمام" سے بدل دیا۔ اور اکثر حالتوں میں یوں لکھتے تھے "فلاں سنہ کے مہینوں یا فلاں سال کے مہینوں میں یا فلاں شخص کے عہد حکومت میں" تاریخ ابتداءً تعداد جمل کے حساب سے حرفوں میں لکھی جایا کرتی تھی۔ بعدہٗ رقموں میں لکھی جانے لگی۔ سب سے پہلے جو سکے ایسے پائے گئے کہ ان پر رقموں میں تاریخ لکھی تھی وہ ۶۱۴ھ کے ڈھلے ہوئے تھے۔

دار الضرب یا ٹکسال

سلطنت کے لئے اس وقت بھی دار الضرب کا وجود ویسا ہی ضروری تھا، جیسا کہ ہم آج کل دیکھتے ہیں۔ اور اسلامی حکومتوں کی اُن کے ہر ایک دور میں یہی حالت تھی، چنانچہ کوئی پایۂ تخت یا صدر مقام ٹکسالوں سے خالی نہ ہوتا تھا۔ بغداد، قاہرہ، دمشق، بصرہ، اور قرطبہ وغیرہ میں تو بہت بڑی بڑی ٹکسالیں تھیں۔ دار الضرب میں ان نقود پر جو وہاں مضروب ہوتے تھے، ایک قسم کا

محصول (ٹیکس) لیا جاتا تھا؛ جسے لکڑی کی قیمت اور سکہ ڈھالنے والوں کی اُجرت سے موسوم کرتے تھے؛ اس ٹیکس کی مقدار ایک درم فیصدی تھی۔ بسااوقات باختلاف مقامات یہ ٹیکس بھی مختلف ہوتا تھا، اور حکومت کو اس مد سے معقول آمدنی رہتی تھی۔

جس مقدار کے سکے کوئی سلطنت مضروب کراتی تھی اُس کی حالت مختلف ہوتی تھی؛ لہٰذا اس بات کا صحیح اندازہ کرنا کہ ہر سلطنت میں اتنے سکے مضروب ہوئے ایک دشوار امر ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے یہاں سکے کی حالتیں بہت کچھ بدلتی رہی تھیں؛ کبھی تو ایک حکومت کے قیام کو کئی کئی سال گذر جاتے تھے؛ مگر وہ اپنا سکہ مضروب نہ کراتی تھی؛ بلکہ کسی دوسری سلطنت کے سکوں سے اپنا کام چلاتی رہتی تھی؛ کبھی ایسا ہوتا کہ اپنے یہاں بھی نقود ڈھلوانی؛ اور دوسری حکومتوں کے نقود سے بھی معاملات رکھتی تھی؛ ان سب باتوں کا مفصل بیان تو محال ہے لیکن ہم مثال کے طور پر جو کچھ اس بات کے متعلق ہمیں مل سکا یہاں لکھے دیتے ہیں۔

"نفح الطیب" میں آیا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں جبکہ اندلس کی حکومت بنی مروان کے قبضہ میں تھی وہاں کے عملہ ٹکسال کی آمدنی جو صرف درہموں اور دیناروں کے ڈھلنے سے حاصل ہوتی تھی .... ۲ دینار تک پہنچ گئی تھی، دینار کا تبادلہ ستر درہموں سے ہوتا تھا؛ ہم اس آمدنی کو ایک فیصدی مال مضروب کے اعتبار سے دیکھیں تو محض ان نقدیات کی مقدار جو اندلس میں مضروب ہوتے تھے؛ .... ۲ لاکھ دینار ہوتی تھی جو ایک کروڑ گنی کے مساوی ہے۔ اور اس تعداد سے دو حصے بڑھ کر جو آج کل دولت انگلشیہ مضروب کراتی ہے؛ حالانکہ اس کی عظمت و جبروت تمام عالم میں آشکار ہے۔ اور وہ اس اس وقت پورے عروج پر ہے؛ اگر نقود مضروبہ اندلس پر ان سکوں کی تعداد کا بھی اضافہ کیا جائے جو دولت فاطمیہ کے پایۂ تخت قاہرہ اور حکومت عباسیہ کی دارالسلطنت بغداد اور اس کے ماسوا ان دیگر بڑے بڑے اسلامی شہروں میں جو ان دنوں حکمرانی کے مرجع بن رہے تھے مضروب ہوتے تھے؛ تو ان سب مسکوکات کی مقدار بڑی بھاری ہو جائیگی؛

اُس زمانہ میں نقود کی ضرب نہایت سادہ حالت میں تھی؛ یعنے ایک لوہے کا سانچہ لے کر اس میں وہ عبارت جس کا درم یا دینار پر اُبھارنا مقصود ہوتا؛ اُلٹی نقش کیجاتی؛

پھر سونے یا چاندی کے ٹکڑے جن کا وزن درم اور دینار کے برابر ہونا تھا، لے کر سانچہ (ٹھپہ) کو اس پر رکھتے، اوپر سے ایک بھاری گھن لے کر چوٹ لگاتے۔ یہاں تک کہ ٹھپہ کے حروف اس طلائی یا نقرئی ٹکڑے پر نمایاں ہو جاتے؛ پہلے اسی لوہے کے ٹھپہ کا نام سکہ رکھا گیا تھا، اس کے بعد اس نشان کو کہنے لگے جو نقدیات پر بنجاتا تھا، پھر اس سے بھی بعد کے زمانہ میں یہ معنے منتقل ہو کر اس کام کے انتظام اور انجام دہی کے لئے مستعمل ہونے لگے، جو کہ ایک عہدہ تھا، لہذا یہ لفظ اس منصب کا علم (مخصوص نام) ہو گیا۔ دارالضرب میں بہت سے چھوٹے بڑے عہدے ہوتے تھے، اور ان کے علاوہ بہت سے کاریگر تولنے، ناپنے، ضرب لگانے اور پرکھنے والے وغیرہ۔

طراز

طراز مارکہ بھی علامات خلافت میں داخل تھا، مارکہ کا وجود سلطنتوں میں قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے؛ اہل روم و فارس کے یہاں بھی اس کا استعمال جاری تھا، مارکہ کی صورت یہ تھی کہ شہنشاہ لوگ یا سلاطین اپنے ناموں یا مخصوص علامتوں کو اپنے لباس کے کپڑوں جو دیبا یا حریر یا ریشمی قسم کے ہوتے تھے منقوش کراتے، مگر اس طور سے کہ گویا وہ کوئی تحریر ہے جو بناوٹ ہی میں کپڑوں پر لکھدی گئی ہے؛ یہ تحریر کلا بتو یا کپڑے کی رنگت سے کسی مختلف رنگ کے دھاگوں سے بُنی جاتی تھی؛ اس کی وجہ سے اعیان دولت اور شاہی لباس میں ایک خاص قسم کا امتیازی رنگ پیدا ہو جاتا تھا؛ اور دیکھنے والا سمجھ سکتا تھا کہ اس لباس کا پہننے والا خود بادشاہ ہے، یا اس کا کوئی عزیز و قریب جیسا کہ آج کل فوجی لوگوں کے لباس میں طرح طرح کی علامتیں ہوتی ہیں۔ کسی کی وردی پر سنہری روپہلی فیتے لگے ہوتے ہیں، اور کسی میں زری تکمے وغیرہ مختلف علامتوں کا امتیاز رکھا جاتا ہے۔ مثلاً تاج کی تصویریں، تلواروں کے نقش یا ستارے وغیرہ بنے ہوتے ہیں۔ اور ان سے عہدوں اور مراتب کا فرق معلوم ہوتا ہے؛

روم اور فارس کے حکمران اپنے یہاں کے نامور بادشاہوں یا خود اپنی ہی تصویروں کو طراز مقرر کیا کرتے تھے۔ یا اور اسی وضع کے دیگر نشانات جو حکمرانی پر دلالت کرتے ہوتے تھے، مسلمانوں نے قیصر و کسرای کے تخت پر جلوس کرنے کے بعد عظمت و اقتدار کے زمانہ میں ان

کی پیروی پسند کی، لیکن انھوں نے بعض حدیثوں کی عبارت میں تصویروں کی حرمت پائے جانے کا خیال کرکے تصویروں کو ترک کر دیا؛ اور ان کے بدلے اپنے ناموں کا لکھنا یا بعض ایسے کلموں کا منقوش کرانا مناسب سمجھا جو فال یا دُعا کے قائم مقام ہوں۔

طراز کی تبدیلی مسلمان شاہنشاہوں میں سب سے پہلے جس شخص نے طراز کو عربی زبان میں نقل کیا وہ عبدالملک بن مروان اموی تھا؛ خلفائے راشدین اپنی اسی بدویانہ سادگی کے دلدادہ رہے اور انھوں نے اس قسم کی شان و شکوہ دکھانے کا خیال تک نہ کیا تھا؛ کاروبارِ خلافت پر بنو اُمیہ کا قبضہ ہونا اور اُن کا اہلِ روم سے میل جول اس بات کا موجب ہوا کہ مسلمان حکمران بھی حکومت کے اکثر طرز و انداز میں اہلِ روم کے قدم بہ قدم چلیں۔ منجملہ انھیں تقلیدوں کے ایک بات یہ بھی تھی کہ روم والوں کے کپڑوں، باربرداری اور سواری کے جانوروں اور قرطاسوں پر مارکہ بنا ہوا تھا؛ (قرطاس ایک قسم کی چادر ہوتی تھی جو ملکِ مصر میں بنا کرتی تھی؛ اور اس میں باندھ کر ظروف اور کپڑے ملک عرب بھیجے جاتے تھے) مسلمانوں نے طراز کو بالکل اسی انداز سے استعمال کرنا شروع کر دیا؛ جیسا کہ اہلِ روم کے یہاں مستعمل تھا، اور اس پر کی عبارت بھی رومی زبان ہی میں تحریر ہوتی رہی؛ عبدالملک بن مروان کے عہد تک وہ اسی طریقہ پر عامل رہے؛ جس نے اس طراز کو عربی زبان و خط میں بدل دیا، اور اس جدید تغیر کی ابتداء قرطاسوں ہی سے شروع کی۔ قرطاس ملکِ مصر میں بُنی جاتی تھی؛ مصر کے اکثر باشندے اس زمانہ میں اپنے اصلی مذہب عیسائیت ہی کے پابند ہونے کے لحاظ سے قرطاسوں پر رومی زبان کا طراز بناتے تھے؛ جس کی عبارت "بسم الاب، والابن والروح القدس"؛ ہوتی تھی۔ اسلام کا ظہور ہوا، ملکِ مصر اور شام فتح ہو کر اہلِ اسلام کے قبضہ میں آ گئے۔ لیکن طراز اپنی اسی اگلی حالت پر قائم رہا، عبدالملک اس بات سے یوں مطلع ہوا کہ ایک دن وہ اپنے دربار میں بیٹھا تھا کہ اُس کی نظر کسی قرطاس پر جا پڑی اس نے دیکھا کہ اُس پر رومی زبان اور خط میں طراز بنا ہے، اُسے خیال گذرا کہ اُس کے مضمون سے آگاہی حاصل کرے، حکم دیا کہ اس عبارت کا عربی میں ترجمہ کیا جائے۔ ترجمہ ہوا اور مضمون سے مطلع ہو کر عبدالملک کو یہ بات نہایت شاق گذری، اور اُس نے کہا:" دین اور اسلام کے

اندر یہ کیسی سخت اور نازیبا بات ہے کہ قرطاسوں وغیرہ کا طراز جو ملک مصر میں جانوروں وغیرہ کی شکل میں بنایا جاتا ہے ساری دنیا میں رائج رہے۔ اور اس میں اس قسم کی خوبصورتیں اور باتیں لکھی ہوں۔ اس کے بعد اس نے اپنے بھائی عبدالعزیز بن مروان کو جو حاکم مصر تھا لکھا کہ اس طراز کو بند کردے، جو قرطاس یا کپڑوں پر بنا دیا جاتا ہے۔ اور جو عبارت اس پر تحریر ہوتی ہے اُسے توحید کے کلمہ "لا الٰہ الا ہو" سے بدل دے۔ عبدالعزیز نے اپنے حکمران بھائی کے حکم کی تعمیل کی، اور اس کے بعد تمام اسلامی حکومتوں میں یہی طراز مستعمل ہوتا رہا۔ اس کے اصل الاصول میں کوئی تغیر نہیں کیا گیا۔ نیز عبدالملک نے اپنے ملک کے تمام عاملوں کو حکم بھیجا کہ اہل روم کے طراز سے آراستہ قرطاس جس قدر ان کی حدود ولایت میں دستیاب ہوں ان سب کو تلف کر دیں اور آئندہ جس شخص کو ایسے قرطاس کا استعمال کرتے دیکھیں اُسے بڑی بھاری قید اور سخت ضرب کی سزا دیجایا کرے۔

شہنشاہِ روم کا خط

اس امتناعی حکم کا نتیجہ ظاہر ہے کہ جس قدر رومی طراز بنے ہوئے قرطاس اور دیگر سامان اسلامی ممالک میں فروخت کی غرض سے موجود تھے وہ سب بے کار ہو کر ممالکِ روم کو واپس گئے اور نیز نئی ساخت کے قرطاس بھی رواج پا کر ملکِ روم میں پہنچے۔ شہنشاہِ روم کو اس بڑے انقلاب کی اطلاع ملی اور جب اسلامی وضع کے قرطاسوں پر لکھی ہوئی عبارت سے مطلع ہوا تو اُسے بہت غصہ آیا۔ جوشِ غضب میں اس نے عبدالملک بن مروان کو لکھا کہ "ملک مصر میں قرطاسوں کا بنانا اہلِ روم کے ہاتھ ہے اور وہاں جتنی چیزوں پر طراز بنایا جاتا ہے وہ سب رومی زبان میں بنتا ہے۔ یہ قاعدہ ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ پس اگر تم سے پہلے خلفا اس عمل کے جاری رکھنے میں حق پر تھے تو تم نے بڑی غلطی کی ہے کہ اب اسے باطل کر دیا۔ اور اگر تم نے امرِ حق کو رائج کیا ہے تو تم کو ماننا پڑے گا کہ تمھارے اگلے پیشرو غلطی پر تھے۔ اب تم کو اختیار ہے کہ ان دو الزاموں میں سے جو لنا پسند کرو اپنے اوپر لے لو۔" اس اشتعال دلانے والی تحریر کے ساتھ ہی کچھ دوستانہ تحفے بھی روانہ کئے، جن سے مقصود یہ تھا کہ عبدالملک خوش ہو کر اگلے طراز کو رائج رکھے، عبدالملک نے ہدیہ واپس کئے اور سفیرِ روم کو صاف جواب دیدیا کہ "میں اپنے فرمان کی تردید نہیں کروں گا۔ دوبا

قیصر روم نے اور بہت سے عمدہ عمدہ تحائف نذر کر کے اسی قدیم طراز کا رواج چاہا۔ اور اپنی تحریر کا مناسب جواب طلب کیا، عبدالملک نے کوئی جواب نہیں لکھا۔ اس پر شہنشاہ روم کو اور بھی جوش آیا اور اس نے عبدالملک کو یہ دھمکی دی کہ اگر میری بات نہ مانو گے تو میں نقد یا:: پر نبی عربی صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف شان الفاظ منقوش کراؤں گا، یہ تخویف عبدالملک کو چونکا دینے اور اصلی اسلامی نقود بنانے کی محرک ہوئی جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، قرطاسوں کا معاملہ تو یہ تھا جس سے ظاہر ہو گیا کہ اہل اسلام کپڑوں پر طراز بنانے کے لئے اسی وقت سے تنبہ ہو چکے تھے، انھوں نے فوجی سپاہیوں کے اور عہدہ داران سلطنت کے لباسوں پر حکومت کا معرکہ بنایا جو کہ خلیفہ کا نام یا اس کا لقب ہوا کرتا تھا، یا اسی کے مثل کوئی اور عبارت، اس طراز کا علامات حکومت یعنے علموں، جھنڈوں، اور وردیوں پر باقی رہنا اس کے قیام اور بقاء پر دلالت کرتا ہے، اس لئے جب کوئی والی (حاکم صوبہ) خلیفہ کی اطاعت سے نکلنے کا قصد کرتا تو اس کا خطبہ بند کر دیتا۔ اور طراز سے اس کے نام کو خارج کر دیتا تھا، جیسا کہ مامون الرشید نے اپنے گورنر خراسان ہونے کے زمانہ میں کیا تھا، جب اسے یہ خبر لگی کہ اس کے بھائی امین نے جو خلیفہ تھا اس کی بیعت کا عہد توڑ ڈالا ہے تو وہ بھی باغی بن بیٹھا اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے کے لئے جنگ پر تیار ہو گیا،

طراز بنانے کے کارخانے

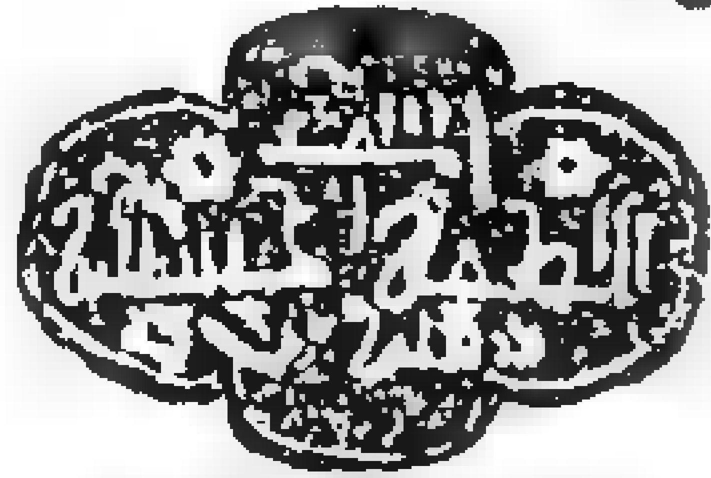
خلفا نے اپنے قصروں میں طراز بنانے کے لئے بڑے بڑے کارخانے کھولے تھے، جن میں ان کے خاص لباس بُنے جاتے تھے، اور ان پر اس طراز کو منقوش کیا جاتا تھا، اس کارخانہ کا نگراں اور منتظم "صاحب الطراز" کے نام سے موسوم ہوتا تھا، صاحب الطراز۔ رنگ۔ اوزار اور بننے والوں کے کام کا نگراں رہتا تھا، ان کی مزدوری اور تنخواہیں تقسیم کراتا اور ان کی کارگزاریوں کو اپنے ذریعہ سے بارگاہ خلافت میں پیش کرتا، خلفاء کا اصول تھا، کہ اس کارخانے کا کاروبار اپنے خاص الخاص اراکین دولت اور معتبر غلاموں کے سپرد کیا کرتے تھے، اندلس میں دولت امویہ اور مصر میں حکومت فاطمیہ نے بھی اسی طریقہ پر عمل کیا اور اس زمانہ میں جو اور شاہان عجم حکمران تھے ان کے یہاں بھی یہی حالت تھی،

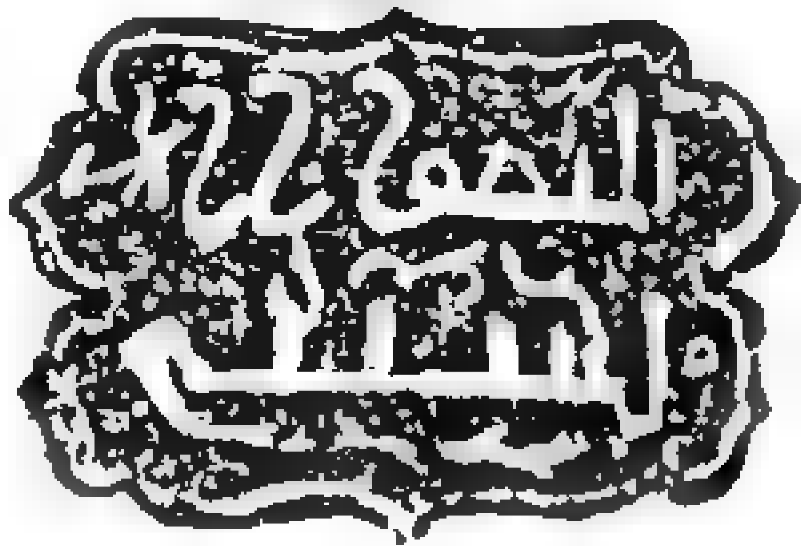
دار الکسوہ حکومت بنی فاطمہ کے عہد میں جس مکان کو دار الکسوہ کے نام سے نامزد کرتے تھے وہ بھی اسی قسم کا ایک کارخانہ تھا۔ اسمیں طرح طرح کے پہننے کے کپڑے اور بنے ہوئے دیگر پارچات تیار ہوا کرتے تھے، چنانچہ اس کارخانہ سے جس قدر کپڑے ایک سال میں بنکر نکلتے تھے، ان کی قیمت ...... ۶ دینار ہوتی تھی، خلفائے بنو فاطمہ اپنے دربار کے امیروں کو دبیقی پوشاک اور سنہری طراز بنے ہوئے عمامے کا خلعت عطا کیا کرتے تھے، اس طراز وعماد کی قیمت پانچسو دینار ہوتی تھی، مذکورہ بالا حکومت کے حکمران سال میں دو مرتبہ خلعتیں تقسیم کرتے تھے، ایک دفعہ گرمی کا لباس اور دوسری دفعہ سردی کا، یہ کپڑے ادنٰے خادموں سے لے کر مقربین بارگاہِ خلافت تک سب کو حسب لیاقت ملتے تھے، اور عمامہ سے لے کر پائجاموں تک پورا لباس ہر شخص کو ملتا تھا، ۵۱۶ھ میں جتنے قطعات پارچہ کے اس کارخانہ سے برآمد ہوئے۔ ان کی تعداد ۱۴۳۰۵ تھی، اور مقریزی میں ایک خاص فصل ہے۔ جس میں صرف ان لباسوں کی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ جو مذکورہ بالا کارخانہ سے تقسیم ہوتے تھے،

اسلامی حکومتوں میں طراز بافی کے کارخانے اُسی پیمانے پر برابر قائم رہے۔ جو اوپر بیان ہو چکا ہے؛ لیکن جبکہ اس حکومت کا دائرہ اقتدار تنگ ہو کر اس کی قوت کمزوری سے بدل گئی اور اس کی بہت سی خود سر شاخیں پھوٹ نکلنے سے طوائف الملوکی کی سی حالت پیدا ہو گئی۔ تو اکثر حکومتوں سے یہ کاروبار ناپید ہو گیا۔ مگر طراز بذات خاص باقی رہا، اس کا وجود ان کے لباسوں پر حسب معمول ضرور ہوتا تھا، لیکن اب وہ کارخانے قائم کرکے نہیں بنوائے جاتے تھے۔ بلکہ جس قدر درکار ہوتے ملک کے کاریگروں سے ریشم یا سنہری سچے کام کے بنوائے جاتے تھے، اور وہ "مزرکش" کے نام سے موسوم ہوتے تھے جن پر سلطان یا امیر کا نام کاڑھا ہوا ہوتا تھا۔ سلاطین مملک (غلام سلاطین) نے مصر میں اسی طرح کام چلایا۔ دولتِ علیہ عثمانیہ کے عہد میں عثمانی طغرا کا نقش اور فوجی افسروں کی وردیوں کے سنہری فیتے اور دیگر منصب داران سلطنت کے نشانات اور علامتیں دوسری حکومتوں سے کچھ کچھ مشابہت رکھتی ہیں؛

نشانِ امتیاز

دولت عثمانیہ کے یہاں کا ہلال ایک ایسی علامت ہے جس کے مقابل ہم خلفاء کے عہد میں کوئی چیز معلوم نہیں کر سکے۔ ہاں جھنڈوں کا رنگ البتہ ہر ایک خاندان کے خلفاء نے جدا جدا رکھا تھا، اور وہ رنگ انہی کے ساتھ مخصوص رہا۔ جس کا مفصل ذکر آگے چل کر آجائے گا۔ اور ظاہرا یہ قیاس میں آتا ہے کہ وہ لوگ اپنے جھنڈوں اور نشانوں پہ خلفاء کا نام یا ان کے القاب لکھتے تھے، اور یہی نام ولقب جس طرح نقدیات پر منقوش ہوتا تھا، اسی انداز سے ان کے فوجی نشانات اور اسلحہ پر بھی۔





(اسم السلطان)

ابن خلکان نے عزیز باللہ فاطمی کی سوانحعمری میں لکھا ہے کہ اس کی مملکت بھی وسیع تھی حمص حماۃ شیرز اور حلب وغیرہ مقامات اس کے مفتوحات میں داخل ہو گئے تھے، اور منقلد بن مسیب فرمانروائے موصل نے اپنے دارالحکومت میں عزیز باللہ کا خطبہ پڑھا۔ اس کا نام سکوں اور دیگر نشاناتِ حکومت پر کھدوایا، بجکم کے بغداد پر قبضہ کر لینے کے بیان میں ابوالفدا لکھتا ہے کہ وہ ابن رائق کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کی نسبت سے اپنے فوجی نشان پر "رائقی" لکھوایا، اس سے ظاہر ہے کہ فوجی نشان اور دوسری علامتوں پر ناموں کا طراز بنوانا جو اوائل اسلام میں صرف خلفاء کے ساتھ مخصوص تھا، بعد ازاں اس کا تمام امیروں اور طاقتور لوگوں میں رواج پڑ گیا۔

تخت سلطنت منبر، سریر اور کرسی کو بھی مورخین نے حکومت کی نشانیوں میں شمار کیا ہے۔ اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آلاتِ حرب یعنی جھنڈیاں اور فوجی نشانات اور فوجی باجے بھی جن کا بیان فوج کے باب میں آئے گا اشاراتِ خلافت میں سے شمار ہوتے تھے:

صوبوں کی گورنری

اسلام سے قبل ولایت

ولایت صوبوں کی گورنری کو کہتے ہیں، سلطان یا بادشاہ ملکوں کے انتظام کے لئے کسی کو اپنا قائم مقام مقرر کرتا ہے ایسے قائم مقام کو اصطلاح میں عامل اور اس عہدہ کو "عمل" بولتے ہیں۔ یہ امر حکومت کا قدیم طرز ہے۔ جن دنوں اہل اسلام نے ملک شام کو فتح کیا ہے۔ وہ رومی حکومت کا ایک صوبہ تھا، جس کا نام اہل روم نے ولایت شرق رکھا تھا۔ اس صوبہ کی تقسیم گیارہ اقلیموں پر کی گئی تھی، جن میں سے ہر ایک اقلیم کے ماتحت متعدد شہر تھے؛ اور نیز ہر ایک کا ایک ایک صدر مقام بھی تھا چنانچہ اس موقع پر ہم ایک جدول میں ان اقلیموں کے نام ان کے ماتحت شہروں کی تعداد اور ان کے صدر مقامات کے درج کرتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

نمبر	اقلیم کا نام	ماتحت شہروں کی تعداد	صدر مقام
۱-	سوریا اوّل	۹	انطاکیہ
۲-	" دوم	۷	حماۃ
۳-	" سوم	۱۴	منبج
۴-	فینیقیہ اوّل - یا بحریہ	۱۲	صور
۵-	فینیقیہ دوم - یا لبنانیہ	۱۳	دمشق
۶-	عربیہ - حوران	۱۴	بصرٰی
۷-	الجزیرہ یا بین النہرین	۱۳	دیار بکر
۸-	اسروانا	۱۲	اورفا
۹-	فلسطین اولیٰ	۶	قیساریہ
۱۰-	" ثانیہ		بیسان
۱۱-	" ثالثہ		بطرا حجریہ

رُومی حکّام

ان میں سے ہر ایک اقلیم کا ایک عامل ہوتا تھا جو غالباً بطریق کے فرقہ سے ہوتا ہوگا۔ اہل روم کے یہاں بطریرک لوگوں کے علاوہ ایک اور معزز فرقہ تھا، جس نے شہر رومۃ الکبریٰ کے ساتھ نشوونما پائی تھی اور رومن امپائر کے دور میں اس کا اقتدار و اثر بہت بڑھا ہوا تھا، اس فرقہ کے لوگ بطریق کے نقب سے پکارے جاتے تھے، جس وقت رومانی حکومت کے حصّے بخرے ہو گئے یہ شرفا کا گروہ بھی بادشاہ گردی کے پھیر میں آگیا اور اس کا جاہ و جلال چھن گیا۔ حکومت کے تمام اہم کاروبار جو انہی بطریقوں کے ہاتھ میں رہا کرتے تھے ان کے قابو سے نکل گئے۔ اور آئندہ کے لئے یہ لوگ ان سے محروم ہوگئے۔ لیکن جب زمانہ میں رومن امپائر کی فتوحات کا سلسلہ مشرقی ممالک میں شروع ہوا۔ اور گورنمنٹ روما کو ان جدید مفتوح ملکوں میں گورنروں کے مقرر کرنیکی ضرورت محسوس ہوئی؛ گروہ بطارقہ کا اختر بخت بھی چمکا اور چونکہ اس گروہ کے لوگ ذہنگ منتظم اور لائق ہونیکی وجہ سے حکومت کے شایاں تھے، لہٰذا ان سے بڑھ کر اور کسی گھرانے کے لوگ اس کام کے لئے موزوں نہ پائے گئے۔ ان کو جدید ممالک مقبوضہ میں بڑے بڑے عہدے ملنے لگے۔ انہیں مقبوضہ مقامات میں ممالک مصر و شام بھی مع اپنے قرب و جوار کے داخل تھے؛ ملک شام کی ہر ایک اقلیم کا ایک افسر اعلےٰ ہوتا تھا؛ جو صدر مقام میں مقیم اور فوج، سامان جنگ اور قلعہ پر متصرف رہتا تھا، ان سب اقلیموں پر ایک اور اعلےٰ حاکم ہوتا تھا جیسے آج کل ملک ہندوستان میں ہز ایکسلنسی والسرائے بہادر ہیں۔ اسے ماتحت صوبوں کی گورنروں کی برطرفی، فوجی نقل و حرکت کا اختیار تھا، اور وصول خراج تقسیم تنخواہ و غیر ملکی کاروبار کا پورا پورا حق بھی اسی کو حاصل ہوتا تھا؛ اس اعلےٰ حاکم کا قیام انطاکیہ میں رہتا تھا۔ اور وہیں سے وہ تمام ماتحت حکّام کے نام ہدایات شائع کیا کرتا تھا۔ ملک مصر کی انتظامی حالت بھی اسی انداز پر تھی، اور وہاں کا افسر بالادست اسکندریہ میں قیام رکھتا تھا؛

ملک عراق اور ممالک فارس کے نظم و نسق کا بھی یہی ڈھنگ تھا اور اکثر حالتوں میں ان ملکوں کے حکّام بہ نسبت حکّام مصر و شام کے زیادہ تر پابند قیود و ضوابط ہوتے تھے؛ کیونکہ پایۂ تخت ان کی ولایت سے قریب تھا، اور انھیں براہ راست دربار شاہنشاہی سے حکم احکام ملتے رہتے تھے؛

اسلامی دور میں والیوں کے تقرر کی صورت

اسلام کے ظہور اور مسلمانوں کی فتوحات کی طرف متوجہ ہونے کے زمانہ میں ان کا قاعدہ یہ تھا کہ جو سردارِ فوج کسی مقام کے فتح کرنے کے لئے بھیجا جاتا، روانگی سے پہلے ہی اُس کو اس مقام کا والی مقرر کردیا جاتا تھا؛ یا مشروط کردیا جاتا تاکہ اس مقام کو فتح کرلے گا، تو وہاں کا حاکم بنا دیا جائے گا؛ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے عہد میں بھی اسی طرز پر عمل درآمد ہو چکا تھا؛ چنانچہ رسولِ کریم نے ۸ھ میں ابا یزید انصاری رض اور عمرو بن العاص رض کو ایک تحریر دعوت اسلام سے متعلق حوالے فرماکر سفر پر چلتے وقت اُنھیں حسبِ ذیل ہدایت فرمائی تھی:۔

اگر لوگ حق کی شہادت دیں، اور خدا اور رسول کی اطاعت منظور کرلیں تو عمرو بن العاص رض امیر رہیں؛ اور ابو زید رض ان کو نماز پڑھانے اور سنن و قرآن کی تعلیم دینے کی خدمت انجام دیں۔

حضرت ابوبکر کا طرزِ عمل

حضرت ابوبکر رض کے عہدِ حکومت میں جب ممالک شام کو فتح کرنے کے لئے اسلامی فوجیں روانہ ہونے لگیں تو صدیق اکبر رض کا بھی یہی دستور تھا کہ کسی شہر یا ملک کے فتح کرنے کے لئے جس شخص کے ہاتھ میں فوجی افسری کا نشان عطا فرماتے تھے؛ اسے پہلے ہی سے وہاں کا حاکم بھی مقرر فرما دیا کرتے تھے، چنانچہ آپ نے سب سے پہلی فوج جو ملک شام کو روانہ کی، اس کی روانگی کے وقت اسی طریق پر عمل کیا تھا؛ اس لشکر کے تین حصے تھے؛ اور ہر ایک حصہ پر ایک جداگانہ شخص کو افسر بنایا تھا؛ جن کو ایک ایک ملک فتح کرنے کی ہدایت کی گئی تھی؛ ایک نشان عمرو بن العاص رض کو دے کر انھیں حکم دیا تھا؛ کہ "ایلہ" کے راستے سے فلسطین پر حملہ آور ہوں؛ دوسرا نشان یزید بن ابی سفیان کو سپرد فرماکر ہدایت کی تھی؛ کہ تبوک کی راہ سے دمشق پر چڑھائی کریں؛ اور تیسرا نشان شرجیل بن حسنہ رض کے حوالے کرکے ان کو اس بات کا ایما فرمایا تھا؛ کہ وہ بھی "تبوک" ہی کی راہ سے اُردن پر دھاوا کریں؛ ان تینوں صاحبوں میں سے ہر ایک کو اسی ملک کا والی وحاکم بنا دیا گیا تھا، جس کے فتح کرنے پر وہ مامور ہوئے تھے؛ اور یہ حکم ملا تھا، کہ اگر ایک دوسرے سے جدا ہونے کے قبل کوئی جنگ کرنی پڑے تو اس وقت وہ شخص سب کا امیر ہوگا جس کے ملک میں تم موجود ہوگے۔

حضرت عمرؓ کا طریقہ عمر بن الخطاب نے مسند آرائے خلافت ہو کر ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو ملک شام کا حاکم مطلق اور بالادست مقرر کر دیا؛ اور حالت جنگ و امن دونوں میں اور امیروں کی نسبت ان کے احکام کی پابندی کرنے کا فرمان صادر کیا عمرؓ کا یہ کام اس حالت سے بالکل مشابہ تھا، جو اسلامی فتوحات سے قبل ملک شام میں پائی جاتی تھی؛ یعنے یہ کہ ہر اقلیم پر ایک جداگانہ عامل ہونے کے علاوہ تمام اقلیموں کے حکام پر ایک اور بالادست حاکم ہوتا تھا؛ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے؛ فرق صرف اس قدر رکھا گیا کہ رومی حاکم بالادست انطاکیہ میں مقیم رہتا تھا، اور مسلمانوں نے دمشق کو ملک شام کا دارالسلطنت قرار دیا اس لئے کہ یہ شہر ساحلِ بحر سے دور اور ممالک عرب سے نزدیک ہونے کے علاوہ حضرت عمرؓ کی اس خواہش کے بھی مطابق تھا؛ کہ مسلمان ایسے مقام پر قیام نہ کریں جس کی وجہ سے ان کے اور دیگر مسلمانوں کے مابین دریا حائل ہو؛ اس بات کا ذکر اوپر آچکا ہے؛

فوجی حکومت اسلامی حکومت کے پہلے دور میں ولایت اعمال (گورنری) بہ نسبت ملک پر قابض و متصرف بنانے کے محض فوجی مداخلت سے زیادہ ملتی تھی، عاملوں یا والیوں سے وہ فوجی افسر مراد ہوا کرتے تھے جو مفتوحہ ملکوں کے قرب وجوار میں قیام رکھتے تھے؛ اور جن کو رابطہ یا حامیہ کے لقب سے ملقب کر سکتے تھے، اسلامی فوجیں بہت جمعیتوں پر منقسم تھیں، جو ایسے مقامات پر فوجی چھاؤنیوں میں مقیم رہتی تھیں؛ کہ وہ بہ نسبت ساحلی مقامات اور دریائی راستوں کے صحرا اور لق و دق بیابانوں کے زیادہ قریب ہوں اس طرزِ عمل کے اسباب ہم نے پہلے ہی خوب مفصل بیان کر دیئے ہیں۔ لہذا ان کے اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ شامی افواج کے چار دستے تھے۔ یہ دستے دمشق، اردن، حمص اور فلسطین میں مقیم رہتے تھے؛ اسی وجہ سے ان اقلیموں کا نام اجناد رکھا گیا تھا؛ ملکِ عراق کی فوجی جمعیتوں کا قیام کوفہ اور بصرہ میں رہتا تھا؛ اور مصری سپاہ فسطاط اور اسکندریہ کے قرب و جوار میں؛ یہ فوجی جمعیتیں بستیوں اور شہروں میں نہیں رہتی تھیں؛ اور نہ اہل ملک سے ملنے جلنے پاتی تھیں؛ عمر بن الخطابؓ نے ان کو کاشت کاری میں مصروف ہونے سے بھی نہایت سختی سے روکا تھا؛ وہ محض اپنی چھاؤنیوں میں مقیم رہتے؛ اور بہار کا موسم آتے ہی

اپنے گھوڑوں کو سائیسوں اور غلاموں کے ہمراہ دیہات میں چرانے چگانے کو بھیجتے، مزید نگرانی کے لئے احتیاطاً کچھ سوار اور افسر بھی ملکوں کے ہمراہ جایا کرتے تھے، ان کو گھوڑوں کی پرداخت کا خیال تمام باتوں سے مقدم تھا، ان کی تیاری اور نگرانی کا کام بہت سرگرمی سے کیا کرتے، ایک بار امیر عمروؓ بن العاصؓ نے ملک مصر میں اپنی فوج کے افسروں سے یوں کہا۔ کہ "مجھکو اس بات کا علم نہ ہونے پائے کہ تم نے کسی شخص کے گھوڑے کو دُبلا اور اس شخص کو موٹا تازہ دیکھکر مجھ سے اطلاع نہیں کی ہے۔ میں گھوڑوں کا معائنہ بھی اسی طور پر کروں گا جس طرح فوجی جوانوں کا معائنہ کرتا رہتا ہوں۔ جس شخص کے گھوڑے کو لاغر دیکھوں گا اسکی تنخواہ گھٹا دوں گا اور اس کا انعام کم کردوں گا"

مصر کا نظام حکومت

عمرو بن العاص کا دستور تھا کہ موسم بہار شروع ہوتے ہی فوجی دستوں کے حسب دلخواہ مقاموں پر بہار کے دن بسر کرنے اور ورزشیں کرنے اور دودھ پینے کے لئے بھیجنے کا فرمان صادر کردیا کرتے تھے، اہل عرب اپنے اپنے قبیلوں اور فوجی نشانوں کے ماتحت ہو کر ملک مصر کے دیہاتوں میں پھیل جاتے اور "منوف"، "سمنود"، "رہناس"۔ اور "طحا" وغیرہ موضع ان کے رہنے کے لئے اکثر مخصوص ہوا کرتے تھے، اور ان مقامات پر بکثرت عربی قبائل بہار کا موسم گذارتے تھے چونکہ اسلامی فوج کے جوان (اہل عرب) عام ملکی رعایا سے ملنے جلنے نہیں پاتے تھے، لہٰذا ملک مصر کی بستیاں، رومیوں اور قبطیوں سے آباد تھیں، اور ان میں پہلی صدی ہجری تک اسلام کی اشاعت مطلقاً نہیں ہوئی تھی، ہجرت کی ایک صدی گذر جانے کے بعد اسلامی حکومت کا ڈھنگ بدل چلا۔ اور اسی وجہ سے ملک مصر کے دیہات میں مذہب اسلام کا پھیلنا شروع ہوگیا۔ اگرچہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں دین اسلام کی اشاعت قریباً دوگنی ہوگئی تھی، تاہم غیر مذہب ملکی رعایا کے مقابلہ میں اہل اسلام کی تعداد بہت کم تھی، تیسری صدی کے آغاز میں پانسہ پلٹا اور اہل اسلام کی تعداد غیر مذاہب رعایا سے بڑھ گئی، ہمارے کلام کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ تیسری صدی ہجری سے پہلے ملک مصر کے دیہات میں مسلمانوں نے مسجدیں نہیں بنوائی تھیں، اور نیز اُس سے قبل

جب کبھی قبطی لوگ عہد شکنی کر بیٹھتے تھے، تو مسلمانوں کو سخت وقت کا سامنا ہوتا، اور انھیں بدقت تمام زیر کر سکتے تھے، یہ حالت ایک زمانہ تک قائم رہی ۲۱۶ھ میں خلیفہ مامون الرشید عباسی نے ملک مصر پر حملہ کر کے اُس پر تسلط کر لیا۔ اُس وقت سے مصر کے دیہات میں اسلام کی اشاعت بہت تیزی کے ساتھ ہونے لگی؛ اندلس کی حالت کو بھی اس طرز پر قیاس کرنا چاہیئے مسلمانوں نے اس ملک کو ۹۲ھ میں فتح کر کے وہاں کے اصلی باشندوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا۔ ملکی انتظام حکومت، صنعت، و حرفت، مراسم مذہبی و عبادت غرضیکہ اُن تمام رسم و رواج کو قائم رکھا، اور کل کاروبار انھیں کے ہاتھوں میں تفویض کر کے خود فاتح ہونے کی حیثیت سے محض عام افسری اور فوجی طاقت پر متصرف رہنے پر ہی بس کیا؛

اوائل اسلام میں عاملوں کی جو حالت تھی وہ ہم مفصل بیان کر چکے ہیں۔ لیکن جو مقامات مرکز خلافت کے نزدیک واقع تھے اُن کی کیفیت مذکورہ حالات سے جداگانہ تھی؛ مثلاً بنوامیہ کے عہد میں شام کا ملک اور بنو عباس کے دور میں عراق کا ملک مقبوضہ ممالک کی حیثیت رکھتے تھے؛

خلافت راشدہ کے حکّام خلفائے راشدین کے مبارک زمانہ میں جو لوگ افسر فوج ہوتے وہی عامل بھی ہوا کرتے تھے۔ اور وہ ہی اس ملک کے فاتح بھی ہوتے تھے، ان کے فرائض اکثر حالتوں میں حسب ذیل ہوا کرتے تھے؛

ممالک مفتوحہ کی نگرانی، وانتظام، نماز، وصولی خراج۔

ہم نے تواریخ کے بعض اور موقعوں پر یہ بات بھی دیکھی ہے کہ مصر شام اور عراق کے ممالک مفتوحہ میں کاروبار سلطنت اسلامی فتوحات کے بعد بھی مدت تک اسی نہج پر جاری رہے، جس پر پہلے سے چلے آتے تھے، چنانچہ عہد بنو اُمیہ کے وسط تک یہی کیفیت رہتی چلی آئی۔ یوں تو خلفائے راشدین کے آخری زمانہ سے ولایت عمال نے مقامی حکومتوں کی صورت اختیار کر لی تھی، مگر عبدالملک بن مروان نے اپنے عہد میں .... ملکی دفاتر کو عربی زبان میں منتقل کرنے اور اُس کے کاروبار کو مسلمان عمال کے ہاتھ میں دیدینے سے اسلامی تسلط اور حکمرانی کو مکمل کر دیا؛ اس کے بعد ملکی عہدوں کی قسمیں مقرر ہوئیں اور وقت و موقع کے لحاظ سے رفتہ رفتہ ان کے بھی مختلف درجے قائم ہوتے گئے۔ ان سب مرتبوں اور منصبوں کی اصل

صرف دو طرح کے عہدے یا حکومتیں تھیں (۱) امارت عامہ (۲) امارت خاصہ اور امارت عامہ کی بھی دو صورتیں تھیں (۱) امارت استکفاء (۲) امارت استیلا۔

امارت استکفا

امارت استکفا یا امارت تفویض وہ عہدہ تھا جسے خلیفہ وقت کسی اپنے کنبے والے کو سپرد فرما کر اسے کسی اقلیم کے باشندوں کے جان و مال کا حاکم مطلق مقرر کر دیتا تھا، ایسے حاکم کے اختیارات اس ملک میں بطور خود سر حکمراں کے نافذ رہتے اور وہ سات ضروری امور ذیل کا عام نگراں رہا کرتا تھا۔ (۱) فوجی نظم و ترتیب، کا نواحی بلاد میں اور حدوں پر مناسب طریقہ سے رکھنا، اور اگر خلیفہ نے خود نہ کی ہوں تو ان کی تنخواہیں مقرر کرنا۔ (۲) کاروبار حکومت کی نگرانی، ماتحت حاکموں اور قاضیوں کا تقرر (۳) وصولی خراج، فراہمی صدقات (زکوٰۃ) اور ان دونوں صیغوں کے عامل مقرر کرنا۔ نیز مستحق لوگوں پر ان کا تقسیم کرانا۔ (۴) دین کی حمایت کرنا۔ اور خلافت کی عزت و عظمت قائم رکھنا۔ (۵) شرعی سزائیں جاری کرنا۔ (۶) نماز کی اقامت (۷) حاجیوں کی روانگی کا اہتمام اور ان کے سفر میں سہولت و حفاظت کا بندوبست کرنا، ان امور کے علاوہ اگر اس کا ماتحت صوبہ غیر مذہب والے غنیم کے حملوں سے پامال رہتا ہو تو اُسے ایک آٹھویں بات یعنے اس غنیم سے جہاد کرنے کا بھی پابند ہونا پڑتا تھا۔ جہاد میں جس قدر لوٹ کا مال ہاتھ لگتا اُسے اہل خمس کے لئے پانچواں حصہ نکالنے کے بعد فوجوں میں تقسیم کرنا ہوتا تھا جس کا مفصل بیان فوج اور مال کے باب میں دیکھنا چاہیئے۔ اکثر اسلامی ولایتیں پر اسی صورت سے حکمرانی ہوتی تھی اور خصوصاً جبکہ وہ مقامات اور اقلیمیں مرکز خلافت سے دور ہوتیں، جس کی مثال بنو اُمیہ کے عہد حکومت میں ملک عراق اور بنو عباس کے زمانہ میں ملک شام تھی اور ان دونوں حکومتوں کے عہد میں خراسان کا صوبہ بنو امیہ کے عہد میں ملک عراق کے زیادہ تر مشہور عمال استکفا نوبت بہ نوبت حسب ذیل ہیے۔ زیاد بن ابیہ، عبید اللہ بن زیاد، بشر بن مروان، حجاج بن یوسف، یزید بن مہلب، مسلمہ بن عبد الملک، عمرو بن ہبیرہ، خالد بن عبد اللہ قسری، یوسف بن عمر ثقفی، عبد اللہ بن عمرو بن عبد العزیز و یزید ابن عمرو بن ہبیرہ۔

اسلامی حکام کے فرائض

امارت عراق کا نام بایں وجہ کہ وہ کوفہ اور بصرہ دو

ولایتوں پر مشتمل تھی" امارت عراقین بھی" مشہور تھا۔ ان امیروں میں سے ہر ایک اپنے ملک پر خود سر اور مستقل حکمران کی طرح متصرف ہوتا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ وہ ماتحت ملکوں پر عامل مقرر کرتا، خراج وصول کر کے اپنی ماتحت فوجوں کی تنخواہیں بانٹتا، ملکی ضرورتوں میں صرف کرتا، تعمیر کے مصارف کرتا، پُل بنواتا، نہریں کھدواتا، اور ایسے ہی دیگر مفید کاموں میں خرچ کیا کرتا تھا، اور سال تمام پر بچی کھچی رقم ملک شام کے بیت المال میں ارسال کر دیتا۔ ملک مصر میں بھی یہی حالت تھی، وہاں کا عامل عمال استکفاء کے گروہ میں سے ہوتا تھا، ملک مصر کے عامل کی ایسی حالت امیر عمرو بن العاص کے عہد سے قائم ہوتی تھی۔ اور ان کے بعد بھی برقرار رہی، بسا اوقات ملک مصر کا عامل دوسرے ملکوں کے عاملوں کی نسبت مستقل حکمرانی کی حیثیت میں بڑھا ہوا ہوتا تھا۔ خصوصاً امیر عمرو بن العاص رضؓ کو بذات خاص اس قدر بہت کچھ اختیارات اور مطلق العنانی حاصل تھی، جبکہ وہ دوسری مرتبہ امیر معاویہؓ کے حکم سے وہاں کے حاکم مقرر ہوئے ہیں، کیونکہ انھوں نے امیر مذکور کو بمقابلہ امام علی بن ابی طالب سے بڑی بھاری امداد دے کر اُن کو کامیابی سے ہم آغوش کیا تھا، نیز امیر معاویہؓ نے زیاد بن ابیہ کو گورنر خراسان اور مغیرہ بن شعبہ کو گورنر کوفہ بنا۔ نے وقت ان دونوں کو بھی بہت سی مراعات دی تھیں، اس لئے کہ ملک عرب کے یہ تینوں چیدہ مدبر اور پالیٹشین ان کے زبردست حواریوں داخل تھے، اور امیر موصوف انھیں دنیاوی مال و جاہ کی طمع میں رکھکر اپنا طرفدار بنائے رکھنا ضروری خیال کرتے تھے۔

عباسی دور کے حکام

بنو عباس کا دور شروع ہوا تو انھیں نے بھی ویسا ہی برتاؤ اختیار کیا، لیکن یہ لوگ ملک عراق کی خود مختار حکومت عاملوں کو نہیں دیتے تھے، کیونکہ وہ مرکز خلافت سے قریب تھا۔ البتہ دور دراز ملکوں میں ان کو بھی خود سر حکمرانوں کے تقرر سے چارہ نہ تھا۔ مثلاً ملک شام، مصر، خراسان اور ملک عراق کا مشرقی حصہ ترکستان اور ماوراء النہر کی حدود تک ان سب صوبوں میں وہ بھی بااختیار عامل بھیجتے رہے، برامکہ کو عباسی حکومت میں بہت کچھ رسوخ و اقتدار حاصل ہو گیا تھا، خلیفہ ہارون الرشید نے ان میں سے ایک شخص جعفر بن یحییٰ کو انبار سے لے کر افریقہ تک تمام مغربی صوبوں کا

گورنر مقرر کیا تھا، اور اُس کے دوسرے بھائی فضل بن یحییٰ کو شروان سے ممالک ترکستان کی حد تک کل مشرقی صوبجات کا عامل بنا دیا تھا؛ یہ تقرر ۱۷۶ھ میں کیا گیا۔ جعفر نے مصر میں قیام کرنے کے بعد ممالک شام اور افریقیہ وغیرہ میں بطور خود عامل مقرر کئے؛ فضل نے اپنے پایہ تخت خراسان میں جا کر وہاں چند روز قیام کیا، اور وہاں کے ضروری معاملات ٹھیک کر کے انتظامات ملکی و مالی کو درست کرتا رہا، اس کے بعد اپنے قائم مقام ماتحت حاکموں کا تقرر کر کے خود عراق کو پلٹ آیا؛ اور آستانِ خلافت پر حاضر رہنے لگا؛ عباسی حکومت کے دور میں اکثر ایسی صورتیں پیش آیا کرتی تھیں کہ خلیفہ وقت اپنے کسی مقرب کو کہیں کا والی مقرر کرتا، اور وہ شخص ان ممالک میں اپنا نائب بھیج کر خود دربارِ خلافت میں حاضر باش رہتا، یہی امارت استکفا منجملہ ان اسباب کے ایک نہایت قوی سبب تھی، جنھوں نے آخر کار دولت عباسیہ کے پرخچے اُڑا دیئے۔ اور بہت سی مستقل حکومتیں قائم ہو کر طوائف الملوکی کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ والی (گورنر) اپنی ولایت میں دراصل خود مختار اور مطلق العنان حاکم کی حیثیت سے رہتا تھا، چند محض نمائشی اور خفیف باتوں کے سوا اُس پر خلیفہ کا کوئی دباؤ نہیں پڑتا تھا؛ مثلاً سال تمام پر بچے کھچے خراج کا دربار خلافت میں بھیج دینا یا خطبہ و سکہ میں خلیفہ کا نام رکھنا یا ایسے ہی چند امور جو اس کے بڑھتے ہوئے ارادوں کو کسی طرح روک نہیں سکتے تھے، اور جن کی وجہ سے وہ برائے نام خلیفہ کا ماتحت کہلا سکتا تھا؛ جب کوئی والی، مدبر اور حوصلہ مند ہوتا اور دیکھتا کہ خلیفہ وقت کی حکومت میں کچھ کمزوری پیدا ہو چلی ہے۔ تو فوراً اپنے ملک کے عمائد کو جمع کر کے اپنی دوستی و طرفداری پر مستعد بنا لیتا، اور خود سر حکمران بن بیٹھتا؛ اس کا یہ استقلال باہمہ وجوہ مکمل ہو جاتا۔ اور یا کسی قدر مال پر جسے وہ سال بہ سال نذرانہ کے طور پر خلیفہ بغداد کو دیتا رہے؛ مشروط ہو جاتا، اور کبھی بعض اور بھی مناسب موقع شرطیں طے ہو جاتی تھیں چنانچہ اسی طرح افریقیہ میں بنو غالب، خراسان میں ابن طاہر، اور مصر میں ابن طولون مستقل حکمران بن گئے، لیکن یہ تمام صوبے اور ملک حکومت عباسیہ کے ماتحت ہی شمار ہوتے تھے فرق صرف اتنا تھا کہ بجائے "امارت استکفا"، کے ان حکومتوں کو امارت استیلا کے نام سے یاد کیا جانے لگا؛

امارت استیلاء اس امارت سے وہ امارت مراد تھی جس کا والی خلیفہ کے حکم سے مقرر ہونیکے بعد خود سر حاکم بن بیٹھے یا بزور شمشیر کسی ملک پر متصرف ہو جائے اور خلیفۂ وقت اس کے استیصال سے مجبور ہو کر اس کو وہاں کا حاکم تسلیم کرلے۔ ایسے امیر کو برائے نام خلیفہ کا ماتحت رہنا پڑتا تھا، اور خلیفہ اُسے اُس کے ملک میں مطلق العنان حکمران بنا دیتا تھا؛ بجائے اس کے کہ وہ خلیفہ کے سامنے سر نیاز جھکائے؛ خود خلیفہ اس کی مرضی دیکھتے رہنے کی فکر میں پڑجاتا تھا؛ اور اگر اس ملک میں دینی احکام یا مذہبی امور کا نفاذ کرنا مدنظر ہوتا تو خلیفہ کو استیلاء سے اجازت لینی ضرور ہوتی تھی، بایں ہمہ اس امارت کی بھی چند شرطیں تھیں جو اس امر کے مقابل میں کہ خلیفۂ وقت نے اس شخص کو خود مختار حکمران تسلیم کرلیا ہے۔ اس امیر پر فرض ہوتی تھیں۔ وہ شرائط حسب ذیل ہیں:

(۱) دینی معاملات اور خلافت نبوی کے انتظامات میں منصب امامت کی حفاظت (۲) دینی اطاعت کا اظہار کرنا (۳) باہمی الفت اور ایک دوسرے کی مدد کرنے پر دل سے آمادہ رہنا۔ اور زبان سے اس کے مقرب بنے رہنا۔ تاکہ اغیار کے مقابل میں مسلمانوں کی مجموعی قوت قائم رہے۔ (۴) دینی ولایت کے احکام اور اس کے عہد و پیمان جاری رہیں۔ (۵) شرعی مال (زکوٰۃ وغیرہ) پوری طرح وصول کیا جائے۔ یعنی ادا کرنے والے سے کم و بیش نہ لیا جائے؛ شرعی سزائیں ٹھیک ٹھیک قائم رہیں۔ اور جو ان کے مستوجب ہوں ان پر قائم رہیں۔ امیر حفاظت دین کا خیال ضرور رکھے

امیر استیلاء کو وزیروں اور دیگر عہدہ داروں کو مقرر کرنے کا حق حاصل ہوتا تھا، انہی حکومتوں نے دولت عباسیہ کے "ٹکڑے اڑا دیئے۔ اور عظیم الشان اسلامی خلافت کا خاتمہ کر کے طوائف الملوکی قائم کردی۔ مثلاً طاہریہ، حمدانیہ، بنی بویہ۔ غزنویہ اور اخشیدیہ وغیرہ گورنمنٹیں ایک ہی وقت میں مستقل حکمرانوں کی حیثیت رکھتی تھیں؛ صرف خلیفہ کا خطبہ اور سکہ ان کے ملک میں رائج تھا؛ اور وہ ایک مقررہ رقم سالانہ بطور پیش کش کے خلیفہ کو نذر کردیتی تھیں۔ خلیفہ کو ان پر صرف اتنا اختیار تھا؛ کہ وہ ان حکومتوں کے والیوں کو ان کے ممالک میں قائم رکھے، اور ان کی حکومت کو تسلیم کرتا رہے؛ ایسی حکومتیں موروثی طور پر ان والیوں کے خاندان میں نسلاً بعد نسل چلی جاتی تھیں۔ جس کی زندہ مثال ان دنوں ملک مصر کی خدیوی حکومت تھی علیہ

عثمانیہ کے مقابل میں پیش کی جاسکتی ہے۔

امارت خاصہ اس قسم کی امارت تھی، کہ اس کا حکمران اپنی حدود واقتدار کے اندر فوجی نظم و ترتیب ملکی کاروبار، خلافت کی حمایت اور اس کی عظمت و اقتدار کی حفاظت کرتا رہتا معاملات اور مقدمات فیصل کرنے اور خراج وصول کرنے اور تحصیل زکوٰۃ کا اختیار اُسے نہیں ملتا تھا، اور لبا اوقات نماز کی امامت بھی اُس کے ذمہ نہیں ہوتی تھی، بلکہ یہ منصب قاضی کو حاصل ہوتا تھا ایسی امارت میں قاضیوں اور خراج وزکواۃ وصول کرنے والوں کا عملہ خود خلیفہ وقت مقرر کیا کرتا، جو کہ بعد از وصولیابی تمام آمدنی کو مع حساب سینٹرل بیت المال (صدر خزانہ) میں بھیجتے رہتے اور انھیں محاصلات میں سے اس ملک کی فوجوں کی اور عہدہ داروں کی تنخواہوں اور دیگر ضروری مصارف پر خرچ کرتے تھے، ایسی خاص امارتیں بنو عباس کے عہد خلافت میں بہت کم تھیں؛

عاملوں کی تنخواہیں خلیفہ عمرؓ بن الخطاب نے دفتروں کی درستی اور فوج والوں کی تنخواہیں مقرر کرنے سے فراغت پائی؛ تو آپ کو عاملوں کے وظائف متعین کرنے کی جانب توجہ ہوئی، سب سے پہلے عامل کا تقرر جو خلیفہ ممدوح کے زمانہ میں ہوا۔ عمار بن یاسرؓ کا: "کوفہ" کی طرف وہاں کا افسر فوج اور امام نماز بنا کر بھیجا جاتا تھا، عمارؓ کا وظیفہ دونوں خدمتوں کی انجام دہی کے لحاظ سے (۶۰۰) درم ماہوار مقرر ہوا؛ علاوہ اس کے ان کے ماتحت محرروں اور موذنوں وغیرہ کی جداجدا تنخواہیں مقرر ہوئیں؛ عثمان بن حنیفؓ زمین کی پیمائش کے افسر بنائے گئے۔ عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ کے قاضی اور شریحؓ بصرہ کی قضاء پر متعین ہوئے؛ عثمان بن حنیف کا وظیفہ پانچ درہم نقد یومیہ اور پانچہزار درہم سالانہ قرار پایا۔ عبداللہ بن مسعود کو سو درم ماہوار اور چوتھے دن ایک بکری ملتی تھی۔ اور قاضی شریحؒ کو سو درہم ماہوار نقد کے علاوہ ہر ماہ میں دس جراب پوری غلہ بھی ملتا تھا، اس بیان سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ خلیفہ عمرؓ بن الخطاب نے عمار کو اور لوگوں کے مقابل میں افضل قرار دے کر ان کی تنخواہ بھی زائد مقرر کی؛ اس لئے کہ وہ نماز پڑھانے اور فوج کی سپہ سالاری کی اہم خدمتوں کو انجام دینے پر متعین ہوئے تھے؛ اور اس زمانہ میں امارت (گورنری) سے اسی خدمت کا انجام دینا مراد ہوتا تھا؛

عمرؓ نے امیر معاویہ بن ابی سفیان کو والیٔ شام مقرر کرنے کے وقت ان کا وظیفہ ہزار درہم سالانہ مقرر کیا تھا، خلیفہ موصوف عاملوں کا محاسبہ کرتے اور ان کے حالات کی جانچ کرتے، بہت سختی اور مستعدی سے کام لیا کرتے تھے، جب آپ دیکھتے کہ ممالک اسلامیہ کے عاملوں نے کسی طرح بہت سا نفع کمایا اور دولت کا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ تو فوراً ان کے مال کا حصہ بانٹ لیتے اور آدھا مال ان سے لے کر بیت المال میں داخل کر دیتے۔

اموی حکّام کے وسیع اختیارات بنو امیہ کے عہد میں عاملوں کے حقوق اور اختیارات زیادہ وسیع ہونے لگے، معاویہؓ نے عاملوں کو اپنا طرفدار بنائے رکھنے کے خیال سے اُن کو بہت سی رعایتیں ابتداءً دی تھیں جو مابعد کے زمانہ میں بھی قائم رہتی چلی گئیں، امیر مذکور نے زیاد بن ابیہ کو بصرہ، خراسان اور سجستان کا گورنر مقرر کر کے اُسے وہاں کا حاکم مطلق بنا دیا اور سیاہ سفید کا اختیار کامل دیدیا تھا، تنخواہ کی کچھ تعیین نہ تھی، بلکہ محاصل ملکی میں سے ضروری مصارف ادا کرنے کے بعد جس قدر اُس کا دل چاہتا امیر معاویہ کو بھیجدیتا، امیر عمرو بن العاص کے والیٔ ملک بنائے جانے میں ایسی ہی رعایتیں ملحوظ رہی تھیں، بنو عباس نے بھی اپنے عہد حکومت میں اسی طرز کی پیروی کی، چنانچہ مامون الرشید عباسی نے فضل بن سہل کو مشرقی ممالک کا والی مقرر کر کے اس کا وظیفہ تیس لاکھ درہم سالانہ مقرر کیا تھا، اور اُس کے علاوہ کام کی اقسام اور منصبوں کی وسعت و اہمیت کے لحاظ سے بھی عمّال کے وظیفے بھی مختلف ہوا کرتے تھے۔

وزارت

امیر الامرا اور سلطان

یا نہ سلف کے عہدوں میں وزارت کا عہدہ سب سے بڑھا ہوا اور معزز ہے اور یہ عہدہ اسلام کی ایجاد نہیں بلکہ اس کی اصل فارس سے ہے، عباسی حکومت کے ایام میں مسلمانوں نے انھیں سے اخذ کر کے اپنے یہاں بھی اس منصب کو قائم کیا۔ لیکن اگر وزیر کے لفظ سے وہ شخص مراد لیا جائے جو خلیفہ کی

مدد کرتا ہے۔ یا حکومت میں اُس کا دست و بازو بنتا ہے تو اس حالت میں یہ عہدہ صدر اسلام تک منتوا تر پایا جائیگا۔ کیونکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم عام اور خاص معاملات میں اپنے اصحاب سے صلاح و مشورہ لینے اور ان سے ہر امر کے متعلق بحث فرمایا کرتے تھے؛ اور ابو بکرؓ بھی چند اور خصوصیتوں کے ساتھ مخصوص پائے جاتے ہیں۔ عرب کے وہ باشندے جو اسلام کے قبل روم اور فارس والوں سے ملتے جلتے رہے تھے ابو بکرؓ کو نبی، (صلے اللہ علیہ وسلم) کا وزیر کہتے تھے؛ ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں عمرؓ کی اور عمرؓ کے زمانہ خلافت میں عثمانؓ اور علیؓ کی حالت بھی اسی طرز پر رہی؛ مگر اسلام کے بے تکلف اور سادگی پسند دور میں مسلمانوں کے یہاں وزیر کا لفظ مشہور نہیں ہوا تھا؛

اگرچہ جس زمانہ میں بنی امیہؔ نے خلافت کو ملکداری بنا دیا؛ اور بقائے مملکت کے لئے مدبرانہ چالیں چلنا اور لوگوں کی تالیف قلوب کرنا اُنھیں ضروری معلوم ہوا تو یہ حاجت پیش آئی کہ قبیلوں اور جتھوں کی تالیفِ قلوب کرنے اور ان کے حلقوں میں اپنا اثر پھیلا کر اُن سے اپنی طرفداری کے لئے گروہ بنانے میں چند معاملہ فہم اور مدبر لوگ ان کے مشیر ہوں، لہٰذا انھوں نے کئی شخصوں کو اسی غرض سے اپنی خدمت میں لیا جن کا تقرر وزارت کے معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر یہ امر ظاہر ہے کہ وہ لوگ (بنو امیہؔ) اس عہدہ کو وزارت کے نام سے موسوم نہیں کرتے تھے؛ خلاصہ یہ ہے کہ بنو امیہؔ کی حکومت کا خاتمہ بھی ہو گیا؛ اور وزارت صرف ایسے ہی معاملات پر غور کرنے پر مشتمل رہی جن کا بیان اوپر کیا گیا ہے۔

خلافت کا بنی عباس کے ہاتھ میں پہنچنا تھا، کہ ملک کی عظمت و شان کا ستارہ چمک اٹھا اس کے مراتب اور مناصب بھی شاندار ہوئے، وزیر کا درجہ بھی بڑھا اور ملکی انتظامات کی عنان اُس کے قابو میں دیدی گئی؛ تمام بندوبست بحیثیت نائب خلیفہ ہونے کے وزرا کے ہاتھوں انجام پانے لگے۔ پھر اس پر اتنا اور بھی اضافہ ہوا، کہ حسابات کا دفتر اور خلافت کے خطوط، رازداری کا سر رشتہ بھی وزیر ہی کے اختیارات میں شامل ہو گیا؛

عباسی وزراء

بنو عباس کا سب سے پہلا وزیر ابو سلمہ حفص بن سلیمان ہمدانی ابو العباس سفاح کا وزیر تھا، اور اسلام میں یہی پہلا شخص ہے جو وزیر کے نام سے موسوم ہوا۔ ابن خلکان کا قول ہے۔ ابو سلمہ سے پہلے اس خاص تعریف کے ساتھ

کوئی یہ شخص مشہور نہیں ہوا تھا، نہ بنو اُمیہ کی حکومت میں نہ کسی اور عہد سلطنت میں۔ وہ ابو سلمہ وزیر آل محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جس طرح کہ ابو مسلم خراسانی امیر آل محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے لقب سے موسوم تھا۔ اور یہ دونوں شخص فارسی نسل کے تھے۔ سب سے پہلے جن حکمرانوں نے سلطنت کے کاروبار کو وزیروں کے اعتبار پر چھوڑا اور ان پر پورا بھروسہ کیا ہے وہ بنو عباس ہی تھے، اور ان کے تمام وزیر فارس کے باشندے تھے، بنو عباس کے سب سے زیادہ مشہور وزیر برامکہ کے خاندان سے تھے، اور حکومت میں ان کی دست درازی اور خود سری کا معاملہ اس حد تک بڑھ گیا تھا، کہ آخر کار ہارون الرشید نے مجبور ہو کر ان کو بالکل تباہ و برباد کر ڈالا۔ جس کا قصہ مشہور ہے؛

بنو عباس کے عہد میں وزارت نے کئی قالب بدلے اور کئی مرتبہ اس کی حالت میں عظیم الشان انقلابات واقع ہوئے۔ چوتھی صدی ہجری کے اندر وزیر کے نام کے ساتھ "صاحب" کے لفظ کا اضافہ ہوا اور سب سے پہلے جس کو یہ لقب دیا گیا وہ ابو القاسم اسماعیل ابن ابی الحسن عباد بن العباس تھا جو ابتدائً موید الدولہ بن بویہ کا وزیر اور "صاحب" کے ساتھ مشہور تھا، اس کے بعد جس شخص کو وزارت کا عہدہ حاصل ہوتا وہ صاحب ہی کہلاتا تھا؛

بنی عباس کے گھرانے میں خلفاء کا دائرہ اختیارات تنگ ہونے کے ساتھ ہی وزارت کا اثر بھی کم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جس زمانہ میں عاملوں نے اپنی اپنی ولایتوں میں خود سر ہو کر خلافت عباسیہ میں بہت سی آزاد، خود مختار حکومتیں قائم کر لیں، ان دنوں وزارت بھی خلافت کی طرح نام ہی کو باقی رہ گئی تھی؛ لہذا خلفاء نے اسے توڑ کر امیر الامرائی کے لقب سے بدل دیا؛

امیر الامراء ایک لقب تھا جو خلفائے بنو عباس نے بعض ایسی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے والیوں کو عطا کیا تھا؛ جو اسی کے ٹکڑے ہو کر خود مختار بن گئی تھیں، یہ صورت چوتھی صدی ہجری میں واقع ہوئی تھی؛ اور بعد بھی قائم رہی؛ جیسے بنو حمدان اور بنو بویہ کی گورنمنٹیں؛ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ امیر الامراء مستقل بادشاہ یا اُس کے مشابہ ہوا کرتا تھا سب سے پہلے یہ لقب ابن رائق کو دیا گیا؛ جو بنی حمدان میں سے تھا اور ولایت بصرہ اور واسط کا حاکم تھا۔ ۳۲۴ھ میں خلیفہ راضی باللہ عباسی نے اُسے امیر الامراء بنا کر انتظام ملک کی باگ اس کے

ہاتھ میں دیدی، اور حکم دیدیا کہ منبروں پر اُس کے نام کا خطبہ پڑھا جائے؛ اسے خلعت اور نشان (ماہی مراتب) بھی عطا کیا گیا۔ اسی ابن رائق کو شاہ بغداد یا سلطان بغداد بھی کہتے تھے؛ ۴۴۹ھ تک یہ لقب بنی بویہ میں قائم رہا، اس کے بعد ترکی قوم کے سلجوقی بادشاہوں میں منتقل ہو گیا؛ جن کا پہلا حکمران طغرل بک تھا؛ طغرل کے بعد اُس کا بیٹا الپ ارسلان دنیا کے نامور عظیم الشان بادشاہوں میں گذرا ہے۔ یہ لقب ۵۸۲ھ تک سلجوقی گھرانے میں قائم رہ کر بغداد سے ان کی حکومت کے ناپید ہونے پر جاتا رہا۔ بنو بویہ اپنے اقتدار اور اثر کے زمانہ میں امیر الامراء بھی مقرر کرتے تھے، انھوں نے خلفاء کے ہاتھ میں سوا ایک نائب کے تقرر کے جس کو رئیس الرؤسا کہتے تھے، اور کوئی اختیار باقی نہ چھوڑا تھا؛ مگر سلجوقی خاندان کے عہد میں خلفا کو پھر دوبارہ امیر الامراء کا منصب عطا کرنے کا حق حاصل ہو گیا؛

وزارت کے اثرات

سلطنت عباسیہ کے منصب وزارت کی تاریخ کو نظر غائر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے؛ کہ یہ منصب اس حکومت کی شکست اور کمزوری کے اسباب میں ایک قوی سبب تھا، اس لئے کہ خلفا نے کاروبار حکومت کی کنجیاں وزیروں کے ہاتھوں میں دیکر اپنے تئیں بے کار بنا لیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی صدیاں اسی حالت میں بسر کرنے کے بعد حکمرانی کا ملکہ ان کی طبیعت سے زائل ہو گیا؛ اور وہ حکومت کرنے کے بارہ میں عاجز ہو گئے۔

فاطمی اور اندلسی وزراء

دوسری اسلامی گورنمنٹوں میں بھی وزارت کا منصب کسی نہ کسی حیثیت سے پایا ضرور جاتا تھا؛ چنانچہ ملک مصر کی فاطمی حکومت کا پہلا وزیر یعقوب بن کلس عزیز باللہ کا وزیر تھا، جس کا تقرر ۳۶۳ھ میں ہوا تھا؛ اندلس میں جو اموی حکومت تھی، اس میں وزارت کی وہی شان تھی، جو ملک شام کی اموی حکومت میں قائم رہ چکی تھی، یعنی منصب وزارت ایک ایسی جماعت میں مشترک رہتا تھا جن کو خلیفۂ وقت اپنی امداد اور مشورت کے لئے مقرر فرما کر انھیں اپنی ہمنشینی کے ساتھ مخصوص کرتا تھا، اور انھیں مشیروں میں سے کسی ایک سر برآوردہ شخص کو منصب نائب السلطنت کے لئے چن لیتے اور اسے حاجب کے نام سے موسوم کرتا اسی عہدہ دار کو عباسی حکومت نے وزیر کے نام سے موسوم کیا تھا، اور آخر میں اندلس کی حکومت

بھی حاجب کا لقب ترک کر کے وزیر کے لقب سے بدل دیا۔ خلفائے اندلس کے ہاں یہ رتبہ وراثت کے طور پر چند خاص گھرانوں کے لئے مخصوص ہو گیا تھا جیسا کہ بعد میں برامکہ کا خاندان۔

اسلامی حکومتوں میں وزارت کی دو قسمیں تھیں (۱) وزارت تفویض (۲) وزارت تنفیذ۔

وزارت تفویض مثلاً گورنری کے ایسی وزارت ہوتی تھی کہ خلیفہ کسی شخص کو وزیر مقرر کر کے تمام کاروبار کی نگرانی اور انجام دہی اس کی رائے اور سمجھ پر چھوڑ دیتا تھا۔ یہ وزیر تین باتوں کے سوا اور تمام اس قسم کے معاملات انجام دیتا تھا جنھیں خلیفہ انجام دیا کرتا، جو تین باتیں اس کے اختیار سے باہر تھیں، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) ولیعہدی، اس معاملہ میں جس شخص کو خلیفہ مناسب سمجھتا ولیعہد بنا دیتا تھا، وزیر کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہ تھا۔

(۲) جس شخص کو وزیر نے کوئی عہدہ دیا ہو۔ یا کہیں کا حاکم بنایا ہو خلیفہ اسے معزول کر سکتا تھا لیکن وزیر خلیفہ کے مقرر کردہ شخص کو برخاست کرنے کا مجاز نہ تھا۔

(۳) خلیفہ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ قوم سے امامت کی معافی طلب کرلے، مگر وزیر کو نہیں۔

عباسی حکومت کے دور میں خاندان برامکہ۔ یحیےٰ ابن اکثم اور ابن الفرات وغیرہ وزرا تفویض رہے، اور بنو فاطمہ کے یہاں سپہ سالار افواج کو یہ منصب حاصل رہا۔ بنو عباس کے ہاں وزیروں کو تمام معاملات میں مختار بنانے کی انتہا ہو گئی تھی۔ وہ بسا اوقات خاتم خلافت بھی وزیروں ہی کو دیدیا کرتے تھے، تاکہ وہ فرمانوں اور تحریروں پر مہر لگانے کے لئے بھی دست نگر نہ رہیں رشید کے اس قصہ میں جس میں اس نے ایک دن جعفر سے خلافت کی انگوٹھی لے کر فضل کو سپرد کی ہے اس امر کی پختہ دلیل موجود ہے کہ وزیروں کا اثر کس قدر بڑھا ہوا تھا۔

جعفر برمکی کا واقعہ اس کے علاوہ جعفر بن یحیےٰ برمکی کا واقعہ جو اسے عبدالملک بن صالح کے ساتھ پیش آیا، ہمارے اس دعوے کی کافی دلیل ہے اور وہ یہ ہے کہ جعفر مجلس نشاط میں بیٹھا ہوا تھا۔ عبدالملک بن صالح (رشید کا چچیرا بھائی) اس کے پاس آیا، جب دونوں نشہ میں چور ہوئے تو جعفر نے عبدالملک کی طرف متوجہ ہو کر کہا: کیا آپ کی کوئی ایسی غرض ہے جو میرے اختیار میں ہو؟ اگر ہے تو فرمایئے۔ تاکہ میں

آپ کی اس تشریف آوری کے شکریہ میں اس کی تعمیل کی کوشش کروں، عبدالملک نے کہا، ہاں ہے؛ امیرالمؤمنین مجھ سے کسی قدر رنجیدہ ہیں، لہذا میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ پر مہربان ہو جائیں؛

جعفر چلئے۔ "امیرالمؤمنین آپ سے خوش ہو گئے۔ اور کچھ؟"

عبدالملک "اور مجھ پر دس ہزار دینار قرض ہیں"

جعفر۔ "وہ میرے خاص مال میں سے آپ کے لئے حاضر ہیں، اور امیرالمؤمنین کے مال میں سے بھی آپ کو اسی قدر ملیں گے، کچھ اور؟"

عبدالملک "میں چاہتا ہوں کہ امیرالمؤمنین مجھے اپنا سمدھی بنا کر میرے فرزند ابراہیم کو اپنی دامادی میں قبول فرمائیں"

جعفر "اچھا امیرالمؤمنین نے اپنی بیٹی غالیہ کو اس کے ساتھ منسوب کر دیا، کچھ اور؟"

عبدالملک "ہاں اور میں اس کا بھی خواہش مند ہوں کہ میرے لخت جگر ابراہیم کے سر پر نشان حکومت کا سایہ ہو؛ اور اس کو ماہی مراتب کے ساتھ کسی ملک کی گورنری ملے"

جعفر "بہتر ہے، امیرالمؤمنین نے اسے ملک مصر کا والی مقرر فرما دیا"

اتنی گفتگو کے بعد عبدالملک بن صالح خوش و خرم اپنے گھر چلا گیا؛ اور جعفر نے بلا اس کے کہ خلیفہ سے اجازت لے ان تمام باتوں کی تکمیل کر دی؛ دوسرے دن صبح کو جس وقت جعفر خلیفہ ہارون الرشید کے حضور میں حاضر ہوا، خلیفہ نے اس سے پوچھا "جعفر! کل رات تم نے کیونکر بسر کی؟" جعفر نے ادب کے ساتھ پچھلی رات کا واقعہ عرض کرنا شروع کیا، چنانچہ جس وقت جعفر نے عبدالملک بن صالح کا اپنے پاس آنا بیان کیا ہے؛ خلیفہ ہارون الرشید جو تکیہ کے سہارے بیٹھا ہوا تھا، سنبھل بیٹھا اور بولا "جعفر تجھے خدا کی قسم ہے سچ کہنا اس نے تجھ سے کیا مانگا؟"

جعفر "امیرالمؤمنین انھوں نے مجھ سے آپ کی رضامندی کی خواہش کی تھی"

رشید "پھر تو نے کیا جواب دیا؟"

جعفر "میں نے عرض کی کہ امیرالمؤمنین تم سے خوش ہو گئے"؟

رشید "بیشک میں اس سے راضی ہو گیا۔ پھر کیا چاہا؟"

جعفر "انھوں نے بیان کیا کہ میں دس ہزار دینار کا مقروض ہوں"

رشید "پھر تو نے کیا کہا؟"

جعفر "میں نے عرض کی کہ امیرالمؤمنین نے آپ کی جانب سے یہ قرض بھی ادا کر دیا۔

رشید: "بہتر ہے میں نے اذن دیا۔ پھر کیا ہوا"؟

جعفر: "انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ امیر المؤمنین اُن کے بیٹے ابراہیم کو اپنی فرزندی میں قبول فرمائیں۔"

رشید: "اور تو نے کیا جواب دیا؟"

جعفر: "میں نے عرض کی کہ امیر المؤمنین نے اپنی لڑکی غالیہ آپ کے صاحبزادے سے منسوب کر دی۔"

رشید: "اچھا میں نے اسے بھی منظور کیا، پھر آگے؟"

جعفر: "اور حضور! انھوں نے آرزو کی کہ ان کے فرزند کے سر پر ماہی مراتب کا سایا ہو، میں نے کہدیا کہ امیر المؤمنین نے ان کو ملک مصر کا گورنر مقرر کر دیا۔"

رشید: "میں نے یہ بھی بخوشی منظور کیا۔"

اس کے بعد فوراً ہی خلیفہ نے ان تمام باتوں کا سرانجام فرما دیا۔

اکثر حالتوں میں خلفاء اپنے وزیروں کو عہدۂ وزارت کے ساتھ ہی ایک اور بڑا منصب بھی حوالے فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ فضل بن سہل نے وزارت کے ساتھ تلوار کی ریاست یعنی سپہ سالاری بھی پائی تھی۔ اسی لئے اس کا نام ذوالریاستین رکھا گیا۔ (یعنی دو افسری والا)

وزارت تنفیذ اس وزارت میں محض خلیفہ کے احکام اور قوانین کا جاری کرنا مدنظر رہتا تھا گویا وزیر خلیفہ اور رعایا کے مابین ایک واسطہ ہوتا تھا، اور فوجوں کی جنگی امیروں کا تقرر، خلیفہ کے حکم سے کیا کرتا۔ ملک کی ضروری خبریں جو پیش گاہِ خلافت میں عرض کرنے کے قابل ہوتیں سمع ہمایوں تک پہنچاتا اور تازہ واقعات اور معاملات خلیفہ کے گوش گذار کر کے ان کے متعلق مناسب احکام حاصل کرتا۔ غرضکہ یہ وزیر، وزیر تفویض کے بالکل خلاف ہوتا تھا، جیسے وزیر تفویض کو عزل و نصب اور بندوبست کے اختیارات بلا کسی حد و پایاں کے حاصل ہوتے تھے، ویسے ہی وزیر تنفیذ اختیارات سے معرا ہوتا تھا۔ اور محض ایک ایلچی کی حیثیت سے خلیفہ کے احکام رعایا تک پہنچا دینے کا کام کرتا رہتا۔ خلیفہ کو اختیار ہوتا تھا کہ وہ ایک ہی زمانہ میں دو وزیر تنفیذ مقرر فرمائے۔ ایک سول انتظامات کے لئے اور دوسرا ملٹری کاروبار کے واسطے، مگر وزیر تفویض ایک سے زائد نہیں رکھ سکتا تھا۔"

وزیر کی تنخواہ

وزیر کا وظیفہ زمانہ اور شخصوں کے اختلافات کے ساتھ مختلف ہوتا تھا گر یہ ضرور ہے کہ وزیروں کا وظیفہ صرف اُن کی ذاتی تنخواہوں پر منحصر نہیں رہتا تھا، اس لئے خلفا اُن کے بھائیوں بیٹوں اور ملازموں کے وظیفے علیحدہ مقرر کرتے تھے۔ ہم اس مقام پر صرف حکومت بنو فاطمہ کے ایک وزیر کی حالت دکھاتے ہیں جس سے معلوم ہو جائیگا کہ ایک وزیر کو معہ اس کے گھرانے والوں اور ماتحت ملازموں کے کیا ملا کرتا تھا:

وزیر کا	ماہوار وظیفہ	۵۰۰۰ دینار تھا
وزیر کے ہر ایک بھائی اور بیٹے کا	" "	۲۰۰ و ۳۰۰ " تھا
ہر ایک اُس کے خاص ملازم اور متوسلین کا	" "	۳۰۰ و ۵۰۰ " تھا

یہ تمام اُن جاگیروں کے علاوہ تھا جو وزیر اور اُس کے کنبہ والوں کو ملتی تھیں۔ نیز ان تحفوں اور خلعتوں کی قیمت بھی اس کے علاوہ ہوتی جو تہواروں یا خوشی کے اور تقریبوں پر ان کو ملا کرتے تھے، چنانچہ بعض اوقات وزیر کا وظیفہ معہ اپنے ماتحتوں کے وظائف اور جاگیروں کی آمدنی کے مل ملا کر قریب ۰۰۰۰۰ا دینار سالانہ کے ہو جاتا تھا؛

سلطان

ابتداءً یہ منصب عباسی حکومت کے وزیروں کا لقب ہوا کرتا تھا جو بلحاظ تفخیم (تعظیم) ان کو خلفا کے حکم سے ملا کرتا تھا؛ جس کی صورت پہلے بیان ہو چکی ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ جعفر بن یحییٰ سلطان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مؤرخین عرب کی کتابیں پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب سلطان کا لقب خاص بغداد یا ملک شام کے والی کی شان میں استعمال کیا کرتے تھے؛ اور ممکن ہے کہ یہ والی جس کو سلطان کہا جاتا تھا پولیس کمشنر ہوتا رہا ہو۔ یا وہ عہدہ دار جوان دولتوں کے محافظ کے مشابہ ہوا کرتا ہو؛ بعض حالتوں میں سلطان کے لفظ سے خاص خلیفہ کی ذات بھی مراد لیتے ہیں، لیکن یہ سب استعمالات مجاز یا تشبیہہ و استعارہ کی قسم سے ہیں؛ غرضیکہ سلطنت کا ایک رسمی رتبہ ہونا صرف محمود غزنوی بن سبکتگین کے عہد سے شروع ہوا، اور اسلام میں وہ پہلا سلطان تھا، چوتھی صدی ہجری کے آخر میں امیر الامرا کے لقب کو بدل کر اُسے سلطان کا لقب دیا گیا؛ یوں کہیئے کہ جس طرح اس سے قبل وزیر کا لفظ کم درجے کا قرار پا گیا تھا، اسی طرح رفتہ رفتہ امیر الامرا کا لقب بھی بے حیثیت ہو گیا؛ لہذا اُسے سلطان؛ ...

لقب سے بدل دیا۔ اس کے بعد سے پھر یہی لفظ ترک کر دی، اور چرکس وغیرہ بادشاہوں اور حکمرانوں کا (جو سلجوقی۔ ایوبی۔ ممالیک اور عثمانی خاندانوں سے تھے اور ہیں) لقب قرار پا گیا۔ وزارت میں وراثت کا قاعدہ مشروط نہ تھا لیکن جب وہ عہدہ سلطنت سے بدل گیا تو میراث بھی اس کے ساتھ مشروط ہو گئی، اسی بنا پر سلطان اپنی موت سے پہلے کسی کو اپنا ولیعہد بنایا کرتا تھا

ابن خلکان نے مشہور اسلامی طبیب رازی کے حالات میں ذکر کیا ہے کہ سامانی بادشاہ اپنے حکمرانوں کو "سلطان السلاطین" کے نام سے موسوم کرتے تھے، سامانی خاندان کی حکومت غزنوی دور سے قبل تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لقب پہلے ہی سے مشہور تھا، اور اگر اس بات کو صحیح مانا جائے تو غزنویوں کا لقب سامانی گھرانے کی وراثت قرار پائے گا۔ لیکن ہم نے اس لقب کے بارہ میں بعض محققین کا ایسا قول دیکھا ہے؛ جو ہمارے پہلے قول کو ترجیح دیتا ہے ؎ اور نہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ سامانی حکمرانوں میں مذہب اسلام قبول کرنے سے پہلے؛ یہ لقب پایا جاتا ہو؛ اس لحاظ سے محمود غزنوی ہی اسلام کا پہلا سلطان قرار پائے گا۔ واللہ اعلم

خلفاء اور رسوم شاہی کی تکمیل

اگرچہ ملکی حکمرانوں کی طاقت خود سلاطین کے قبضہ قدرت میں ہوتی تھی۔ لیکن بلحاظ عقیدت مذہبی کے ان کو اپنا تقرر سلطان کے عہدہ پر خلفاء کے ہاتھوں کرانا پڑتا تھا، چنانچہ خلفاء کسی کو "سلطان" کا منصب عطا فرماتے وقت بہت شان و شوکت کا دربار مرتب کرتے، سلطان کو اپنے ہاتھوں سات پارچوں کا خلعت پہناتے طوق اور تاج اور کنگن سے آراستہ کر کے اپنے ہاتھوں سے اس کا نشان افسری درست کرتے اور اس کے گلے میں تلوار حمائل کرتے، پھر اس کے نام کا خطبہ پڑھواتے اس کی مثالوں میں سے ایک مثال دربار ہے جو خلیفہ مستظہر باللہ عباسی نے محمد بن ملک شاہ کو منصب سلطنت بناتے وقت بغداد میں منعقد کیا تھا، اور اس موقع پر ملک شاہ کا بھائی "سنجر" بھی موجود تھا، خلیفہ نے "قبہ تاج" کے اندر ان دونوں بھائیوں کو اپنے تخت کے پایہ پر بٹھایا، اس وقت خلیفہ کے بازوؤں پر چادر نبوی تھی، سر پر عمامہ اور عصائے خلافت سامنے رکھا تھا، خلیفہ نے محمد کو خلعت عطا فرمایا، اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے میں طوق، سر پر تاج اور ہاتھوں میں کنگن پہنائے؛ اس کے واسطے نشان اپنے دست خاص سے مرتب کیا۔

تلوار اور اس کے گلے میں حمائل کی اور اُسے پانچ گھوڑے بھی ساز و سامان سے آراستہ عطا فرمائے۔ اس کے بعد جامع بغداد میں محمد بن ملک شاہ کی سلطنت کا خطبہ پڑھا گیا۔ سلطان کو اسی دربار میں جس میں اُسے منصب عطا ہوتا تھا، اس قسم کے لقب بھی دیئے جاتے تھے۔ جن کی عبارتوں سے ان کی وجہ سے خلافت کی تائید ظاہر ہوا کرتی تھی، مثلاً ناصر الدولہ، سیف الدولہ اور عضد الدولہ وغیرہ وغیرہ۔

فوج اور اس کے متعلقات

فوج کی تاریخ

فوج کی اصل و بنیاد دورِ تمدن کی ابتدا میں انسانوں کی جرگہ بندیاں ہوا کرتی تھیں اور ان کی فوجیں وہی خاندان کے لوگ تھے جس وقت لڑائی کی ضرورت پیش آتی، ہر ایک قبیلہ کے لوگ بلا کسی نظام و ترتیب کے جمع ہو جاتے تھے، اور جنگ کے بعد ہر شخص کو مالِ غنیمت میں سے نسبتاً اُسی قدر حصہ حاصل ہوتا تھا جس کو وہ اپنی جوانمردی اور رفتار سے حاصل کر سکتا، مگر جس زمانہ میں لوگوں نے حضریت (شہری زندگی) اختیار کی اور کاروبار کو باہم تقسیم کر لیا۔ اور حکومتیں قائم ہوئیں۔ تو سب سے پہلے جو پیشے اختیار کئے وہ کہانت اور فوجی ملازمت تھی سب سے پہلے جس حکومت نے فوج کو بھرتی کیا وہ مصر کی فرعونی حکومت تھی، اس نے بیسویں صدی قبل میلاد کے قریب زنگیوں اور حبشیوں سے ایک فوج بھرتی کی اور ان کی مدد سے بحر احمر کے ساحل پر بسنے والی قوموں کو زیر کیا، اس کے بعد اشور۔ بابل، اور فینیقیہ اور یونان کی قدیم حکومتوں نے اسی کا تتبع لیا، اُن سے رومانیوں نے اور ان سے مسلمانوں نے اخذ کیا۔

مصر و یونان کا فوجی نظام فراعنہ مصر کے یہاں فوجی نظام اس شکل سے قائم ہوا تھا کہ میدان جنگ میں پے در پے گنجان اور سیدھی صفیں استادہ ہوتی تھیں چنانچہ اُن کے وقتوں کی شکستہ عمارتوں کے کھنڈروں پر ان صفوف کی بہت سی تصویریں پائی جاتی ہیں، فراعنہ مصر سے اہل یونان نے اس نظام کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ

انھوں نے پلٹنیں تیار کیں جنھیں وہ اپنی زبان میں لفظ (PHALANS) سے تعبیر کرتے تھے اور ان کے نظم و ترتیب کی صورت یہ تھی کہ فوجی سپاہی پے در پے صفوں میں سیدھا باندھکر کھڑے ہو جاتے، ایک پلٹن ...۴ آدمیوں سے مرتب ہوتی تھی جس کے سپاہی ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چند قدموں کے فاصلے استادہ رہتے اور صفیں ایک دوسرے کے پیچھے برابر چلی جاتی تھیں "فیلپس" والیٔ مقدونیہ نے پلٹن کے جوانوں کی تعداد مذکورہ بالا شمار سے دگنی کر دی، اور "فیلپس" کے بعد اس کے بیٹے اسکندر نے چوگنی۔ اسکندر نے سپاہیوں کو اس قدر پاس پاس کھڑا کرنا شروع کیا کہ اُن کے کندھے باہم قریباً ملے رہتے تھے اور ان کی ڈھالیں ایک دوسرے سے لڑجاتی تھیں، نیز اسی اسکندر نے اپنے سپاہیوں کے لئے نیزے بنوائے تھے، جن میں سے بعض نیزے ۲۴ فٹ لمبے ہوتے تھے، اگلی صف کے نیزے چھوٹے اور اس کی مابعد کی صفوں میں درجہ بدرجہ بڑے ہوتے چلے جاتے۔ یہاں تک کہ پانچویں صف کے نیزے تقریباً تین قدم آگے کو نکلے رہتے۔ "فلپس" نے سواروں کی بھی ایک فوج مرتب کی تھی، اس کے بیٹے نے اس جماعت کے ہتھیاروں میں اضافہ کیا۔ منجملہ انھیں جدید اسلحہ کے ایک ہتھیار منجنیق بھی تھا؛ چنانچہ چوتھی صدی قبل ولادت مسیح میں اسکندر نے اسی نظام کے ذریعہ سے تمام دنیا پر غلبہ حاصل کیا تھا،

رومی فوج

رومانی حکومت قائم ہوئی تو اس نے یونانی صف بندی کے نظام کو اپنی فوج میں رواج دیا۔ رومانی لشکر آغاز حکومت میں ایک ایسے گروہ سے مرکب ہوتا تھا جس کے آدمیوں کی تعداد ...۶ ہوا کرتی تھی۔ اور اس تعداد کو تین طبقے کے آدمیوں سے ترتیب دیتے تھے، (۱) نوجوان لوگ جن کی صف لڑائی میں سب سے آگے ہوتی تھی (۲) ادھیڑ لوگ جو دوسری صف میں رہتے تھے، (۳) تجربہ کار اور جنگ آزمودہ لوگ سب سے پیچھے تیسری صف میں۔ نیز ان میں سے ہر ایک کے آگے ایک جماعت سواروں کی موجود رہتی جو تلواریں حمائل کئے جھنڈیاں وغیرہ لئے اس خدمت پر مامور رہا کرتے تھے، کہ پیادہ فوج کو بچانے کے کام آئیں۔ اور دشمنوں کو اپنی جنگ میں الجھائے رہیں۔

اس کے کچھ دنوں بعد رومانیوں نے فوج کی اس فرقہ بندی کو بلا ترتیب صف کے متعدد ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا، ہر ایک ٹکڑی کی تین قسمیں اور ہر قسم کے دو حصے اور ہر حصے میں

سو سپاہی ہوتے تھے، یہ نظام اگلے نظام مذکورہ سے سراسر خلاف تھا، کیونکہ اس میں سپاہیوں کی صرف ایک ہی صف یا پلٹن نہ ہوتی تھی، بلکہ متعدد ٹکڑیاں ہوتی تھیں، اور ہر ایک ٹکڑی بجائے خود ایک فوج ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ آگے چلکر اس کی پوری تفصیل بیان کی جائیگی، اسلامی فتوحات شروع ہونے تک رومانی فوج کا نظام اسی صورت سے قائم رہا، پھر اسمیں کوئی تغیر نہیں کیا گیا،

جس وقت اسلام کا ظہور ہوا ہے تو رومی افواج کی تعداد ۰۰۰۰۰ ۱۲ تھی جس کے ہر دس ہزار سپاہیوں کا ایک جنرل ہوکرتا تھا، جو بظن غالب بطریق ہوتا رہا ہے، اس بطریق کے ماتحت دو کپتان ہوتے تھے جن کو "طومرخان" کہتے تھے ان میں سے ہر ایک ۵۰۰۰ سپاہیوں کا افسر بنایا جاتا۔ اور ہر ایک "طومرخان" کے ماتحت پانچ "طرنجاریہ" ہوتے تھے جن میں سے ہر ایک ہزار آدمیوں کا افسر ہوتا۔ پھر ہر ایک طرنجاریہ کے ماتحت پانچ "قومس" ہوتے جنمیں سے ہر ایک قومس ۲۰۰ سپاہیوں کا افسر بنایا جاتا قومس کے نیچے "قمطرح" اور اس کے بھی ماتحت ولرخ ہوتا اس کے ماتحت



رومی سپہ سالاران کی فوجیں اور ان کے ہتھیار

دس سپاہی ہوتے، اس نظام میں ان دونوں کے فوجی نظام کے ساتھ پوری مشابہت نظر آتی ہے اہل فارس کے ہاں لشکر کے چار طبقے ہوتے تھے، پہلا طبقہ بڑے بڑے سرداروں کا جن میں سے ہر ایک کو میر میراں کہا جاتا تھا، اس کے ماتحت چار اور افسر ہوتے، جن میں سے ہر ایک کو اسپہبد کہتے تھے، اور ہر ایک اسپہبد کے نیچے چار مرزبان پھر ہر مرزبان کے نیچے چار سالار اور ہر سالار کے نیچے دس سوار یا پانچ پیدل ہوا کرتے جنھیں پیادہ کہتے تھے۔

عربی فوج

اسلام سے قبل اہل عرب بالکل بدوی (جنگلی) تھے، ان کے ہاں کوئی فوجی

نظام نہ تھا، بلکہ قبیلے قبیلے جدا تھے، ان کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی قبیلہ جنگ کے لئے تیار ہوتا تو اپنے ہاں کے مردوں کو چھانٹ کر انھیں سے فوج مرتب کرلیتا جن میں سوار اور پیدل دونوں قسم کے لوگ ہوتے تھے، اور ان کے پاس زمانہ جاہلیت کے مشہور اسلحہ مثلاً کمان، نیزہ اور تلوار موجود ہوتے، ہاں اُن عربی سلطنتوں میں جنھوں نے اسلام سے قبل تمدن کا عروج دکھایا، فوجی نظام کا وجود پایا جاتا تھا، جیسے شاہان تبع اور حکمرانان حمیر اور منذری گھرانے کے فرمانروا۔ جن کا دارالملک "حیرہ" کا مشہور شہر تھا۔ مؤرخین نے مناذرہ کے یہاں دو فوجی جماعتوں کا ہونا بیان کیا ہے، جن میں سے ایک کو "دوسر" اور دوسری کو "شہبا" کے نام سے مشہور کرتے تھے، باقی رہے حجاز کے عرب۔ وہ اسلام سے پہلے اُسی بدوی فطرت پر قائم تھے، جس کا اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

اسلام کا فوجی نظام

اسلام کا ظہور ہوا تو اہل اسلام باقی تمام اہل عرب سے علیحدہ ہو گئے اور دین کی اجتماعی قوت نے انھیں یکدست بنا کر دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے متفق اور متحد کر دیا اس وجہ سے وہ چھوٹے بڑے سب کے سب سپاہی تھے، مسلمانوں کے پہلے سپاہی مہاجرین تھے، مگر وہ مدینہ میں آئے تو انصار سے ملکر سب ایک ہی لوگ بن گئے۔ جن کے کمان افسر خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم تھے، اور ان کا باہمی رابطہ، معاہدہ دوستی اور اسلامی بھائی چارہ کی قوت تھی۔ ان دنوں مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی سی تھی۔

اس کے بعد نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) اور ابی بکر کے زمانوں میں غزوات اور فتوحات کی وجہ سے مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی، کیونکہ اب روز بروز عربی قبائل کے چھوٹے بڑے سب لوگ نجد، یمامہ، یمن اور حجاز سے اُن میں ملتے چلے جاتے تھے، اور اسلامی اجتماع ان کو ملی کرتا جاتا تھا، آخر کار وہ تھوڑے سے بہت ہو گئے، اور انھوں نے پرجوش ہو کر شام، عراق اور مصر کے ملکوں پر حملے کر کے ان سب کو فتح کر لیا، نئے نئے شہر آباد کئے، اور مختلف حصوں میں منقسم ہو کر علیحدہ علیحدہ مقامات میں رہنے لگے، چنانچہ کچھ مصر میں، کچھ شام میں، اور بعض عراق میں مقیم ہوئے، اور باقیوں نے خاص خاص چھاؤنیوں ڈیرے ڈال دئے۔ ہر ایک چھاؤنی

کی فوج قبائل اور گھرانوں کے اعتبار سے منقسم ہوا کرتی تھی۔ مثلاً (عساکر) بصرہ کے پانچ حصے تھے، جن کو اخماس کہتے تھے۔ ہر ایک حصہ (خمس) میں ایک قبیلہ حسب ذیل قبائل میں رہتا تھا۔ ازد، تمیم، بکر، عبدالقیس اور اہل عالیہ قریش۔ کنانہ، ازد، بجیلہ۔ خشعم، تمام گھرانہ قیس عیلان کا اور مزینہ۔ یہ سب مسلمان عربوں کے قبیلے تھے۔ اور اہل عالیہ اور کوفہ کے رہنے والوں کو اہل مدینہ کے نام سے موسوم کرتے تھے، ہر ایک خمس پر انہیں قبائل کے امراء میں سے ایک شخص امیر ہوا کرتا تھا۔ اسی انداز پر مسلمانوں کی تمام فوجی طاقتوں کو قیاس کرنا چاہیئے۔ خواہ وہ کوفہ میں رہتے ہوں، یا فسطاط وغیرہ شہروں میں جن کو مسلمانوں ہی نے آباد کیا تھا۔ ان کے علاوہ عراق، شام، اور مصر کے دوسرے نامی شہروں میں قیام رکھتے ہوں گویا کہ مسلمانوں کی فوجیں ہر ایک ملک میں تھیں۔ اور ان کی تقسیم اسی ڈھنگ سے ہوتی تھی۔

فوج کے لئے وظائف

باوجود اس کے کہ تمام جنگجو سپاہی تھے اُن میں سے کوئی شخص سوائے شمشیر زنی کے دوسرا کوئی پیشہ یا کام نہیں کرتا تھا، عمر بن الخطابؓ نے انھیں کھیتی باڑی کے دھندوں میں پڑنے سے بھی منع فرما دیا۔ گویا کہ خلیفہ ممدوح نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا تھا، کہ مسلمانوں نے ممالک کو فتح کرنے اور سرسبز زمینوں پر قابض ہونے کے بعد آرام طلبی اور جنگ سے دست کشی کرنی چاہی تھی۔ لہٰذا اپنے تمام ملکوں میں منادی کرادی کہ امیر افواج (جنرل) اپنی رعیت (سپاہ) سے کہدیں کہ ان کا وظیفہ کر دیا گیا ہے اور ان کے بال بچوں کے لئے بھی وظائف مقرر ہو چکے ہیں۔ اس لئے کہ وہ لوگ کھیتی کرنے کی جانب مائل نہ ہوں، شاید حضرت عمرؓ نے اس قسم کے حکم میں یہ مصلحت بھی رکھی ہو کہ جنگجو مسلمان کسی ملک میں وطن نہ بنالیں، تاکہ انھیں اپنے ان بھائیوں کی کمک کے لئے۔ جو کہیں اور مصروف جنگ ہوں یا کسی علاقہ کی حفاظت کی غرض سے جاتے وقت جس کا کہ اکثر اتفاق پڑتا رہتا تھا، نقل و حرکت شاق نہ گذرے۔

باقاعدہ فوج کا انتظام

مسلمانوں کی عام جماعتوں کے علاوہ فوج کی ایک علیحدہ جماعت کا منظم کرنا حضرت عمرؓ کے عہد میں فاتحِ کملیے کے وقت سے شروع ہو کر بنو اُمیہ کے عہد میں مکمل ہوا، جس کا بیان آگے آئے گا، تواریخ

کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگی خدمت کا لزوم اور باقاعدہ فوجی ملازمت کا دستور بنو امیہؓ کے وسط میں شروع ہوا، اس سے پہلے لوگ دینی جہاد کے طور پر لڑائیوں میں شریک ہو کر مال غنیمت اور اپنے ہاتھوں سے قتل کئے ہوئے دشمن کے سامان سے فائدہ اٹھاتے تھے حضرت عثمانؓ کی شہادت ۳۵ھ کے بعد اہل اسلام بیرونی دشمنوں کو چھوڑ کر آپس میں کٹنے مرنے اور خانہ جنگیاں کرنے لگے، ایک مدت تک ان کا یہی وطیرہ رہا اور ان کا ہر ایک گروہ اپنے خیال اور اعتقاد کو محفوظ رکھنے کے لئے اس لحاظ سے کہ وہ حق پر ہے اور حق کو باطل کے صدمہ سے بچا رہا ہے اپنے مخالف اعتقاد والے فرقے کے ساتھ مصروف جنگ رہا مگر جس وقت کاروبار حکومت بنو امیہؓ کے قابو میں آگیا؛ اور مسلمانوں کی حکومت متحد ہو گئی؛ اور اموی عنصر کے غالب آجانے سے گروہ بندیوں کا زور گھٹ چلا، اس وقت لوگوں کے خیالات کسی ایسے معاملہ کی جانب مائل ہونے سے رک گئے جو انھیں جنگ پر آمادہ کرے، اور لڑتے رہنے کا شوق دلائے، اس وجہ سے لوگوں نے خانہ نشینی اور آرام طلبی اختیار کرنی شروع کی، اس حالت کو دیکھ کر خلفا مجبور ہوئے کہ فوجی ملازمت کا سلسلہ شروع کریں؛ سب سے پہلے جس شخص نے فوجی ملازمت کی بنیاد ڈالی، وہ شاید حجاج بن یوسف ثقفی تھا اور اس نے عبدالملک بن مروان کے عہد میں یہ سلسلہ قائم کیا؛ اس زمانہ میں اموی حکومت اپنی ترقی کے بلند ترین زینہ پر پہنچ چکی تھی؛ مسلمانوں کی کثرت ہو گئی تھی؛ اور وہ لوگ دنیا میں ہر قسم کے کاروبار خصوصاً کھیتی باڑی کرنے کی طرف مائل ہو چلے تھے، نیز جنگی شغلوں کے باقی نہ رہنے سے وہ ایک طرح مطلق العنان بھی ہو چکے تھے، اگرچہ اکثر اہل اسلام نے امیر معاویہ ہی کے زمانہ میں جنگ اور فوجی خدمت سے الگ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرنے یا دیگر مشاغل کی طرف متوجہ ہونے کا قصد کیا تھا، لیکن امیر ممدوح نے ان کو اپنی حکمت عملی سے قابو کر لیا اور اس ارادہ سے باز رکھا، اور بے دریغ انعامات و عطیات سے ان کو اپنا گرویدہ بنا لیا، جس وقت معاویہ کے بعد ان کا بیٹا یزید اور اس کے بعد معاویہ دوم۔ پھر اس کے بعد مروان بن حکم ▪ حکمران ہوئے تو چونکہ ان لوگوں میں سے ایک بھی اس ڈھنگ کا آدمی نہ تھا کہ لوگوں کے دل اپنی جانب مائل رکھتا اور مسلمانوں کو اپنی اطاعت سے باہر نہ ہونے دیتا

اس لئے فوجی لوگوں کو بیٹھ رہنے اور آرام طلبی کی جرأت پیدا ہو گئی چنانچہ جب عبد الملک خلافت کا والی مقرر ہوا ہے۔ اس وقت بھی فوج کی یہی حالت تھی؛ نہ تو سپاہی اس کے ساتھ کوچ کرتے اور نہ اُس کے مقام کے ساتھ مقام کرتے تھے؛ عبد الملک نے اس حالت کی شکایت اپنے صاحب شرطہ (پولیس کمشنر) "روح بن زنباغ" سے کی، وہ خلیفہ سے کہنے لگا؛ کہ امیر المؤمنین میری ماتحتی میں ایک شخص ہے؛ اگر آپ اُسے اپنی فوج کا افسر بنا دیں تو وہ سب کو سیدھا کر دے گا! اور آپ کے ساتھ ہی ساتھ کوچ و مقام کرائے گا؛ اس شخص کا نام حجاج بن یوسف ہے۔

حجّاج بن یوسف کی خدمات

عبد الملک نے اس کی بات مان لی اور حجاج کو فوج کا افسر بنا دیا۔ حجاج نہایت تند مزاج اور ظالم شخص تھا اسلئے کسی سپاہی کو اُس کے حکم سے سرتابی کرنے کا یارا نہ تھا، اس وقت سے فوج برابر خلیفہ کے ساتھ ہی ساتھ کوچ و مقام کرتی جاتی تھی، مگر روح بن زنباغ کے ماتحت پھر بھی اس قاعدہ کی پابندی یا حجاج کے حکم کی ذرّہ بھی پروا نہ کرتے تھے؛ ایک دن حجاج نے ان لوگوں کو دیکھا کہ اور سب تو کوچ کر گئے ہیں؛ لیکن وہ ابھی کھانا کھا رہے ہیں۔ حجاج نے یہ حالت دیکھکر ان سے دریافت کیا کہ تم لوگ امیر المؤمنین کے ساتھ کوچ کرنے سے کیوں رُک گئے؟" روح بن زنباغ کے ملازموں نے بجائے اس کے کہ کوئی عذر یا اپنی خطا کا اقرار کرتے، حجاج کو مخاطب کرکے یہ بات کہی "اے بھتیجے تو بھی گھوڑے سے اُتر کر ہمارے ساتھ کھانا کھالے"؛ حجاج نے ان کی یہ گستاخی دیکھ کر کہا۔ افسوس اب تو مجھے جو کچھ ان کی پاسداری تھی وہ بھی جاتی رہی؛ یہ کہکر اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو کوڑوں سے پیٹ کر تمام فوج میں پھراؤ اور تشہیر کرو تا کہ اوروں کو عبرت حاصل ہو اور یہ بھی حکم دیا کہ روح بن زنباغ کے خیموں کو آگ لگا کر جلا دو حجاج کے ماتحتوں نے اس حکم کی فوراً تعمیل کردی۔ روح بن زنباغ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ روتا پیٹتا عبد الملک بن مروان کی خدمت میں پہنچا، عبد الملک نے دریافت کیا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے روتے کیوں آئے۔ ابن زنباغ نے عرض کی۔ امیر المؤمنین! حجاج بن یوسف جو کل میری ماتحتی میں ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت رکھتا تھا، آج اُس نے میرے غلاموں کو کوڑے لگوائے اور میرے خیمے جلواتے ہیں"، عبد الملک نے جھلا کر حکم دیا۔ اُسے ابھی میرے روبرو

حاضر کرو۔" حجاج خلیفہ کے حضور میں پیش ہوا تو خلیفہ نے بگڑ کر اس سے پوچھا، تو نے کیوں اس قسم کی نامناسب حرکت کی اس کی کیا وجہ تھی؟"

حجاج۔ "امیر المومنین! میں نے کیا کیا؟"

عبدالملک۔ "اور نہیں تو کس نے کیا؟"

حجاج۔ "واللہ اے امیر المومنین یہ کام آپ نے کیا، میرا کوڑا آپ کا کوڑا اور میرا ہاتھ آپ کا ہاتھ ہے۔ امیر المومنین کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ کہ وہ بن زنباع کو ایک غلام کے بدلے دو غلام اور ایک خیمے کے بدلے دو خیمے عطا فرمائیں۔ اور مجھے جو مرتبہ امیر المومنین نے عطا فرمایا ہے روح بن زنباع کے خیال سے اس کو بھی نہ گھٹائیں۔ خلیفہ نے یہ حاضر جوابی اور معقول گفتگو سن کر روح بن زنباع کو اس کے ضائع شدہ سامان کا معاوضہ دلوا دیا۔ اور حجاج کے منصب میں ترقی کر دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ خلیفہ کو حجاج بن یوسف کی لیاقت اور کارگذاری کا علم حاصل ہوا۔

یہ بیان پڑھنے کے بعد شبہ پیدا ہوتا ہے؛ کہ شاید اسی زمانہ سے لازمی فوجی خدمات کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد پھر تو یہ قابل عمل طریقہ بن گیا اور اسلامی فوج کے دو گروہ ہو گئے (۱) تنخواہ دار (۲) خوشی خاطر سے فوجی خدمت انجام دینے والے (والنیٹر) یہ دونوں جماعتیں اہل عرب کی ہی ہوتی تھیں جو اپنے نسب کے لحاظ سے یا تو قحطان کی جانب راجع ہوتے تھے اور وہ لوگ یمن کے باشندے تھے یا عدنان سے منسوب اور یہ لوگ "مضر" کے گھرانے سے تھے، فوج کے ان دونوں گروہوں میں آزاد شدہ غلاموں اور ایسے لوگوں کی جو غلامی کی حالت میں ہوتے۔ ایک کافی تعداد ہوا کرتی تھی؛

عہد اسلام میں اہل عجم کی فوجیں

بنو عباس کا زمانہ آیا اور ان کو اپنی حکومت کے پرزور بنانے کے لئے غیر ملکی لوگوں سے مدد لینے کی ضرورت محسوس ہوئی تو خالص عربی فوجوں میں غیر اقوام کی بھی متعدد جماعتیں داخل ہو گئیں عجمیوں میں سے اوّل اوّل جن کا قدم لشکر اسلام میں آیا وہ اہل خراسان تھے، کیونکہ اسی قسم کے لوگوں نے ابی مسلم خراسانی کی ماتحتی میں بنو عباس کی دعوت پھیلانے میں امداد دے کر

ان کو عنانِ خلافت پر قابض کر دیا تھا، چنانچہ خلیفہ منصور کے زمانہ میں فوجی سپاہی تین گروہ پر منقسم تھے (۱) یمن کے عرب (۲) مضری گھرانے کے عرب (۳) خراسانی اہلِ عجم۔ پھر ان کے علاوہ چوتھے فرقہ کا بھی اضافہ کیا گیا۔ جو محافظِ خاص کا دستہ تھا خلفا نے اس فوج کو اپنی جان کی حفاظت کے لئے مرتب کیا تھا، کیونکہ اس زمانہ میں حکمرانوں کے واسطے طرح طرح کے جال بچھائے جاتے تھے، ملک میں عام طور پر خفیہ منصوبے اور سازشیں کی جاتی تھیں اور خلفا پر حملے ہوتے رہتے تھے، لیکن یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جس طریقہ سے خلفا نے اپنی حکومت کا تحفظ کرنا چاہا تھا وہی آخر کار حکومت کو ان کے ہاتھوں سے نکال دینے کا سبب بن گیا۔

ترکی فوج ۲۱۸ھ میں جبکہ خلافت کا دور معتصم باللہ تک پہنچا ہے اس زمانہ میں غیر ملکی لوگوں کا عنصر حکومت پر غالب آچکا تھا اور خلفا اپنی جان سے بہت خائف رہا کرتے تھے، معتصم بھی اسی لئے اپنی فوج کی جانب سے ڈر کر مجبور ہو گیا کہ مصر کے (شرقیہ و قبلیہ) باشندگان اہلِ حوف سے ایک فوج اپنی حفاظت کے لئے تیار کرے۔ چنانچہ اس نے انھیں اپنے باڈی گارڈ میں رکھ کر ان کا نام مغاربہ رکھا، اور ممکن ہے کہ ان لوگوں میں کچھ ملک مغرب کے رہنے والے بھی رہے ہوں، نیز معتصم باللہ نے اشروسنہ، سمرقند اور فرغانہ کے رہنے والوں کی ایک بڑی تعداد بغداد کے بازاروں میں بھی وقتاً فوقتاً خرید کر جمع کی تھی، اور ان غلاموں کی بھی ایک خاص فوج مرتب کر کے ان کا نام پہلے "فراغنہ" رکھا تھا، پھر "ترکون" کے نام سے موسوم کیا، یہ سپاہی عباسی حکومت کے لئے اور تمام فوجی لوگوں سے بڑھ کر خطرناک نکلے، یعنی آخر کار ان کے ہاتھوں امرائے سلطنت پر بڑے بڑے ستم ٹوٹنے لگے، اور نیز یہ لوگ اصل عربی فوج کی تحقیر اور تمام اہلِ بغداد کی ایذا رسانی کے بھی مرتکب ہوئے، یہاں تک کہ اکثر بغداد کی سڑکوں پر سوار ہو کر نکلتے اور گھوڑوں کو ایڑ لگا دیتے جس کی وجہ سے مرد، عورت اور بچے ان کی چپیٹ میں آکر زخمی ہو جاتے، یا مر جاتے۔ لوگوں نے دق ہو کر معتصم باللہ سے فریاد کی۔ معتصم باللہ کو اس آفت کے انسداد کی اس کے سوا اور کوئی ترکیب نہ سوجھی کہ اپنی فوج کو بغداد سے باہر نکال دے، لہٰذا اس نے ۲۲۱ھ میں قلعہ "سامرہ" بنوایا اور معہ اپنی فوج کے اسی میں قیام کیا۔

معتصم باللہ کی خلافت اہل عرب کے لئے اپنے خلفاء سے بیزار ہونے اور ان کی شکایت کرنے کا مقدمہ تھی۔ فوج کے لحاظ سے ان دونوں ترک و غیرہ عجمی قوموں کے سپاہی مراد ہوتے اور "حربیہ"۔ (جنگی) سپاہ سے عربی النسل مردان بنرو جن کی پیادہ جمعیت تھی، ان دونوں فرقوں کے علاوہ ایک فرقہ "متطوعہ" کا اور بھی تھا، یہ لوگ اپنی مرضی سے جنگ میں شریک ہوتے اور غالباً مملکت اسلامی کی حدود سے باہر ملکوں میں جہاد کرتے رہتے تھے؛ افواج خلافت میں کچھ اور گروہ بھی ہوتے تھے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

فوج کی قسمیں

(۱) نشاب (تیر انداز) (۲) نفط (ایک مشتعل ہوجانے والا تیل جس سے دشمن کے قلعوں وغیرہ کو جلاتے تھے) پھینکنے والے (۳) منجنیق چلانیوالے جو اس زمانہ کے توپچیوں کے قائم مقام ہوتے تھے، (۴) عیار گوپھن کے ذریعہ سے پتھروں اور ڈھیلوں کی مار کرنے والے، نیز فوج کے لئے طبیبوں اور جراحوں کا بھی عملہ رہتا تھا، جو امن اور جنگ ہر حالت میں موجود رہتا، جس طرح آج کل کی متمدن اقوام میں فوجی اسپتال ضرور ہوتے ہیں۔

ترکی فوج کے مختلف گروہ

اس کے بعد ترکی فوج سے کئی ایک اور گروہ تیار ہوتے گئے۔ جنھوں نے حکومت میں اپنا اپنا اثر اور اقتدار بڑھانیکی فکریں اور کوششیں شروع کیں، ان فرقوں میں سے ایک "شاکریہ" نامی گروہ تھا جو مہدی باللہ کے عہد حکومت میں پیدا ہوا تھا اور مستعین باللہ کے دور میں پروان چڑھا، اسی اثناء میں خلفاء کے بلاط میں ایک قسم کا خاص محافظ دستہ مقرر ہوگیا؛ جن کا نام "غلمان حجریہ"، رکھا گیا۔ بنی فاطمہ کے عہد میں بھی ان لوگوں کا ایک فرقہ تھا، عرب پیدل فوج کا ایک بہت بڑا حصہ لے کر اس سے جدا ایک گروہ تیار ہوا؛ جو "مردان بنرو" کے نام سے مشہور ہوا، اس کے بعد ایک اور فرقہ پیدا ہوا، جو مقتدر باللہ عباسی کے ایک عامل ابن الساج کی نسبت سے "فرقہ ساجیہ" کہلاتا تھا؛ اس موقع پر ہم عباسی حکومت کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور بھی کئی گروہوں کے نام پاتے ہیں؛ مثلاً بلالیہ اور سعدیہ وغیرہ وغیرہ، یہ تمام گروہ اپنی اپنی جگہ اس بات کی پوری کوشش کرتے رہتے تھے، کہ سلطنت پر انھیں کا اثر

غالب ہے۔ اسی وجہ سے اکثر اوقات خود ان کے مابین یا ان کے اور خلفا کی محافظ فوج کے مابین فساد اور دنگے ہو جایا کرتے، جن کا انجام یہ ہوا کہ حکمرانی کا سلسلہ اہل عرب کے ہاتھوں سے نکل گیا؛ اور قریش اور اہل عرب کا معاملہ بالکل بھول لبسر ہو گیا۔ جس کا بیان آگے چل کر آجائے گا۔ اور حکومت کے کاروبار ترکوں وغیرہ عجمی نسل اقوام کے تابو میں چلے گئے؛ جن کی کئی مشہور حکومتیں قائم ہوئیں اور مدت تک بڑی شان و شکوہ کے ساتھ حکمراں رہیں۔

فوجی دفتر

فوجی دفتر کی بنیاد مدینہ میں اوّل اوّل عمر بن الخطابؓ کے ہاتھوں پڑی، اس دفتر میں مسلمان مردوں کے نام لکھے گئے۔ اور ان کے وظیفوں کی شرح قرار پائی۔ ابتداءً یہ دفتر فوجی دفتر نہیں کہلاتا تھا، بلکہ صرف دیوان کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا؛ اس میں تمام مہاجرینؓ انصار اور ان کے تابعین کے نام بشرح تنخواہ درج کئے گئے تھے، اور وظیفہ کی تنخواہ کا کم و بیش ہونا نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی قرابت اور اسلام قبول کرنے میں سبقت کے لحاظ سے ہوا کرتا تھا، ہر ایک مسلمان اپنی تنخواہ خود پاتا تھا، اور اس کے بیوی بچوں کا وظیفہ علیحدہ مقرر ہوتا تھا، اس بات کو ملحوظ رکھ کر کچھ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ دفتر مسلمانوں کا تھا، چونکہ ان دنوں جملہ اہل اسلام فوجی سپاہی تھے، جس زمانہ تک سابق الاسلام لوگ موجود رہے۔ وظائف کی کمی بیشی میں ان کا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں کا لحاظ کیا جاتا رہا، مگر ان کے رفتہ رفتہ نابود ہو جانے پر جبکہ اسلامی فوج مسلمانوں کی ایک علیحدہ وجود قائم رہنے والی جماعت بن گئی اس وقت اس کی ترتیب شجاعت اور جنگ میں استقلال و پامردی ظاہر کرنے پر منحصر ہو گئی اور جوہر ذاتی کی بنا پر عہدہ و مرتبے ملنے لگے

بھرتی کے شرائط عام لوگوں میں سے فوج کے لئے سپاہیوں کی بھرتی کرنے کا ایک خاص طریقہ تھا، اور جنگی خدمت کے خواہش مند کے واسطے چند شرطیں مقرر تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جو شخص فوج میں بھرتی ہونا چاہتا وہ طلب ہونے پر "افسر دیوان فوج" کے سامنے پیش ہوتا، جو یہ دیکھتا تھا کہ آیا امیدوار فوج میں رکھنے کے قابل ہے یا نہیں؛ اگر وہ آزاد، بالغ، مسلمان، تندرست، صحیح الحواس اور

دلیر نہ ہوتا تو فوجی خدمت انجام دینے کے ناقابل سمجھا جاتا، اور جو وہ تمام شرطوں میں پورا اُترتا تو اس کا نام معہ نسب و حلیہ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا۔ نام لکھتے وقت اس شخص کے تمام انتسابی وصفات و علامات کو بڑی احتیاط سے قلمبند کرتے تاکہ اگر ایک نام سے کئی آدمی ہوں تو گڑبڑ نہ پڑے؛

فوج کی ترتیب

دفتر میں سپاہیوں کی ترتیب کے وقت ہمیشہ انھیں قواعد کا لحاظ ہوتا تھا جن کو عمر رضہ بن الخطاب رضنے سابقہ اور نسب کے اعتبار سے قرار دیا تھا، اولاً فوج کی ترتیب جنسوں اور قبیلوں سے شروع ہوتی؛ جس وقت ہر ایک قبیلہ اور جنس دوسری سے متمیز ہو جاتی، تو وہ دو حال سے خالی نہ ہوتی، یعنی عربی یا عجمی پس اگر سپاہی عربی النسل ہوتے تو ان کے قبیلوں کی ترتیب باعتبار نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے قرابت مندوں کے ہوتی، ترتیب کی ابتدا خاندان نبوی کی اصل سے کیجاتی اس کے بعد اُس کی شاخوں کی نوبت آتی؛ مثلاً اہلِ عرب کی دو قسمیں ہیں عدنانی اور قحطانی۔ عدنانی عرب قحطانیوں پر مقدم کئے جاتے تھے، کیونکہ نبوت انہی کے گھرانے میں تھی، عدنان مجموعہ ہے، ربیعہ اور مضر کا ان میں سے مضر کو فوقیت ہے؛ اس لئے کہ نبوت ان میں تھی؛ مضر کی شاخیں ہیں، قریش اور قریش کے علاوہ دوسرے کنبے، ان میں قریش کو فضیلت دیجاتی تھی، کیونکہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) اُسی خاندان سے تھے، قریش کے گھرانے میں بنو ہاشم اور بنو اُمیہ وغیرہ ہیں۔ مگر تقدم بنو ہاشم کو تھا، اس وجہ سے کہ نبوت ان کے گھرانے میں تھی، گویا کہ بنو ہاشم اس ترتیب کے قطب اور مرکز تھے، اور ان کے بعد وہ لوگ تھے، جو ان کے ساتھ نسبی قرابت میں درجہ بدرجہ زیادہ نزدیک ہوتے، اور اگر فوجی سپاہی عجمی ہوتے اور کسی نسب پر مجتمع نہ ہو سکتے تھے؛ تو ان کو جنس پر مجتمع کیا جاتا۔ جیسے ترکی، ہندی، یا ملک اور سکونت پر جیسے خراسانی فراغنہ اور مغربی پھر اگر ان عجمی لوگوں کو کسی قسم کا سابقہ حاصل ہوتا تو دیوان میں اس کے مطابق ترتیب پاتے تھے، ورنہ قربِ حاکم کے اعتبار سے اور اگر اس معاملہ میں بھی برابر ہوتے تو اس بات کا خیال کیا جاتا کہ کس فرقہ نے پہلے اس حاکم کی اطاعت اختیار کی ہے؛ فوجی دفتر کی کئی شاخیں تھیں، کوئی مراسلت (پیغام رسانی) کے لئے کوئی عطا (تقسیم تنخواہ اور انعامات) کی غرض سے اور کوئی شاخ فوجی اور جنگی مصارف یا دیگر

مختلف ضروریات وقت کے لئے۔

فوج کی تنخواہیں

فوجی عطیات سے ان کے وظیفے یا تنخواہیں مراد ہیں جو سال کے اندر مقررہ اوقات میں ان کو ملتی تھیں۔ یہ عطیات نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں غیر محدود تھے، ان دنوں میں جس قدر مالِ غنیمت آتا اس کا ایک خمس لے نبی صلے اللہ علیہ سلم کے لئے علیحدہ نکالنے کے بعد باقی چار حصے تمام صحابہ میں بلا کسی امتیاز و تفریق کے بانٹ دئے جاتے، ابوبکرؓ نے بھی اسی دستور کی پابندی رکھی، حضرت عمرؓ کا دور شروع ہوا تو انھوں نے دفتر ترتیب دیا۔ اور لوگوں کے وظائف بھی باعتبار نسب اور سابقہ کی تمیز کے، اس لحاظ سے ان کی ترتیب طبقوں کے اعتبار سے رکھی۔ اور ہر ایک کا راتب بلحاظ قرابت نبوی یا سابق الاسلام ہونے کی حیثیت سے مقرر کیا، اس کے علاوہ اور حیثیتوں سے جیساکہ فہرستِ ذیل سے واضح ہوگا۔ یہاں پر یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ اس جدول میں وظائف کی جو مقدار درج کی جاتی ہے۔ یہ صدر اسلام میں سالانہ وظائف ہوتے تھے۔

ہر ایک ایسے مہاجر اور انصار کے لئے جس نے بدر کبریٰ کی جنگ میں شمولیت کا شرف حاصل کیا ہو	۵۰۰۰ درہم
ہر ایک ایسے مہاجر اور انصار کے واسطے جو اس میں شریک نہ ہو سکا	۴۰۰۰ درہم
ازواج نبی (صلے اللہ علیہ وسلم)	۱۲۰۰۰
عباس بن عبد المطلب (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا	۱۲۰۰۰
حسنؓ اور حسینؓ	۵۰۰۰
عبد اللہ بن عمر بن الخطابؓ (خلیفہ کے بیٹے)	۳۰۰۰
مہاجرین اور انصار کی ہر ایک لڑکی کو	۲۰۰۰
ہر ایک اہلِ مکہ کو	۸۰۰
ہر ایک مسلمان کو جو مختلف طبقوں میں سے ہوں	۳۰۰ - ۵۰۰
مہاجرین اور انصار کی عورتیں	۲۰۰ - ۶۰۰

تنخواہوں کا اندازہ بعض روایتوں کے خفیف اختلاف کے ساتھ عمرؓ کے زمانہ میں فوج کی تنخواہیں یا مسلمانوں کے وظیفے حسب مندرجہ بالا ہی تھے، اگر ان وظیفوں کی مقدار پر غور اور پھر ان کا آج کل کے وظائف سے مقابلہ کریں تو بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔ اگر ہم درم کو ایک فرانک کے مساوی سمجھیں جو قیمت میں قریبًا اتنا ہی ہوتا ہے تو اسلام کے بڑے سے بڑے لوگوں کا وظیفہ بھی پانچہزار فرانک سے زیادہ قرار نہیں پاتا جو قریبًا دوسو گنی سالانہ ہوتا ہے اور اگر ہم عام سپاہی مان لیں تو مہاجرین اور انصار ان کے افسر ہوئے، جن میں خود عمرؓ بھی تھے، اور جن کو ہم نے عام مسلمان لکھا ہے وہ نفر خیال کئے جا سکیں گے خواہ وہ کسی طبقہ کے ہوں۔ اور ان کے وظیفے اُن لوگوں (مہاجرین انصار) سے کمتر تھے۔ کیونکہ وہ تین سو درم سے پانچسو درم تک قبیلہ جہاد اور فضیلت اسلامی کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتے تھے، تو گویا عمر بن الخطابؓ کے عہد میں اسلامی فوج کے افسروں کی تنخواہیں چار ہزار سے پانچہزار درم سالانہ تک اور سپاہیوں کی تین سو درم سے پانچسو درم سالانہ تک ہوتی تھیں، یہ تنخواہیں اُن نقد وظائف کے جو ان کے بیوی بچوں کو ملا کرتے تھے اور اس غلہ گندم کے علاوہ تھیں جو ہر ایک شخص کو دو جریب ماہوار کے حساب سے ملا کرتا تھا۔ ایک جریب ۳۶۰ گز مربع ہوتی تھی اور اس سے یہ مراد تھی کہ اس رقبہ میں جتنا غلہ پیدا ہو وہ سب ملتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ اوائل اسلام میں چھوٹے چھوٹے فوجی سپاہیوں کی بھی اس زمانہ کی سپاہیوں کی تنخواہوں سے زیادہ ہوتی تھیں مگر ان کے افسروں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔

تنخواہوں میں اضافہ خلفائے راشدین کے عہد میں فوجی وظائف کی مقدار اسی قدر رہتی چلی گئی۔ مگر جبکہ بنو اُمیّہ نے حکومت کی طمع کی اور معاویہؓ کو اہل عرب سے کمک لینے کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے جن باتوں کی عربی قبائل سے کمک لی ان میں ایک بڑی چیز مال تھی اور اس سے انھوں نے فوج کے وظائف بڑھا دیئے ان کی فوج میں ساٹھ ہزار سپاہی تھے جن پر وہ سالانہ ساٹھ ہزار ملین درم صرف کرتے تھے، اور یہ تعداد اس خرچ کے مقابلہ میں جو عمرؓ اپنی فوج پر کیا کرتے تھے دُگنی سے بھی زیادہ تھی۔

یمنی اور قیسی قبائل جن قبائل نے معاویہ کی دستگیری کی اور ان کی طرف سے جنگ کر کے ان کی دعوت کو مدد پہنچائی۔ ان میں قبائل یمن کا قدم سب سے آگے تھا

اور انھوں نے محض لطمع مال وزر ایسا کیا کیونکہ صرف جہاد کی غرض سے لڑنے کا شوق اور ولولہ خلفائے راشدین ہی کے زمانہ تک تھا، اور نبوت کی دہشت زائل ہو جانے سے اب وہ لوگوں کے دلوں میں کچھ باقی نہ رہا تھا، معاویہؓ نے یمن کے لوگوں کا ایک مستقل دستہ اپنی فوج میں بھرتی کیا جن کی تعداد دو ہزار سوار تھی، ان کے وظیفے دو گنے مقرر کئے اور ان کو تمام فوج سے الگ اور سب سے ممتاز بنا دیا تھا ان کے امیروں سے اپنے اہم معاملات میں رائے لیتے اور اپنا مقرب بنائے رکھتے جس سے اہل یمن کا اس قدر زور ہو گیا اور اُن کے عظمت و اقتدار کو اتنی ترقی حاصل ہوئی کہ آخر کار وہ بنو اُمیہ کی حکومت کو اپنا زیر بارِ احسان سمجھنے اور جا بجا اس کے چرچے کرنے لگے کہ اگر ہم چاہیں تو بنو مضر کو جن میں بنو اُمیہ بھی داخل تھے ملک شام سے بالکل نکال باہر کریں۔ اس وجہ سے معاویہ ان لوگوں کو اپنا مقرب منظورِ نظر بنا کر نادم ہوئے اور اس قدر امتیاز دے کر بڑے پچھتائے اور ان کا غرور توڑنے کے لئے ایک اور فرقہ کو جس کا لقب "قیسیہ" تھا اپنا مقرب بنا لیا۔ اور ان کو بھی ویسے ہی عطیات دینے لگے جیسے یمنیہ کو ملتے تھے اس کے بعد سے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بحری جنگوں میں یمنیہ فرقہ کو اور خشکی میں "قیسیہ" گروہ کو مصروفِ پیکار رکھتے یمن والوں کو یہ امر شاق گزرا۔ کیونکہ "قیسیہ" فرقے کے لوگ مضر کے خاندان سے تھے اور انھوں نے معاویہ پر اپنی خفگی اس بارے میں ظاہر کی جس کے سبب سے معاویہؓ نے دونوں کو اکٹھا کر دیا اور ان کے واسطے دونوں قسموں کی لڑائیوں میں شرکت کا دروازہ کھول دیا۔

معاویہؓ صرف فوج کے رضامند رکھنے ہی میں مال خرچ نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے ساتھ مخالفت اور عداوت رکھنے والوں کی شورشیں کم کرنے اور اپنے موافق لوگوں کی جماعتیں تیار کرتے رہنے میں کھول کر روپیہ لگاتے تھے چنانچہ اکثر اوقات وہ اپنے عاملوں کو ایسے لوگوں کے عطیات میں اضافہ کی ہدایتیں کرتے رہتے جن کو سمجھتے کہ وہ علیؓ سے کوئی غرض رکھتے ہیں اور ان کے عمال ان اغراض کو سمجھ نہ سکنے کی وجہ سے نفاذ احکام نہیں کرتے تھے، اس قسم کی باتوں میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ اہل کوفہ کو علیؓ کے ساتھ بہت الفت تھی، لہٰذا معاویہؓ نے وہاں کے عامل نعمان بن بشیر کو اس بات کا حکم بھیجا کہ کوفہ کے باشندوں کے عطیات میں دس دینار کا اضافہ کر دے۔ نعمان نے گو اس حکم کے ماننے سے انکار کیا، لیکن اُسے کچھ فائدہ نہ ہوا۔

تنخواہ میں مزید اضافہ یزید، مروان اور عبدالملک کے زمانہ میں بھی عطیات کی یہی حالت برابر قائم رہی۔ عبدالملک کو چونکہ ایک اور سخت دقت یہ بھی درپیش تھی کہ اُس کے عہد میں خلافت کے بہت سے دعوے دار پیدا ہو گئے تھے، اس وجہ سے وہ اپنے دعویداروں کی دلجوئی کرتے رہنے کی غرض سے اور بھی زیادہ انعام و اکرام دیتا رہتا تھا، حجاج نے عبدالملک کے حکم سے "رتبیل" کی جانب جو فوج روانہ کی تھی، اُس کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ اس لشکر کی تنخواہ کے مصارف دو ملین درم تک پہنچ گئے تھے، یہ اخراجات اُن کے عطیات اور ان رقموں سے علاوہ تھے جو اس فوج کے افسروں کو بطورِ انعام دی گئیں تھیں۔ ولید بن یزید نے متولی خلافت ہو کر اپنے خلیفہ ہونے کے دن فوج کے عطیات میں دس درم کا اور بھی اضافہ کر دیا۔ ممکن ہے کہ اس نے اپنی کمزوری حکومت اور عیش پرستی کی خرابی کو دبا کر فوج کے رضامند کرنے کی نیت سے ایسا کیا ہو، دولت بنو اُمیہ کے آخر زمانہ میں فوج کے وظیفے گھٹ گئے۔ یہاں تک کہ آخری خلیفہ کے عہد میں صرف پانچسو درم سالانہ فی سپاہی باقی رہ گئے تھے۔

دورِ عباسی میں تنخواہوں کی کمی بنوعباس کو خلافت حاصل ہوئی تو سفاح نے سپاہی کی تنخواہ اسی درم ماہوار (۹۶۰ درم سالانہ) کر دی۔ گویا اُس نے فوج کا مشاہرہ اُلٹ کر پھر وہی مقرر کر دیا جو بنو اُمیہ کے ابتدائی دورِ خلافت میں رہ چکا تھا، سوار کو اس سے دوگنا وظیفہ ملتا تھا، تاکہ نصف تنخواہ وہ اپنے گھوڑے کے مصارف میں اُٹھائے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت عباسیہ کی ترقی کے ساتھ فوج کے .... وظائف میں کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس وہ روز بروز کم ہوتے گئے، چنانچہ عہد مامون الرشید میں پیدل کی ماہوار تنخواہ صرف بیس درم اور سوار کی چالیس درم رہ گئی سنہ ۲۱۰ھ میں عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد کا لشکر چالیس ہزار سپاہیوں کا تھا اور اُس نے سوار کی تنخواہ چالیس درم ماہوار کر رکھی تھی اور پیدل کی بیس درم۔ اس بات پر اتنا اور بھی اضافہ کر دینا چاہیئے کہ اس زمانہ میں بہ نسبت ابتدائے اسلام کے، سونے کی قیمت چڑھ گئی تھی اور جو دینار عمرؓ کے عہد میں دس درم کے مساوی ہوتا تھا، وہ مامون کے زمانہ میں ۱۵ درم کے مساوی ہو گیا تھا۔

عجمیوں کی فوج میں شرکت بیان بالا سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ فوج کی تنخواہیں

بنو اُمیہ کے عہدِ خلافت میں خلفائے راشدین کے زمانہ سے بڑھکر پھر بنو عباس کی حکومت میں کم ہوگئیں، اس کا سبب یہ تھا کہ بنو اُمیہ نے عربی قبیلوں کو اپنی خدمت کی رغبت دلانے اور اپنی حکومت کو تائید پہنچانے کی خواہش سے فوج کے عطیات بڑھا دیئے تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے لیکن بنو عباس کے دور میں اہلِ عرب اسلامی ملکوں میں ہر چہار طرف منتشر ہوگئے اور اہلِ عجم سے مل جُل گئے تھے، عباسی خلفاء نے اہلِ عجم کی تعداد اپنی فوج میں بہت بڑھادی تھی، جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہی لوگوں نے ان کی قیامِ حکومت میں پوری پوری مدد دی تھی، ان وجوہ سے عباسی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوگیا تھا کہ وہ ان دو گروہوں میں سے جس سے چاہے فوجی خدمت لے، اہلِ عجم تھوڑی تنخواہوں کو قبول کر لیتے تھے، اور باوجود اس کے پھر بھی وہ تنخواہیں اُن وظائف سے کہیں زیادہ تھیں جو روم والے اپنے سپاہیوں کو دیا کرتے تھے، ابن خردادبہ ناقل ہے کہ رومیوں کے ہاں سپاہیوں کی تنخواہ ۱۸ دینار سے ۱۲ دینار سالانہ تک ہوا کرتی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ لوگ تیسرے چوتھے برس صرف ایک بار اپنے وظیفے حاصل کر سکتے تھے بخلاف اس کے عربی فوجوں کی تنخواہیں سالانہ ماہوار یا سہ ماہی اور ششماہی جیسا دستور ہوتا ٹھیک وقت پر ملا کرتی تھیں، لیکن عباسی حکومت کے آخری دور میں یہ بات نہ رہی تھی انکی تنخواہوں کے ملنے میں دیر ہوتی اور اکھٹے کئی کئی مہینے چڑھ جاتے اور اس کی وجہ سے جو شخص فوج کو راضی کرنیکی قدرت پاتا، وہی خلافت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا تھا، جیسا کہ انحطاط اور کمزوری کے درمیان تمام حکومتوں کا بگڑا جایا کرتا ہے۔

جاگیر دینے کا دستور سلجوقی خاندان کی حکومت تک فوج کی تنخواہیں برابر نقد ملا کرتی تھیں، لیکن جس وقت اس خاندان کی حکومت کو عروج ہوا تو بجائے نقد تنخواہ کے سپاہیوں کو جاگیریں ملنے لگیں، فوج والوں کو جاگیریں دینے کا طریقہ سب سے پہلے نظام الملک طوسی نے نکالا، اس نامور شخص نے ۴۸۵ھ میں وفات پائی ہے۔ آلِ سلجوق کا وزیر اور بڑا فاضل شخص تھا اس نے سلجوقی حکومت میں بحالتِ وزارت بہت سی مفید اصلاحیں کیں یہی پہلا مسلمان تھا جس نے بغداد میں مدرسوں کی بنیاد رکھی چنانچہ شہر کا مدرسہ نظامیہ اُسی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نامی گرامی شخص الپ ارسلان کا وزیر تھا۔ اور پھر اُس کے نامور بیٹے

نماد کا بھی وزیر رہا۔ اُس کی قابلیت اور مدبرانہ پالیسی کا اس قدر گہرا اثر پڑا تھا کہ حکومت کے تمام کاروبار اُسی کے قابو میں ہو گئے تھے۔ سلطان کو صرف تخت نشینی اور سیر و شکار سے سروکار رہ گیا تھا، نظام الملک نے بیس برس تک اسی شان و شکوہ کے ساتھ وزارت کے نام سے حکمرانی کی۔ وہ ایک دانشمند اور نیک اور خیر خواہ ملک و ملت تھا اُس نے خیال کیا کہ سلجوقی حکومت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ ایسا نہ ہو اس پر زوال آکر بہت جلد یہ ملک قابو سے نکل جائے۔ لہٰذا اُس نے یہ ضروری سمجھا کہ جاگیروں کے طریق سے حفظ مملکت کا سلسلہ قائم کرے۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا کہ ملک کو مختلف چھوٹی بڑی جاگیروں میں تقسیم کر کے اہل فوج کے حوالے کر دیا۔ نظام الملک کا یہ خیال واقعی مناسب تھا کہ زمینوں کو جاگیرداروں کے سپرد کرنا ان کی سرسبزی اور زرخیزی کی ضمانت ہے۔ کیونکہ وہ جاگیردار اپنے نفع کی خاطر اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے اور ملک کو اس طرح سرسبزی و خوشحالی نصیب ہو گی۔ بخلاف اس کے اگر صرف ایک دفتر (شاہی دفتر) ملک کے تمام معاملات اور پیداوار کا نگراں رہا تو خرابیاں بڑھتی جائیں گی۔ اور سلطنت میں خلل واقع ہو گا اس خیال کی بنا پر نظام الملک نے جاگیروں کا انتظام جاری کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مملکت آباد ہو گئی۔ اور ملکی پیداوار نہایت افراط سے ہونے لگی۔ چنانچہ گزشتہ صدی کے آغاز تک جس قدر حکمران اور سلاطین نظام الملک کے بعد گزرے ہیں سبھوں نے اس بارہ میں اس کی پیروی کی اور اپنے ملکوں میں بھی جاگیروں کا انتظام رکھا۔ اس کا مفصل حال جاگیروں کے بیان میں آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

فوج کی تعداد

ہم نے یہ پہلے ہی بیان کر دیا ہے کہ صدر اسلام میں تمام مسلمان فوجی خدمت کے انجام دینے والے تھے، اس لئے اس زمانہ میں جس قدر ان کی تعداد تھی بالکل وہی تعداد اسلامی فوج کی تھی پہلے پہل ابتداء میں اسلامی فوج کی تعداد تھوڑے سے لوگ تھی، جو مدینہ منورہ میں رہتی تھی، بعد ازاں دیگر قبائل عرب کے داخل اسلام ہونے سے ان کی تعداد بڑھنے لگی۔ ایک صحیح حدیث بخاری میں ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

جن لوگوں نے کلمۂ اسلام اپنی زبان سے ادا کیا ہے ان کی تعداد لکھی جائے"، تو ہم نے ڈیڑھ ہزار نام قلمبند نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش کئے۔

غزوۂ تبوک میں جو سب سے آخری غزوہ تھا اور ہجرت سے نویں برس واقع ہوا مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ جن کے ساتھ دس ہزار گھوڑے تھے، گویا یوں کہنا چاہیئے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری وقت میں اسلامی فوج کی اتنی تعداد تھی، اس کے بعد ابی بکرؓ اور عمرؓ کے عہدوں میں ان کی تعداد زیادہ ہوتے ہوتے ڈیڑھ لاکھ سے بڑھ گئی تھی۔ اور خلفائے راشدین کے آخری عہد میں اس تعداد کو دوچند ہو جانا نصیب ہوا تھا،

بنو اُمیّہ کے ابتدائی دور میں بصرہ اور کوفہ کے رہنے والے لوگوں میں سے فقط مردوں کی تعداد ....۱۴ ہو گئی تھی، جن میں ۸۰ ہزار بصرہ میں اور ۶۰ ہزار کوفہ میں تھے، ان آدمیوں کے ساتھ جو متعلقین تھے ان کی تعداد.....۲ ہزار تھی۔ جس میں عورتیں اور بچے سب شامل تھے، ملک مصر میں اہل و عیال کے علاوہ چالیس ہزار مرد تھے، اور ملک شام کی فوج بھی اتنی ہی تھی، اس کے علاوہ فارس وغیرہ کے ملکوں میں جو سپاہ تھی اُس کا شمار علیحدہ رکھنا چاہیئے۔

مردم شماری

صدر اسلام میں خلفاء کو مسلمانوں کی مردم شماری کرنیکی جانب بہت توجہ رہتی تھی، ان کا یہ طریقہ (نبی صلے اللہ علیہ وسلم) کا اقتدا کرنے کے خیال سے تھا۔ اُنھوں نے عربی قبیلوں میں سے ہر ایک قبیلہ پر ایک شخص کو مقرر کر رکھا تھا جو ہر روز صبح کو ان تمام ایسی جگھوں میں گھومتا پھرتا جہاں لوگ جمع ہو کر باتیں چیتیں کیا کرتے، اور سبھوں سے دریافت کیا جاتا کیا تمھارے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟ اور کیا آج تمھارے ہاں کوئی مہمان آیا ہے؟ لوگ بتا دیتے کہ ہاں فلاں شخص کے لڑکی یا لڑکا پیدا ہوا ہے۔ جن کے نام وہ لکھ لیتا اور یہ بھی بتا دیتے کہ آج ہمارے قبیلے میں فلاں شخص اپنے بال بچوں سمیت آکر ٹھہرا ہے، اس نووارد اور اس کے گھر والوں کے نام بھی لکھ لئے جاتے، جس وقت وہ شخص اس پوچھ گچھ سے فراغت پاتا تو دفتر میں آکر ان سب نوزائیدہ بچوں اور آئندہ والوں کے نام درج رجسٹر کر لیتا تھا۔

اموی دور میں مردم شماری

اس کے علاوہ ہر ولایت میں کچھ عرصہ بعد علیحدہ علیحدہ بھی مردم شماری ہوا کرتی تھی، مثال کے طور پر ایک ملک مصر کو لیجئے۔ ولید

سب سے پہلے جو رجسٹر مردم شماری کے لئے تیار ہوئے وہ عمرو بن العاص نے کرائے تھے پھر عبدالعزیز بن مروان نے اسلام کی تجدید کی اور نئی مردم شماری کے بعد رجسٹر از سر نو ترتیب دلائے، عبدالعزیز بن مروان نے یہ کام اپنی امارت مصر کے زمانہ میں ۶۵ھ سے ۸۶ھ تک کے عرصہ میں انجام دیئے تھے۔ اسکے بعد ۹۰ھ سے ۹۶ھ تک قرہ بن شریک نے اور ۹۹ھ میں بشر بن صفوان نے اسے تازہ کیا سب سے آخری مردم شماری جسکے ذریعے سے تمام ملکوں اور شہروں کے عربی النسل لوگوں کی تعداد بیان کی گئی ۱۰۵ھ سے ۱۲۷ھ تک ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت میں ہوئی تھی، مگر افسوس کہ ان مردم شماریوں کی رپورٹیں دیوانوں میں ملی کیونکہ بنو امیہ کے آثار کے اندر ضائع ہو گئیں۔ بنو عباس والی خلافت ہوئے تو انھوں نے اہل عرب کی جانب توجہ لاحاصل سمجھی بلکہ ان کی بجائے اپنی تمام توجہ فارسیوں اور ترکوں وغیرہ عجمی قوموں کے گروہ ..... تیار کرنے اور ان کو اپنے کام بناتے رہنے میں صرف کی جس کی کیفیت ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

فوج سے عربوں کا اخراج

خلاصہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں ۲۱۸ھ معتصم باللہ کی بیعت ہوئی تو اس نے اپنے تمام عاملوں کے نام جو ممالک محروسہ میں مقرر تھے یہ فرمان بھیجدیا کہ جتنے عرب فوجوں کے اندر باقی رہے ہیں۔ ان کو نکالدیا جائے اور ان کے وظیفے بند ہو جائیں۔ اہل عرب کو یہ بات نہایت شاق گزری۔ انھوں نے بہت کچھ شور وغل برپا کیا۔ لڑے بغاوت کی۔ لیکن عبث۔ اسی وقت سے عربی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور حکومت اسلامی کی سپاہ عجمی قوموں اور غلاموں سے معمور ہو گئی۔ یہی باعث تھا کہ جس وقت معتصم کا انتقال ہوا اور اس کے بعد واثق باللہ کو خلافت پہنچی تو بنی خزاعہ کے مشہور شاعر دعبل نے جو اس وقت مقام صیمرہ میں تھا اور وہاں اس کو معتصم کے مرنے اور واثق کے تخت نشین ہونے کی خبر لگی تو اس نے فی البدیہہ دو بیتیں کہیں۔

الحمد لا صبر و لا جلد	(ترجمہ) خدا کا شکر ہے صبر و تسکیب کا موقع نہیں
ولا عزاء اذا اهل البلاء رقدوا	اور ماتم پرسی کی اس وقت کوئی حاجت نہیں ہے تی
خلیفة مات لم یحزن له احد	جبکہ اہل بلا سو رہیں (مرجائیں) ایک خلیفہ مرگیا تو کسی نے اس کا
واخر قام لم یفرح به احد	غم نہ کیا اور دوسرا قائم ہوا تو کسی کو اس کی خوشی نہ ہوئی

صحیح تعداد کا اندازہ

بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں میں فوج کی کیا تعداد رہی یہ ایک ایسی بات ہے جس کا پتہ نہیں چل سکتا۔ مگر ہم اس تعداد پر عنقر

کر کے جو خلفا جنگ کے وقت میدان میں لاتے تھے یہ استدلال کر سکتے ہیں۔ کہ بلاشبہ ان کے یہاں کی فوج بہت زیادہ تھی، چنانچہ یزید بن مہلب نے صرف جرجان اور طبرستان پر حملہ کرنے کے لئے .... ۱۲ ہزار ایسی سپاہ روانہ کی تھی جن کو باقاعدہ تنخواہیں ملتی تھیں۔ اور غلاموں اور (رضاکار والنیٹر) خوشی خواں لڑنے والوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ رشید نے ہرقلہ پر .. ۱۳۵ تنخواہ دار فوج کے ساتھ حملہ کیا تھا، غلام اور متطوعہ (فالودر) اس کے علاوہ تھے، محمد بن طغج اخشیدی بانی حکومت کی فوج جو ملک مصر میں تھا ۳۲۳ھ سے ۳۳۴ھ تک .... سپاہی رہے۔ اور آٹھ ہزار غلام تھے جن میں باری باری ہر رات میں دو ہزار اس کا پہرہ دینے پر مقرر رہتے۔ ابن خلدون نے روایت کی ہے کہ معتصم باللہ عموریہ پر .... ۹ سپاہ سے کر اترا تھا۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ ہم جس وقت تمام ملک کے نزدیک اور دوسری سرحدوں کی محافظ فوجوں کی تعداد کا لحاظ کریں تو یہ مقدار کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتی۔ کاروباری لوگ، غلام اور خاص سپاہ اس کے علاوہ شمار کرنی چاہیئے۔ کیونکہ خلفائے بنی عباس مامون الرشید کے ایسے صرف مخصوص لوگوں کا شمار ۳۴ ہزار تک پہنچا تھا، جو مخصوص عباسی خاندان کے لوگ تھے

فوجی رتبے اور ان کی قسمیں

چونکہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کے ہاں کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی، اس لئے ان کے ہاں فوجی رتبے اور عہدے بھی مقرر نہ تھے، لیکن وہ قبیلے کے اوپر ایک امیر مقرر کر دیا کرتے تھے، اس امیر کو کسی غزوہ وغیرہ میں کوئی فوجی جماعت بھیجنے کی ضرورت پڑتی تو وہ اس جماعت پر ایک شخص کو سردار مقرر کر کے روانہ کیا کرتا۔ اس سردار کو "منکب" کہتے تھے اور ہر ایک منکب کے ماتحت پانچ "عریف" ہوتے، ایک عریف بہت سے نفروں پر افسر ہوا کرتا تھا،

ابتدائے اسلام میں عرب کے لوگ برابر اسی اصول پر قائم رہے۔ جو ان کے ہاں عہد جاہلیت سے رائج تھا، اسی لحاظ سے انھوں نے فوجی سپاہیوں کو بہت سے حریفوں پر تقسیم کر دیا تھا، ہر عریف کے ماتحت دس سپاہی تھے، اور فوج کی کمان افسری ایسے لوگوں کو دی تھی جو سابق الاسلام تھے چنانچہ اسلامی فتوحات کے زمانے میں ان کے فوجی نظام کی یہی صورت تھی، اس کے بعد عریف لوگوں کی تعداد دس کر دی گئی۔ اور ہر عریف کے ماتحت دس سپاہی تھے اور فوج کی کمان افسری ایسے لوگوں کو دی تھی، جو سابق الاسلام تھے، چنانچہ اسلامی فتوحات کے زمانہ میں ان

فوجی نظام کی یہی صورت تھی، اس کے بعد عریف لوگوں کی تعداد سات کردی گئی۔ اور ہر عریف کے ماتحت تیس چالیس سپاہی رہنے لگے۔ کسی عریف کے ماتحت صرف بیس جوان... بھی ہوتے، اس کی وجہ سابقہ وغیرہ کے سبب سے فوجی طبقوں کا لحاظ رکھنا تھی۔ ان عریف لوگوں پر جو افسر ہوتے تھے ان کو "امراء اسباع" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، ان کے ذمے یہ خدمت بھی ہوتی تھی کہ فوج کی تنخواہیں صدر دفتر سے برآمد کرا کے عریف لوگوں کو بانٹ دیتے اور عریف لوگ اپنے ماتحت سپاہیوں میں تقسیم کرتے تھے۔

بنی امیہ کے عہد میں فوجی رتبوں کے اندر بہت کم تغیر و تبدل واقع ہوا۔ مگر عباسی حکومت کے دور میں اس کی صورت بدل کر یوں ہو گئی۔ ہر دس جوانوں پر ایک "عریف"، ہر پچاس پر ایک خلیفہ، اور ہر سو پر ایک "قائد" (جنرل) اس کے بعد ترتیب کی صورت پھر بدل گئی۔ اور یہ شکل قائم ہوئی۔ دس جوانوں پر ایک عریف۔ دس عریفوں یا (سو جوانوں) پر ایک نقیب"، اور ہر دس نقیبوں یا ایک ہزار جوانوں پر ایک قائد (جنرل) اور ہر دس قائدوں پر ایک امیر (کمانڈر انچیف)، نیز دیگر مختلف حکومتوں کے حالات پر غور کی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نظام میں تغیر و تبدل کو جگہ ملتی رہی تھی

نشانِ امتیاز

اگرچہ یہ امر ضروری ہے کہ ہر ایک عہدہ کیواسطے ایک علامت اس قسم کی مقرر ہو جس کی وجہ سے وہ عہدیدار دوسرے عہدہ والے سے متمائز ہو سکے۔ جیسا کہ آج کل فوجی افسروں میں دیکھا جاتا ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے سے متمائز اور عام فوجی سپاہیوں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس ہمیں اس امر کے متعلق کوئی صریح چیز اسلامی فوجوں میں نہیں ملی۔ البتہ جو کچھ ہم نے طراز کے بیان میں لکھدیا ہے اس سے کوئی سراغ چلجائے تو ممکن ہے گھوڑوں داغ بیل دیا جانا بھی اسی قبیل سے تھا، تاکہ حکومت کے گھوڑے اور گھوڑوں سے ممتاز رہیں۔ اس کام کے لئے ہر ایک بادشاہت کا ایک خاص نشان تھا۔ بنی امیہ کے عہد میں فوجی اور شاہی گھوڑوں کی علامت "عدہ" کا لفظ تھا جسے گرم کر کے گھوڑوں پر داغ لگاتے تھے، اہل عرب ایام جاہلیت میں اپنے اونٹوں کے ساتھ بھی یہی کرتے تھے، ان کے ہاں ہر ایک قبیلہ کا ایک جداگانہ "میسم" (ٹھپہ) تھا، جس سے اس قبیلے کے اونٹ دوسرے

گھرانے کے اونٹوں سے پہچانے جاتے تھے، یہ بات کچھ اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔ بلکہ آج کل کی مہذب حکومتیں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔

فوجی معائنہ

اسلام سے پہلے جتنی متمدن حکومتیں گزری ہیں ان میں بھی فوجی معائنہ یا ریویو کا دستور قدیم سے چلا آیا ہے۔ چنانچہ سکندر اعظم خود بذات خاص فوجوں کا معائنہ کیا کرتا اور ان کی اور ان کے ہتھیاروں کی حالت کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا اور گھوڑوں کا بھی جائزہ لیتا رہتا، جس زمانہ میں اسلام کا ظہور ہوا ہے، ان دنوں اہل فارس کا دستور تھا کہ سال کے اندر مقررہ وقتوں میں فوج کا معائنہ کیا کرتے تھے، اس معاملہ میں ان کا طریقہ یہ تھا کہ سب سے اعلیٰ طبقہ کا سوار گھوڑے پر چڑھ کر اعلیٰ حکام اور بادشاہ کے سامنے سے گذرتا تھا، اس سوار کے ہمراہ پہلو بہ پہلو ایک غلام ہوتا تھا۔ وہ زرہ۔ خود۔ دستانے۔ چار آئینہ جوشن پہنے ہوتا، گھوڑے پر آہنی یا ہر پٹری ہوتی جس کو برگستوان کہتے تھے، ڈھال، نیزہ، تلوار، گرز، خنجر، رسی، تو برہ، آہنی چھریاں، باگ ڈوریں۔ تاگوں کی تھیلی سوتالی، قینچی۔ ہتھوڑی، کانٹا، لمبا سوا، چھوٹی سویاں، تاگے۔ زناد، طرطور، باراں کوٹ۔ دو چلہ چڑھی ہوئی کمانیں مع دو زائد چلوں کے جو ٹوٹنے پھوٹنے پر بوقت ضرورت کام آ سکیں۔ دو تیروں کے ترکش ایک خود سوار کے پاس دوسرا اس کے غلام کے پاس غرض سوار ان تمام سامان سے لیس ہوتا تھا۔

عہد رسالت میں فوجی معائنہ

تمدن اہل عرب کا آغاز ہوا اور انھوں نے فوجی حالت کو درست کیا، تو اس معاملہ میں انھوں نے بھی اہل فارس کی ہی پیروی کی لیکن اس بات کا بھی سراغ ملتا ہے کہ عرب والوں نے شہروں کے بسانے اور فوجوں کے باقاعدہ مرتب کرنے سے پہلے بھی فوجی معائنہ کا دستور اختیار کر رکھا تھا، کیونکہ خود نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) بنفس نفیس اپنے اصحاب کا جنگ کے وقت معائنہ فرماتے تھے۔ چنانچہ کتب سیر میں آیا ہے کہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) بنفس نفیس اپنے اصحاب کا جنگ کے وقت معائنہ فرماتے تھے۔ چنانچہ کتب سیر میں آیا ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کبریٰ کے دن سنہ ۲ھ میں ان کا معائنہ کیا تھا اور ان کو کئی صفوں میں کھڑا کر کے صفوں کو درست

اور سیدھی بنانے کی کوشش کی تھی، جس وقت آپ صفوں کو درست فرما رہے تھے آپ کے ہاتھ میں ایک سادہ تیر تھا، آپ سواد نام ایک شخص کے پاس سے ہو کر گذرے جو صف کی سیدھ سے ہٹا ہوا کھڑا تھا، نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اس تیر کو جو آپ کے ہاتھوں میں تھا اس شخص کے پیٹ میں چبھو کر فرمایا "استو یا سوا د بن غزیۃ" (اے غزیہ کے بیٹے سواد سیدھا اور برابر ہو جا) آخر کار آپ صفوف کی ترتیب اور درستی سے فارغ ہو کر اس خیمہ میں واپس تشریف لے آئے۔ جو صحابہ نے آپ کے لئے وہیں میدان جنگ میں نصب کر رکھا تھا

خلفائے راشدین بھی اسی طرح فوج کا جائزہ لیتے رہے۔ اور ان کے بعد بنو امیہ نے بھی اس وضع کو قائم رکھا، حجاج بن یوسف فوج کا جائزہ لیتے وقت ایک ایک شخص سے دریافت کیا کرتا تھا کہ تو کون ہے اور تیرا قبیلہ کونسا ہے۔ اور ہتھیاروں کی حالت بہت غور کے ساتھ دیکھنے کے علاوہ سپاہی کی کیفیت پر بھی پوری طرح نظر کیا کرتا تھا۔

عباسی دور کا معائنہ

عباسی عہد حکومت میں فوج کا جائزہ اہل فارس کی وضع پر لیا جاتا تھا، جس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بنو عباس نے اس معاملہ میں فارسیوں کی شاگردی کی تھی۔ ان کے ہاں یہ دستور تھا کہ خلیفہ یا خلیفہ کا وزیر فوج کے معائنہ کے لئے ایک منظر عام میں جا کر بیٹھتا۔ اکثر اوقات خود خلیفہ جلوس فرما ہوتا اور اس وقت وہ خود اور زرہ پہنے ہوا کرتا، گویا کہ آمادہ پیکار ہے، خلیفہ کے جلوس فرما چکنے کے بعد "منادی" افسروں کو نام بنام پکارتا اور وہ سامنے سے ہو کر گزرتے جاتے، پھر جب خلیفہ ان کے گھوڑے اور ہتھیاروں کا جائزہ لے کر سب سامان سے لیس پاتا تو ان کے وظیفے اور انعام عطا کئے جانے کا حکم صادر کر دیتا یہ وظیفے جائزہ کے دن کے لئے مقرر تھے، کبھی کیا بلکہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اعلے افسر فوج اپنا انعام ماتحتوں میں سے کسی شخص کو بخشدیتا تھا، اس کارروائی کی مثال خلیفہ معتمد باللہ عباسی کے عہد ۲۷۱ھ میں (عمرو بن اللیث) کا طرز عمل ہے۔ عمرو بن اللیث خلیفہ کے حضور میں نہایت مقرب اور منہ چڑھا ہوا تھا۔ قوانین سلطنت میں دخیل ہو کر فوجی صیغہ کا منتظم اور افسر مقرر ہو گیا تھا اس نے یہ قاعدہ جاری کر رکھا تھا کہ ہر سہ ماہی میں ایک بار تمام فوجی افسروں اور سپاہیوں کو علے قدر مراتب انعام تقسیم کیا کرتا اور اس تقسیم انعام کے موقع پر خود بھی حاضر ہوتا اس وقت عارض یعنی فوجی افسر معائنہ روپے اشرفیوں کے توڑے سامنے ڈھیر لگا کر بیٹھ جاتا اور منادی

سب سے پیشتر عمرو بن لیث کا نام لیکر آواز دیتا۔ عمرو بن لیث اپنے گھوڑے پر سوار اور ہتھیاروں سے آراستہ اونچی بنا ہوا "عارض" کے مقابل جا کھڑا ہوتا۔ اور "عارض" اس کے ساز و سامان کا جائزہ لے کر حکم دیتا کہ عمرو کو تین سو درہم عطا کئے جائیں۔ درہموں کی تھیلی عمرو بن لیث کی طرف بڑھائی جاتی۔ اور وہ اُسے اپنے ہاتھوں میں لیکر بوسہ دیتا اور کہتا "خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے امیر المومنین کی ایسی خدمت کرنیکی توفیق عطا فرمائی جس کی وجہ سے میں انعام کا مستحق ہوا" یہ کہکر تھیلی کو اپنے موزہ میں رکھ لیتا۔ اور وہ تھیلی اس شخص کا حق ہوتی جو اُس کا موزہ اُتارتا تھا، اس کے بعد منادی ایک ایک کرکے تمام نامی لوگوں کو بہ ترتیب مدارج آواز دیتا۔ وہ عارض کے سامنے آتے اور عارض اُن کے پورے ہتھیاروں کو دیکھتا گھوڑوں کا جائزہ لیتا اور پیدل و سوار دونوں کے تمام ہتھیار ایک ایک کرکے ملاحظہ کرتا، اگر کوئی شخص کوئی چیز چھوڑ آیا ہوتا تو اُس کا انعام ضبط ہو جاتا۔ عمرو بن لیث نے ایک دن ایک سوار کا معائنہ کیا جس کا گھوڑا بہت لاغر اور کمزور تھا، "عمرو" نے اس سوار سے کہا "کیوں جی! تم ہمارا روپیہ لیجا کر اپنی جورو کو کھلاتے اور اُسے موٹی تازی بناتے ہو اور اپنی سواری کو ایسا لاغر کر دیا ہے۔ جس پر چڑھ کر لڑتے اور جس کے ذریعہ سے انعام حاصل کرتے ہو؟ جاؤ تمھارے واسطے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے" سوار نے عمرو بن لیث کو جواب دیا "قربان جاؤں، اگر میں اپنی بیوی کا ملاحظہ کراتا تو اس میں شک نہیں کہ اُسے دیکھکر آپ میرے گھوڑے کو بہت موٹا تازہ بتاتے، عمرو یہ سُنکر ہنس پڑا اور اس سپاہی کو انعام دلوا کر اُس سے کہا "اچھا اب اپنا جانور بدلوا لے"

فوجی چھاؤنیاں

صدر اسلام میں جبکہ مسلمان خود ہی فوجی سپاہی بھی ہوتے تھے ان کا دستور یہ تھا کہ کسی شہر کو فتح کرکے اُس کے آس پاس کسی مقام کو اپنا مسکن قرار دے لیتے اور ایسی جگہ قیام کرنے سے پرہیز کرتے تھے، جس کے اور "مدینہ" کے مابین راہ میں کوئی دریا یا نہر حائل ہوتی ہو، اس طرز عمل کے اختیار کرنے میں ان کو عمر بن الخطابؓ کی مذکورہ بالا وصیت پر چلنا ملحوظ تھا۔ اسی وجہ سے مصری سپاہ اسکندریہ میں نہیں رہی جو مصر کا پایہ تخت تھا، بلکہ بجائے اسکے اُس نے "حصن بابل" کے نزدیک خیموں میں سکونت اختیار کی اور پھر وہ مقام فسطاط کے نام سے مشہور ہوکر ایک آباد شہر بن گیا۔ عراق کی فوجیں کسریٰ کے دارالسلطنت مدائن میں نہیں رہیں۔ بلکہ نہر فرات کے اُن کناروں پر جو بادیہ شام سے متصل واقع تھے بصرہ اور کوفہ میں مقیم ہوئیں، ان دونوں فوجوں

کے علاوہ اور افواج نے بھی اسی طرح ان تمام دیگر ملکوں میں سکونت رکھی جو صدر اسلام سے فتح ہوتے رہے۔ یا فتح ہوئے تھے، وہ لوگ مفتوحہ شہروں کے باہر ان کے اطراف میں صرف ان مقامات کی حفاظت کرنے کے لحاظ سے قیام کرتے تھے، جن کا ہم ولایت اعمال کے بیان میں ذکر کر آئے ہیں لیکن یہ ضرور تھا کہ اس زمانہ میں اہل عرب لڑائی پر جاتے ہوئے اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ اور جب کسی شہر کو فتح کرتے تھے، تو سب کے سب وہیں مقیم ہو جاتے۔ اسی لئے رفتہ رفتہ وہ فوجی چھاؤنیاں مرور زمانہ سے خاصے آباد شہر ہو گئیں۔

چھاؤنیاں بنانے کا طریقہ

عرب والوں نے تمدن اختیار کیا تو جنگ پر جاتے وقت عورتوں کو ہمراہ لینے کا دستور ترک کر دیا۔ اس قاعدہ پر برابر عامل رہے۔ کہ فوجی چھاؤنیاں شہروں کے باہر رکھیں۔ اکثر حالتوں میں یہی چھاؤنیاں بڑے بڑے شہر بن جاتی تھیں جو صدیوں تک بہت آباد اور پر رونق رہتے جیسا کہ فسطاط، بصرہ اور کوفہ میں واقعہ ہوا۔ "فسطاط" کیا تھا؟ صرف امیر عمرو بن العاص کے خیمہ کے گرد۔ چھوٹے چھوٹے خیموں کا ایک پڑاؤ تھا، جو بعد میں بڑا بارونق شہر ہو گیا، اس کے آباد ہونے کے ایک صدی سے کچھ زیادہ بعد جس زمانہ میں عباسی خاندان والوں نے مطالبہ خلافت پر قیام کیا ہے مروان بن محمد بنو امیہ کا آخری خلیفہ وہاں آ کر پناہ گزیں ہوا۔ عباسیوں نے صالح بن علی کی ماتحتی میں اس کا تعاقب کیا اور مصر میں آ پہنچے انھوں نے فسطاط کے قرب و جوار میں اپنا کیمپ قائم کیا۔ اور اس مقام کا نام "عسکر" یعنی چھاؤنی رکھا۔ بعدہ لوگوں نے وہاں مقامات بنا لئے اور وہ جگہ جو پہلے ایک میدان تھی اب مثل فسطاط کے ایک شہر بن گئی جس کا نام "عسکر" مشہور ہوا اس کے ایک صدی کے کچھ زائد عرصہ کے بعد ۲۵۶ھ میں احمد بن طولون، مصر کا فرمانروا ہوا اس نے افواج آلات حرب اور شاہ نشین لوگوں کا اضافہ کیا تو فسطاط میں انکی سمائی نہ ہو سکی اسلئے ابن طولون نے جبل مقطم کے پاس ایک جدید کیمپ قائم کیا جس میں خود اپنے واسطے ایک قصر تعمیر کرایا نیز اس نے اپنے غلاموں اور خاص لوگوں کو حکم دیا کہ وہ لوگ بھی وہاں مکانات بنوائیں۔ ان سب عمارتوں کی تعمیر کے بعد وہ مقام بھی ایک عظیم الشان شہر ہو گیا۔ اور عمارتوں کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے فسطاط سے مل گیا۔ اس نئے شہر کا نام "قطائع" رکھا گیا۔ فاطمی خلفاء کے نامور سپہ سالار جوہر نے بھی اسی طرح ایک جدید آبادی بڑھائی جس زمانہ میں وہ ملک مصر کو فتح کرنے آیا اس نے اپنی فوجیں مقطم کے دامن میں قطائع سے باہر ٹھہرائیں۔ جب ملک کی فتح سے فارغ ہو گیا تو اسی کیمپ کے میدان میں مشہور شہر

"قاہرہ"، کی بنیاد ڈالی جو آج تک باقی ہے۔ انھیں اتفاقات سے ملتی جلتی روایتیں تمام اسلامی شہروں کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں خلیفہ منصور عباسی نے بغداد کو اپنی فوج کے واسطے ایک قلعے کی صورت پر تعمیر کرایا تھا اور اسی طرح اس کے بیٹے مہدی نے بغداد سے باہر چھاونی ڈالی تھی اسی طرز پر تمام اسلامی چھاونیوں کو قیاس کرنا چاہیے۔ کیونکہ مسلمان حکمران یا امراء ان چھاونیوں کو شہر سے باہر بہت دور عام رعایا کے مکانات سے الگ بنوایا کرتے تھے یہی باعث تھا کہ جب حجاج بن یوسف ثقفی نے واقعہ "جماجم" کے بعد اپنی سپاہ کو اہل کوفہ کے گھروں میں لا اتارا تو وہاں کے باشندے اس سے بہت ناخوش ہوئے اور اس فعل کو ظلم وستم میں شمار کرنے لگے۔ حجاج کا یہ طریقہ خصوصاً اسلیے اور بھی ناپسند ہوا کہ اس کے بعد آنیوالے امیروں نے اکثر اسی طریق کو اپنا معمول بنایا۔ اور بالخصوص عجم کے ملک میں تو اس طرز نے پوری طرح رواج پالیا۔ اور اس میں عام رعایا کی حق تلفی ہوتی تھی۔

لوا، یا رایت
جھنڈا

فوجی نشانوں کی تاریخ

لوا اور رایت ایک ہی شے ہے۔ اکثر اوقات لوا رایت سے چھوٹا ہوتا تھا، یا یوں ہوتا کہ جس وقت رایت کسی جنگ کے لئے معقود ہوتا تو اسی کو لوا کہا کرتے تھے، زمانہ حال کی اصطلاح میں اس کو علم بنود اور بیرقین کہتے ہیں رایت کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ زمانہ قدیم کے مصری فرمانرواؤں اور ان کے معاصرین نے اس کے استعمال کی بنیاد ڈالی یا انھیں لوگوں سے اخذ کی گئی اسلام سے قبل عرب جاہلیت میں بھی اس کا استعمال عام تھا، ہر قبیلہ کا ایک نشان ہوتا تھا، جس کے نیچے میدان جنگ میں وہ جمع ہوا کرتا،

جنگ و پیکار کے وقت نشان کی بہت بڑی عظمت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ لوگ اپنے نشان ہی کے برقرار رہنے سے لڑتے رہتے ہیں۔ جس وقت نشان گرا وہ بھی ہزیمت کھاکر بھاگ نکلتے ہیں۔ جس موقع پر ہم نے زمانہ جاہلیت کی حکومت کا انداز بیان کیا ہے۔ وہاں یہ بات معلوم ہو چکی ہے

کہ اہل قریش کے منصبوں میں ایک منصب علم برداری کا بھی تھا، اور وہ اس عہدہ کا نام اپنے اس زمانہ کے علم کے نام پر "عقاب" رکھتے تھے۔ جس وقت اہل قریش کسی جنگ کے لئے نکلتے تو اس نشان کو بھی نکال لیتے اور مشورہ کرکے اگر کسی خاص شخص پر رائے قائم ہوتی تو وہ نشان اس کے حوالے کر دیتے ورنہ اُس شخص کے سپرد کرتے جو اس خدمت کے لئے ہمیشہ نامزد چلا آتا تھا۔ یہ عَلم بردار کسی موقع پر بنو اُمیّہ کے گھرانے سے ہوتا تھا، اور کبھی کبھی بنو عبدالدار سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب والوں نے اپنے نشان کا نام "عقاب" اہل روم سے اقتباس کرکے رکھا تھا، کیونکہ "عقاب" اور "نسر" رومانیوں کا نشانِ حکومت (مارکہ تھا) جس کو وہ لوگ اپنے علموں پر اور مکانات پر نقش کرتے تھے، اہل عرب نے ان سے اقتباس کر لیا۔

نشانِ عقاب

"سیرت حلبیہ" میں لکھا ہے کہ غزوہ بدر کبریٰ میں مسلمانوں کے پاس تین نشان تھے۔ ایک سفید تھا۔ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اُسے مصعب بن عمیرؓ کے حوالے فرما دیا تھا، اور باقی دو سیاہ تھے جن میں سے ایک کو حضرت علیؓ بن ابی طالب اٹھائے ہوئے تھے، اور یہ نشان "عقاب" کہلاتا تھا، جو کہ (بی بی) عائشہؓ کے ایک 'مرط'، (صوف یا سیاہ ریشم کا کپڑا جس کو عورتیں اوڑھتی یا تہ بند کے کام میں لاتی تھیں) سے بنایا گیا تھا۔ اور دوسرا سیاہ علم۔ ایک انصاری شخص کے پاس تھا۔ اسی واقعہ میں ابوسفیان سرداروں کا نشان لئے ہوئے تھے، اس کا نام بھی عقاب ہی تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقاب ایک خاص قسم کے نشانوں کا نام تھا، جو رومانیوں کے ہاں استعمال ہوا کرتے تھے، وہ کسی ایک ہی نشان خاص کا نام نہ تھا،

مختلف نشانات

مذہب اسلام کا ظہور ہوا اور اہل عرب شام فارس اور مصر کے اطراف میں پھیلے، ان کی متعدد حکومتیں قائم ہوئیں۔ اور بہت سے قبیلے ہو گئے تو نشانوں کی قسمیں بھی ان کے ہاں بکثرت ہو گئیں۔ ان کی شکلیں طرح طرح کی ہونے لگیں اور رنگ برنگ کے فوجی نشانات نظر آنے لگے۔ دامن بھی وسیع ہوتے اور وہ بہت لمبے لمبے بنائے جانے لگے تھے۔ اور ان نشانوں کے نام بھی جدا جدا رکھے جاتے۔ "ابومسلم خراسانی" نے عباسی دعوت پر قائم ہوتے وقت جو نشان نکالا تھا۔ وہ "ابراہیم" امام نے بنا کر اُسے بھیجا تھا، اس نشان کا نام "ظل" تھا، اور وہ ایک چودہ ہاتھ لمبی چھڑ پر سندھا ہوا تھا۔ نیز اسی ابومسلم نے ایک اور نشان بھی کھڑا کیا تھا جس کا نام

"سحاب" تھا جس کی چھڑ تیرہ گز لمبی تھی یہ نشان بھی امام ابراہیم نے ابومسلم کو بھیجا تھا۔ اتنے بڑے بڑے نشانوں کے استعمال سے مقصود یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں پر رعب چھا جائے۔ اور وہ بلا جنگ و جدل اطاعت پر آمادہ ہو جائیں۔ ۲۳۵ھ میں متوکل نے اپنے بیٹوں کے لئے ولیعہدی کی بیعت لی تو ان میں سے ہر ایک کے واسطے دو نشان بنائے۔ ایک سیاہ ولیعہدی کا نشان اور دوسرا سفید گورنری کا نشان۔ خلیفہ مامون الرشید نے فضل بن سہیل کو تمام مشرقی صوبوں کا گورنر مقرر کر کے اُسے وہاں کی فوجی اور ملکی افسری عطا کی اور اس کا نام "ذی الریاستین" قرار دے کر اس کے واسطے ایک دو شاخہ نیزے پر نشان حکومت بنایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ شدہ شدہ مرورِ زمانہ سے فوجی نشانوں کی متنوع شکلیں پیدا ہو گئیں اور خلفاء و سلاطین نے نشانوں کی کثرت کے ساتھ تفاخر کرنا شروع کیا۔ جس وقت خلیفہ عزیز باللہ فاطمی نے ملکِ شام پر فوجیں روانہ کی ہیں اور اُسے فتح کرنے کی نیت سے نکلا ہے تو اُس کے ہمراہ ۵۰۰ نشانات اور ۵۰۰ بوق تھے۔ اکثر اوقات نشانوں پر ان سلاطین و امرا کے نام بھی نقش کئے جاتے تھے جو فوج کے سپہ سالار ہوتے جس طرح بر کا ابن بجکم نے اپنے نشان پر ابن رائق کی جانب نسبت رکھنے کی وجہ سے "رائقی" کا لفظ کڑھوایا تھا۔

نشانوں کے رنگ

سوا نشان "عقاب" کے جس کی بابت پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وہ سیاہ رنگ تھا اور ہم کو نہیں معلوم ہو سکا کہ جاہلیت کے زمانہ میں نشانوں کے رنگ کیسے کیسے تھے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا نشان بھی عقاب ہی کی مانند سیاہ تھا۔ آثار الاول کے مصنف نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس چند سفید نشانات بھی تھے اسلامی نشانات کی رنگتیں اختلافِ حکومت کے ساتھ بدلتی رہیں۔ بنی اُمیہ کا نشان گہرا سرخ ہوتا تھا علوی حکومت کے داعیوں کا سفید اور بنی عباس کا سیاہ اور عباسیوں کی تو ساری وردی ہی سیاہ ہوتی تھی۔ جیسے ان لوگوں نے اپنے شہیدوں کے رنج والم میں جو بنی ہاشم کے گھرانے سے تھے پہننا شروع کیا تھا اور اس لئے بھی کہ بنی اُمیہ کو ان کی قتل کی خبر پہنچا ئیں اسی سیاہ پوشی کی وجہ سے ان کا نام "مسودہ" مشہور ہو گیا۔ ہاشمی لوگوں میں بھی پھوٹ پڑ گئی۔ اور بنی طالب ہر سمت سے اور ہر وقت میں عباسیوں کے مقابلے کو تیار اور اُن سے آمادۂ پیکار رہے تو انھوں نے عباسی لوگوں کی مخالفت کے خیال سے سفید نشانوں کا استعمال شروع کیا۔

لوگوں کا نام "تبیضہ" مشہور رہا۔ اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی ہاشم کے جو "دعاۃ" اہل تشیع سے تھے اُن کا خاص لباس سبز تھا۔ کیونکہ جس وقت مامون الرشید نے امام "علی بن موسیٰ" کو اپنا ولیعہد بنایا ہے اُس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ تمام سیاہ رنگ کے لباسوں کو علیحدہ کرکے ان کی جگہ سبز کپڑے استعمال کریں یہاں تک کہ جب مامون الرشید اس بیعت سے پھر گیا تو دوبارہ اس نے وہی سیاہ لباس اختیار کر لیا؛

صنہاجہ وغیرہ مغربی ممالک کے بربری بادشاہوں نے اپنے لئے نشانات کا کوئی خاص رنگ نہ رکھا تھا بلکہ انھوں نے رنگ برنگ خالص حریر کے کپڑوں پر زری کا کام بنوا کر انھیں علموں میں لگا لیا۔ مشرقی ممالک کی ترکی حکومتیں صرف بادشاہ (سلطان) کے واسطے ایک علم رکھتی تھیں جس کے سرے پر بالوں کا ایک بڑا بھاری گچھا لگایا جاتا اور اس کو "شالش" اور "چتر" کے نام سے موسوم کرتے تھے ان کے ہاں یہ خاص سلطان کا شعار ہوتا تھا۔ اس کے بعد رایات کی تعداد زیادہ ہوتی رہی، جن کو "سناجق" کہتے تھے اس کا واحد لفظ "سنجق" ہے۔ جس کے معنی ان کی زبان ترکی میں علم کے ہیں۔

عقد لوا صدر اسلام میں خلفاء کا دستور تھا کہ کسی فوج کو میدان جنگ میں بھیجتے ہوئے اس کے واسطے نشانات اپنے ہاتھ سے مرتب کر دیا کرتے تھے اور وہ نشانات امرائے فوج کے سپرد کر دیتے۔ ہر ایک امیر کو اس کے قبیلے کا نشان عطا ہوتا تھا، اور خلیفہ بوقت نشان افسری سپرد کرتے وقت ان کے واسطے فتح وظفر کی دعا اور صبر و مردانگی کی وصیت کیا کرتا۔ عمر بن الخطاب رضؓ کسی امیر کو افسری کا نشان حوالہ کرتے وقت اُسے ترغیب دیتے ہوئے کہتے جاتے تھے "خدا کے نام اُس کی امداد اور اعانت کے ساتھ (میں نے اس کو مرتب کیا) خدا کی تائید ہمراہ لیکر روانہ ہو۔ اسی کی قدرت سے فتح حاصل ہو سکتی ہے۔ اور فتح وظفر کے لئے امر حق اور صبر کا لزوم ضروری ہے جو شخص خدا کے ساتھ کفر کرتا ہے، خدا کی راہ میں اُس سے لڑنا۔ حد سے نہ بڑھنا۔ کیونکہ خداوند پاک حد سے بڑھ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو جانے پر نامردی اور بزدلی نہ دکھانا۔ قدرت پاکر مثلہ (ناک کان ہاتھ پیر کاٹنا) نہ کرنا فتحیابی کے وقت فضول خرچی نہ کرنا۔ بڈھے مرد اور کسی عورت اور کسی معصوم بچہ کی جان نہ لینا جب افواج غنیم کی تم سے ملجائیں

اور بازار جنگ گرم ہو اس وقت خوب جی کھول کر قتل کرنا اور چھاپے مارتے وقت بھی ایسا ہی کرنا،" اگرچہ دعا دینے اور وصیت کرنے میں ہر ایک خلیفہ کا ایک جداگانہ طرز تھا، لیکن اصل سب کی ایک ہی تھی، اسلامی حکمران عاملوں کو کسی شہر کا والی بناتے وقت ان کے لئے بھی نشان افسری تیار کرتے تھے، خصوصاً صدرِ اسلام میں جبکہ عامل بھی وہی شخص ہوتا جو سپہ سالار فوج ہوئے، نیز نجوم کے قاعدہ سے ساعت دیکھکر بھی نشان بنواتے تھے اور اس کے لئے آیات قرآنی میں سے اپنے خیال کے مطابق کوئی ایک آیت پسند کرلیا کرتے تھے، عباسی خلفاء کا دستور تھا کہ کسی سردار فوج یا صاحب ثغر (حاکم ممالک سرحدی) کو نشان حکومت عطا کرتے تو وہ شخص خلیفہ کے محل سے یا اپنے مکان سے بہت سے علمبرداروں کو جلوس میں لے کر نکلتا تھا اس کے ساتھ طبل بجتے جلتے تھے اور بہت شان و شکوہ کے ساتھ شہر کے بازاروں میں ہو کر نکلتا تھا یہاں تک کہ عامل اور خلیفہ کے سامان جلوس میں صرف نشانوں کی کمی بیشی کا فرق رہ جاتا تھا یا نشانوں کی وہ خاص رنگینی وجہ امتیاز ہوتی تھی۔ جو محض خلیفہ کے ساتھ مخصوص تھیں۔

مصر میں فاطمی حکومت کا ایک خاص مکان تھا جسے "خزانۃ البنود" کہتے تھے، اس میں علم نشان اور ورق جمع رہتے۔ اس خزانہ پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دینار سالانہ خرچ پڑتا تھا۔ وہ خلفاء کامل ایک صدی اسی حالت پر قائم رہے اس عرصہ میں جس قدر علم وغیرہ بنائے گئے سب اسی مکان میں جمع پڑے رہے اور نیز اسی کے اندر ہر قسم کے ہتھیار اور سنہری روپہلی زین و لگام کا انبار لگا رہا۔ آخر ش اس خزانہ میں آگ لگ گئی اور کچھ اس میں اندوختہ تھا سوائے اس درا ظہور کے جو بچایا جا سکا سب جلکر خاکستر ہو گیا اسی جلے ہوئے سامان میں ایک خاص نشان بھی شامل تھا جس کو بنو فاطمہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ اور اس کا نام انھوں نے لوائے حمد رکھ چھوڑا تھا۔

جنگی یا فوجی باجے

فوج میں باجے کا رکھنا قدیمی دستور ہے۔ اس کی اصل غرض یہ ہے کہ جنگ کی حالت میں سپاہیوں کی ہمت بندھائی جائے۔ اور تقویت و جرأت دلائی جائے تاکہ ان خطرات کی فکر میں جن کا یقینی خدشہ ہوتا ہے۔ ان کے پاس نہ پھٹکنے پائیں۔ فوج کے آگے آگے گانا یا گنگنانا بھی اسی

لئے ہوتا تھا۔ ایام جاہلیت میں عرب والے طبل کے سوا اور کسی باجے سے واقف نہ تھے۔ اور مسلمان لوگ صدر اسلام میں طبل و بوق کے خیال سے اسلئے باز رہتے اور پہلو تہی کرتے تھے، کہ وہ حکومت کے گھمنڈ اور اس کی شان و شکوہ سے بچنا چاہتے اور اُس کو ناپسند کرتے تھے، لیکن جبکہ خلافت ملک اور حکومت دنیاوی سے تبدیل ہوگئی مسلمان خلفاء (حکمرانوں نے) دنیاوی زیب و زینت کے ساتھ دلبستگی اختیار کی، روم، فارس اور دیگر گزشتہ سلطنتوں کے لوگ ان کے غلاموں کی جماعت میں داخل ہو کر مقرب ہوئے۔ اور انھوں نے ان کو بھی وہ طریق سجھائے جن کے سالک بنکر خود عیش و عشرت کے بحر ناپیداکنار میں کودے اور آخرش اس میں غرق ہوچکے تھے، تو مسلمان فرمانرواؤں نے منجملہ ان چیزوں کے جن کو رومیوں اور فارسیوں سے اخذ کیا تھا فوجی باجوں کو بھی اقتباس کیا خلفاء نے اپنے عاملوں کو جنگی باجے رکھنے کا حکم ابتداءً محض اس غرض سے دیا تھا کہ اس کے ذریعہ سے بادشاہ اور حکام کی عظمتِ شان کا پتہ ملتا رہے۔ مگر آخر کار یہ طریقہ بہت رائج ہوتا گیا۔ اور روز بروز ان باجوں کو ترقی ہوتی گئی۔ تاہم عہد اسلام میں فوجی باجوں کے اندر طبل اور بوق کے سوا اور قسم کا باجہ داخل نہ ہوا۔ اور بسا اوقات صرف ایک فوج میں کئی سو طبل اور بوقیں ہوتی تھیں۔

سلاح

ایام جاہلیت میں اہلِ عرب کے ہاں، تلوار، نیزہ، کمان، اور ڈھال کے علاوہ اور کسی قسم کے اسلحہ نہیں پائے جاتے تھے، انھیں اسلحہ کے استعمال کرنے پر ان کی تمام کوششوں کا دارومدار رہتا۔ خصوصاً کمان کا استعمال بہت مشق کے بعد کیا جاتا تھا، عرب والوں کے لئے روٹی کمانے کا ذریعہ اور اپنی عزت و آبرو بچائے رکھنے کا وسیلہ صرف یہی ہتھیار رہے۔

قوس چونکہ جنگلی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے عرب والوں کی بصارت بہت قوی اور ان کی نظریں تیز ہوتی تھیں اس لئے ان کو کمان کے استعمال میں بہت بڑی مہارت حاصل ہوتی تھی، اور اس مہارت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کو بہ نسبت اور ہتھیاروں کے کمان کی حاجت زیادہ تھی، علاوہ حالتِ جنگ و جدال کے وہ لوگ اس سے ہرنوں کے شکار میں بھی کام لیا

کرتے تھے ان کی تیراندازی کی مہارت اس حد کو پہنچ گئی تھی جس کے سمجھنے میں تامل ہو سکتا ہے
بیان کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی عرب تیرانداز اس بات کا ارادہ کرتا کہ ہرن کی صرف ایک آنکھ کو نشانہ
بنائے تو وہ نہایت آسانی سے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔ اسی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے قادر اندازوں
کو "رماۃ الحدق" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ ایک اچھا قادر انداز عرب "گوہ" جانور کو باندھ کر
درخت سے لٹکا دیتا اور اس پر تیر چلا کر اس کے جس عضو کو چاہتا نشانہ بناتا یہاں تک کہ پشت
کی ہڈی (ریڑھ) کے ایک ایک جوڑ کو تیروں سے چھیدتا جاتا اور کبھی اس کا نشانہ خطا نہ کرتا۔

تیراندازی کی اہمیت

اسلام کا عہد آیا تو اہلِ عرب کی یہی مہارت منجملہ ان امور کے ایک نہایت قوی چیز ثابت ہوئی۔ جنھوں نے اہل روم
کو مغلوب کرنے میں عرب والوں کی امداد کی تھی۔ اس لئے کہ رومی لوگ تیراندازی میں بہت خام تھے
اور اس بات کو ہم نے فتوحِ اسلامیہ کے بیان میں ظاہر بھی کر دیا ہے مسلمان جنرل اپنی فتحیابی میں
تیراندازی کے فوائد اور اس کے احسانات سے غافل نہ تھے۔ بدیں لحاظ وہ اپنے سپاہیوں کو اس فن
کی مشق و مہارت کی برابر تاکید کرتے رہتے تھے، نبی صلے اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے سوار ہو اور تیر
اندازی کرو اور اگر صرف تیراندازی کرنا چاہو تو مجھکو یہ بات سواری سیکھنے سے زیادہ پسند ہے
اور یہ بھی آپ ہی کا قول ہے۔ مردِ مؤمن کے تمام کھیل صرف تین باتوں پر منحصر ہیں اپنے گھوڑے
کو چال ڈھال سکھلائے اپنی کمان کو خوب زہ کر کے تیراندازی کرے۔ اور اپنی بیوی سے ہنستے
بولے اسمیں شک نہیں کہ یہ امر حق ہے۔ بے شک اللہ پاک محض خدا کے لئے ایسے کام کرنے والے اور
خدا کی راہ میں تیراندازی کرنے والے کو جنت میں داخل فرمائے گا۔ ایک بار آپ ممبر پر استادہ
تھے، اسی حالت میں فرمایا تم سے جس قدر قوت بہم پہنچائی جا سکے بہم پہنچاؤ۔ ہوشیار ہو جاؤ
اسمیں کوئی شک نہیں کہ تیراندازی ہی قوت ہے۔ تیراندازی ہی قوت ہے۔ تیراندازی ہی قوت ہے
نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء اور امرائے سپاہ اپنے سپاہیوں کو مشق تیراندازی کی ویسی ہی
تاکید کرتے رہتے جس طرح گھوڑوں کی خبرگیری کرتے رہنے کی۔ کیونکہ اہلِ عرب بڑے شہسوار
ہوتے ہیں۔ وہاں کے گھوڑے تیزی و چالاکی میں اور سوار کے قابو میں بآسانی آجانے کے
بارہ میں مشہور و معروف ہیں۔ فوجی سپہ سالار افسر اپنے ماتحت لوگوں کو ہمیشہ ہدایت کرتے

دیتے تھے کہ اپنے گھوڑوں کی بھی اسی طرح خبر لیتے رہا کریں جس طرح اپنی بیویوں کی غور و پرداخت کرتے ہیں۔

تیراندازی میں ترقی

زمانۂ وسطیٰ میں مسلمانوں نے تیراندازی کے اندر تفنن دکھایا۔ اور کمانوں کے ذریعہ سے کئی ایک مرکب آلات تیار کئے۔ ممکن ہے کہ ان آلات میں سے کوئی آلہ انھوں نے فارس والوں سے اخذ کیا ہو۔ جس طرح عجمی لوگوں نے تاتاریوں سے جنگ کرنے کے وقت ایک آلہ مستنبط کیا تھا۔ جس کا نام "مجراۃ" ہے۔ یہ ایک لوہے۔ یا لکڑی کا نلکہ ہوتا تھا اور اس کے اندر ایک شق (پرزہ) اور بھی ہوتی تھی۔ اس نلکہ میں تیر ڈالکر دوسرے پرزہ کے زور سے اُسے پھینکتے تھے اور بہ نسبت کمان سے چلانے کے اس آلہ کے ذریعہ تیراندازی کرنا تیر کے زور سے چلنے کا فائدہ دیتا تھا جس طرح پر آج کل بندوق کے ذریعہ سے گولی پھینکی جاتی ہے۔ جو تیر اس آلہ کے ذریعہ پھینکے جاتے وہ بہت چھوٹے ہوا کرتے تھے۔ مگر اہل عرب نے "مجراۃ" کو بہت کم استعمال کیا۔

تلوار عرب والے تلوار کو تمام اسلحہ سے افضل و اشرف خیال کرتے تھے۔ اور باہر کے ملکوں سے منگوا کر استعمال میں لاتے۔ غیر ممالک کی بنی ہوئی جو تلواریں عرب والوں میں بکثرت استعمال ہوتیں ان میں سب سے زیادہ مشہور حسب ذیل تلواریں تھیں۔ یمنی، ہندی، سلیمانی، شامی اور خراسانی۔ یہ سب تلواریں "سیوف عتیقہ" کے نام سے مشہور تھیں، نیز ان میں سے ہر ایک قسم کے لئے ایک مخصوص شکل یا علامت ایسی ہوتی تھی، جس کی وجہ سے وہ بہ نسبت دیگر اقسام کے متمائز ہو۔ مثلاً خالص یمانی تلوار جو زمانہ جاہلیت میں بنی ہو دو سوراخوں سے پہچانی جاتی تھی جو "سیلان" کے "سنبل" میں ہوا کرتے تھے۔ (سیلان اُس حصّہ کا نام ہے جو قبضۂ شمشیر کی اصل جگہ ہے) یہ سوراخ ایک طرف سے زیادہ چوڑا ہوتا اور دوسری طرف سے تنگ یا ہر دو رُخ سے برابر یکساں اور بیچ میں بہت تنگ ہوتا۔ یمنی تلواروں میں سے ایک قسم کی تلوار کا نام "مخنوزہ" تھا، ان کے اندر کی نالیاں نہروں کی صورت پر بنی ہوئی تھیں جو مدوّر سوہان کے ذریعہ کھود دی جاتی تھیں بعض تلواروں میں مربع کھدے ہوئے نشانات بنے ہوتے تھے، اور چند تلواریں ایسی بھی ہوتی تھیں

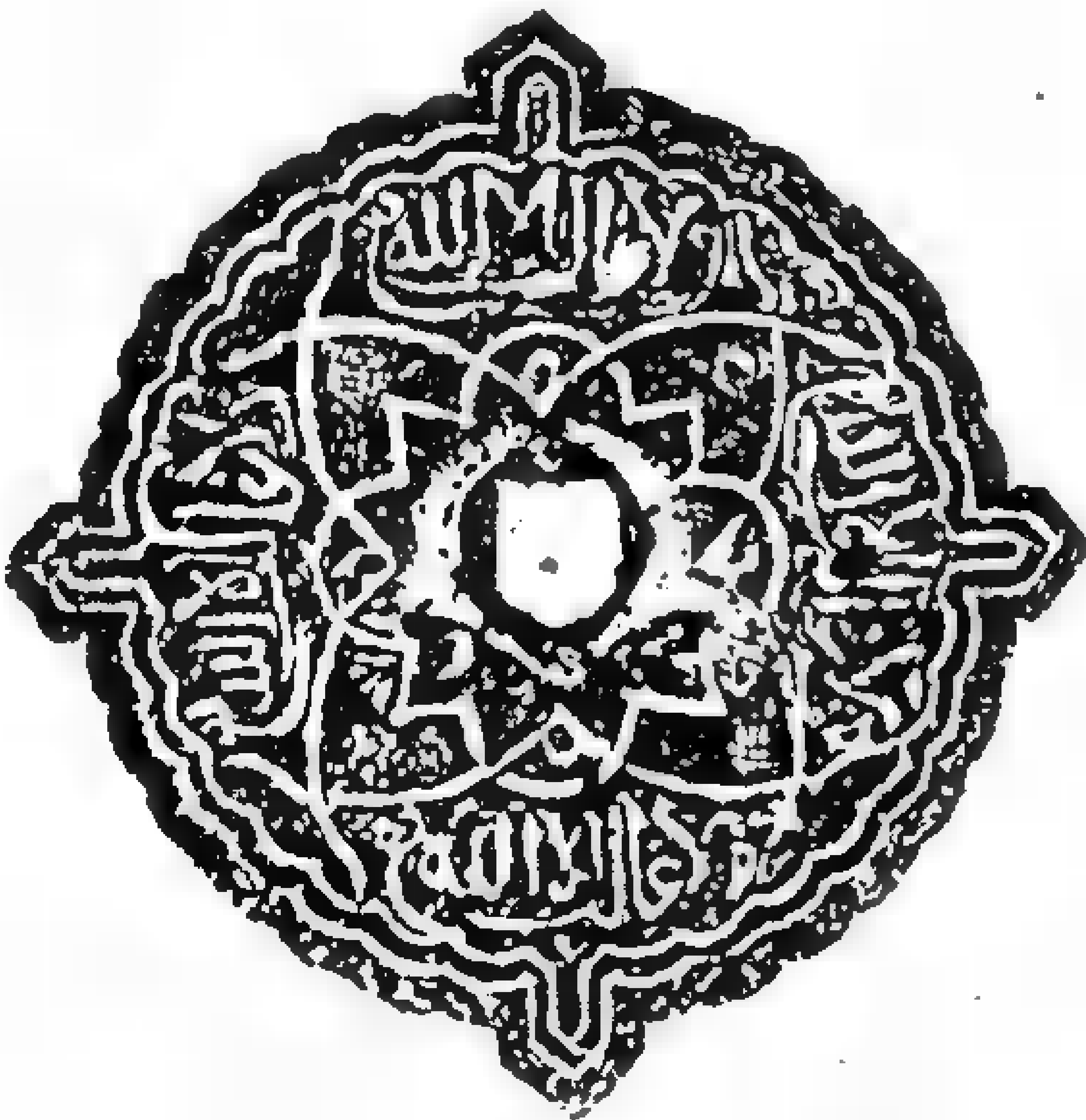
جن میں متعدد نالیاں بنی ہوتیں، مگر یمن کی تلوار رگوں سے بہر حال بہت کم خالی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ان تلواروں پر تصویریں بنائی جاتیں۔ یا کچھ عبارت لکھی جاتی یا پھول بوٹے بنے ہوتے تھے، مگر یہ تلواریں زیادہ تر نرم اور گداز چیزوں کو کاٹ سکتی تھیں۔ خشک یا سخت چیز یا لوہے پر پڑنے سے کر جاتی تھیں اور رومی تلواریں ان سے زیادہ استوار و سخت ہوتیں کیونکہ اہلِ روم ان کی آب بہت اچھی رکھتے تھے، وہ تلواریں لوہے کو بلا تامل کاٹ دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے جب کبھی اہلِ عرب کو کوئی عمدہ کاٹ کی تلوار دستیاب ہوتی تو وہ اس کے قصے باہم نقل کرتے رہتے اور اسے بہت دُور دُور شہروں میں مشہور کر دیتے تھے، اوائل اسلام میں علیؓ بن ابی طالب کی تلوار "ذوالفقار"، اور عمرو بن معدی کرب زبیدی کی شمشیر "صمصامہ" وغیرہ بہت نامی تلواریں تھیں۔ "ذوالفقار" کی شان اسلامی تاریخ میں بہت بڑھی ہوئی ہے۔ آلِ ابی طالب میں مدت تک وراثتہً چلی آئی۔ اس کے بعد اسے مہدی عباسی نے لے لیا، اور مہدی کے پاس سے یکے بعد دیگرے "ہادی"، اور رشید کے قبضہ میں رہی۔ اس کی بابتہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ اس میں اٹھارہ "فقرے" (کمر کی ہڈیوں کے ایسے جوڑ) تھے۔ اس لئے اس کا نام "ذوالفقار" رکھا گیا۔

نیزے نیزے کا استعمال اکثر گھوڑوں پر سواری کی حالت میں ہوتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی اہلِ عرب اُس کے ٹوٹ جانے کے خوف سے اُس پر کچھ اطمینان رکھتے تھے۔ حالتِ جنگ میں نیزے کے استعمال سے متعلق اہلِ عرب کی جو ہدایتیں اور قواعد تھے منجملہ اُن کے اُس کے جنبش دیتے کے طریقوں اور اس کے پھرانے اور لگانے کے قاعدوں میں صاحب آثار الدول نے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے۔ میدانوں، اکھاڑوں میں اور بادشاہوں کے سامنے نیزہ بازی کے کرتب دکھانا اور چیز ہے۔ اور حالتِ جنگ میں اُس کے استعمال کا اور ہی ڈھنگ ہے، جنگ کے وقت نیزہ چلانے کے طریقوں میں ایک طریقہ "مواجہہ" ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ حریف پر حملہ کرتے ہوئے نیزہ کو بغل کے نیچے دبا کر اُسے اپنے گھوڑے کی دونوں کنوتیوں کے بیچ میں رکھو اور اسی طرح سیدھے باندھے مقابل کی جانب بڑھو۔ یہاں تک کہ اس کے قریب پہنچ جاؤ۔ پھر اگر دیکھو کہ حریف نے اپنا نیزہ داہنی جانب ڈال دیا ہے۔ تو تم اپنا نیزہ بائیں جانب کر لو یا بصورتِ خلاف نیزہ کا رُخ دوسری طرف کر دو اور کوشش کرو کہ پہلے تم ہی حملہ کرو اور حریف

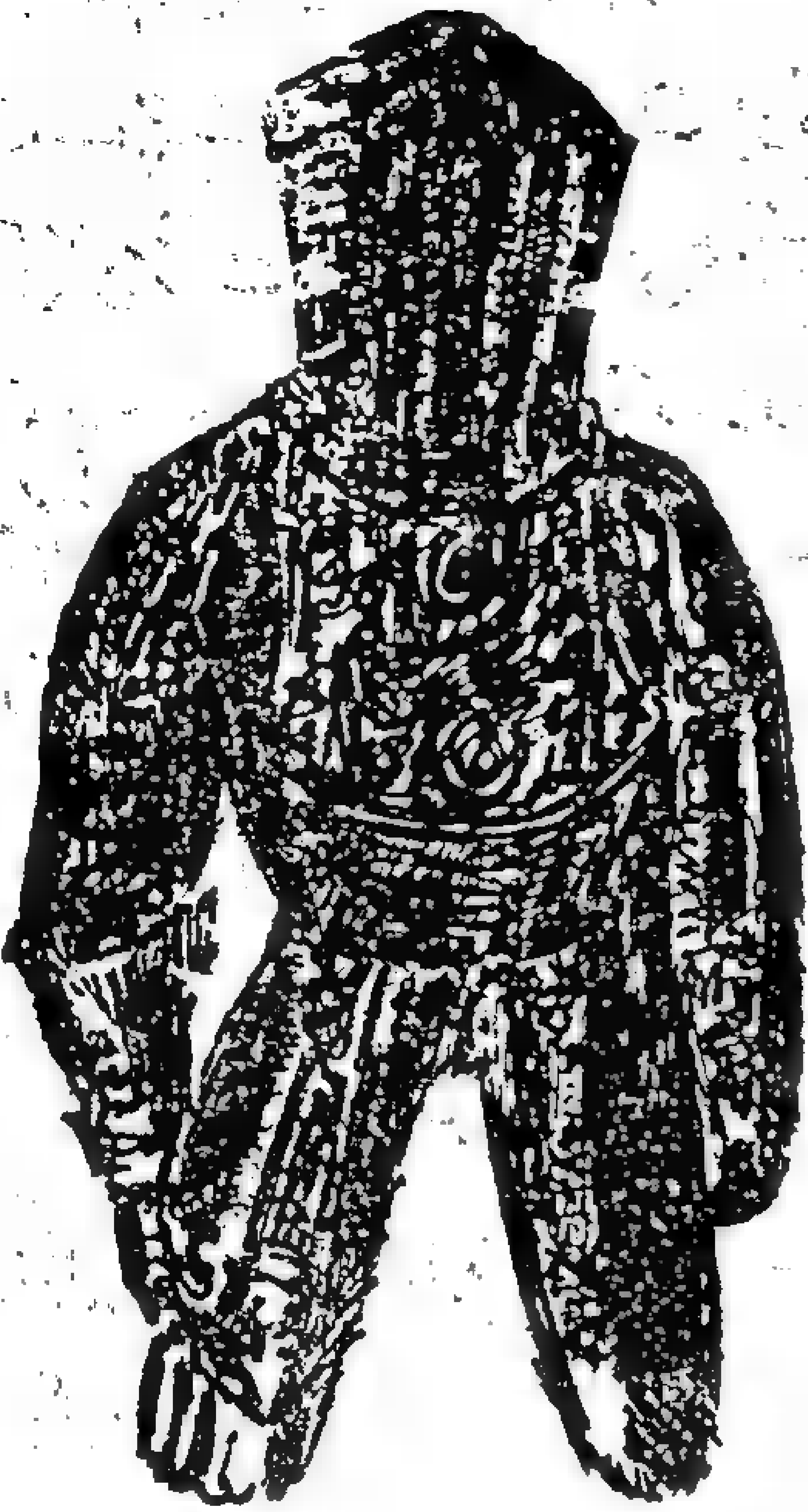
ہوشیار اور مستعد رہو، نیزہ کو داہنے بائیں جنبش دیتے جاؤ۔ تاکہ دشمن پر رعب چھایا رہے۔ اگر تم کو کسی طرف سے چوٹ کرنے کا موقع نہ ملتا ہو تو دشمن سے قریب ہوتے وقت جس مقام کو اُس کے نیزہ کی گردش سے خالی پاؤ فوراً اُسی طرف سے گھسکر حملہ کردو، اور جس حالت میں تم دشمن کے مقابلہ سے نکلنا چاہو اور اس کی ابتدا کرنے کا ارادہ کرو تو اپنے نیزہ کو پیچھے کی طرف سے بائیں ہاتھ میں تھام کر اس کے سر کو اوپر ہوا میں اُٹھائے رہو اور اُسے اپنے داہنے کندھے پر رکھکر اپنی پوری طاقت کے ساتھ حملہ کردو اور اگر دو سواروں کے مقابلہ کیلئے نکلنا ہے تو سب سے پہلے پاس والے سوار پر حملہ کرنا چاہیئے۔ اور جب دونوں قریب ہی ہوں تو اس حالت میں ایک کو دکھانا چاہیئے کہ اُس پر چوٹ کیجاتی ہے اور حملہ اس کے دوسرے ساتھی پر کرنا چاہیئے۔ لیکن پوری طرح حملہ کو تمام نہ کرکے فوراً دوسرے شخص پر ہاتھ چلاؤ۔ اور سچا اور تلا ہوا ہاتھ لگاؤ.... الخ

اہل عرب کے یہاں نیزوں کی اینان مختلف شکلوں کی ہوتی تھیں۔ کمرکھی۔ چوڑی۔ لمبی ترچھی اور سیدھی وغیرہ۔

ڈھال عرب والوں کے ہاں ڈھال کئی قسم کی ہوتی تھی۔ اور ہر ایک قسم ایک امر کیلئے مناسب تھی، کوئی ڈھال سطح، کوئی مستطیل، وسط میں کھدی ہوئی اور کوئی قبہ نما، جس کے کنارے جھکے ہوئے ہوتے تھے اور ہر ایک قسم کی ڈھال کا ایک جداگانہ فائدہ تھا۔ قبہ دار خمیدہ گلر والی ڈھال سے نیزہ کا وار نہیں روکا جا سکتا تھا کیونکہ جہاں نیزہ لگا اور اس میں پیوست ہوا۔ البتہ پتھروں اور



(غرناطہ کی ڈھال)



(ابی عبداللہ آخیر مسلمان بادشاہ اندلس کی زرہ)



(ابی عبداللہ آخیر بادشاہ اندلس کا خود)

تیروں کی بوچھاڑ میں وہ خوب کام دیتی تھی۔ اور حریف کی تلوار بھی اسپر سے رُک جاتی تھی۔ مستطیل ڈھال تیروں سے بچانے کے کام آتی۔ اس کا سرا سوار کے سر کو اور اس کی لمبائی اُس کے جسم کو محفوظ رکھنے میں کارآمد ہوتی، اور اس کی آڑ میں سوار سر کھولے بغیر ہی اپنی ایک آنکھ سے سامنے کی چیزوں کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ اور مسطح ڈھال نیزے سے بچانے میں مفید ہوتی۔ کبھی دو شخص ساتھ ساتھ نیزہ بازی میں شریک ہوتے اور ایک شخص دوسرے کو ڈھال کا کام دیتا تھا۔ مسلمانوں نے ڈھال بنانے کے یہاں میں لطف طبع کے جوہر بھی دکھائے تھے۔ اُن پر آیتیں اور پند و نصیحت کے جملے اور اشعار وغیرہ نقش کئے تھے، نیز ہر ایک ملک کی ڈھال دوسرے ملک کی ڈھال سے شکل میں جدا ہوتی تھی۔ چنانچہ دمشقی عراقی اور غرناطہ کی بنی ہوئی ڈھالیں اور دیگر مقامات کی ساختہ بھی

داخل ہیں۔

زرہ

اہلِ عرب کے ہاں زرہیں بہت سی قسموں کی ہوتی تھیں۔ اسمیں اسپات فولاد، اور کتان کی زرہیں عمدہ ہوتی تھیں، کتان کی زرہ کو "دلاص" کہتے تھے اہلِ عرب میں غالباً صرف سوار زرہیں پہنتے تھے، جو روم و فارس کی بنی ہوتی تھیں نیز ان کے پاس چند زرہیں مقررہ ناموں سے مشہور تھیں جیسے خالد بن جعفر کی زرہ جس کو "ذات الاذنہ" کہتے تھے، اور اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اس میں چند کڑیاں یا ہک اسطرح کے لگے ہوئے تھے، کہ جب اس کا پہننے والا دامن سمیٹنا چاہتا تو انھیں ہکوں میں دامن کے سرے لٹکا لیا کرتا۔ زرہ اس پرزہ سے مرکب ہوتی جو سینہ کو محفوظ رکھتا۔ اس پرزرہ کا نام جوشن ہوتا اور بیضہ، خود اور مغفر



(ایک بادشاہِ مصر کا خود)

سر کی حفاظت کے لئے ہوتے، زرہ کے چند پرزے کلائیوں، پنڈلیوں اور ہاتھوں کے پنجوں کی حفاظت کے لئے بھی ہوتے تھے۔

اوائلِ اسلام میں اہلِ عرب کے اسلحہ صرف اسی قدر تھے بعد ازاں اہلِ عجم کے کچھ اسلحہ ان کے استعمال میں اضافہ ہوئے۔ مثلاً خنجر، تبر، اور رفارس وغیرہ اور ان کی بناوٹ میں موقع اور وقت کے مطابق تفنن بھی کیا گیا۔ دیکھنے میں دمشق کی بنی ہوئی تلوار ملک عراق کی ساختہ تلوار سے جداگانہ اور مصر کی بنی ہوئی زرہ اندلس کی بنی ہوئی زرہ سے علیحدہ نظر آئیگی اس کا فرق

۱۸ اور ۱۹ کے معائنہ سے سمجھ میں آسکتا ہے ۔ جس میں پہلی شکل اندلس کے بنے ہوئے خود کی ہے ۔ اور دوسری مصر کے بنے ہوئے خود کی ۔ اسی پر تمام اسلحہ کی شکلوں کو قیاس کرلینا چاہیئے جن کی تفصیل سے ہم یہاں بخوفِ طوالت قطع نظر کرتے ہیں۔

محاصرہ کے آلات

اہل عرب کے ہاں محاصرہ کے آلات بالکل نہ تھے کیونکہ وہ اس کے آدی نہ تھے ۔ کہ قلعوں کا محاصرہ کریں ۔ ان کے رہنے کے گھر کھلے میدان میں استادہ کئے ہوئے خیمے ہوتے تھے جن کی حفاظت بجائے خندقوں اور شہر پناہوں کی تعمیر کے وہ خود کیا کرتے تھے ، اہلِ عرب نے سب سے اوّل جب خندق کی بنیاد ڈالی دہ ، وہ خندق تھی جو جنگِ احزاب کے دن ۵ھ میں مدینہ کے گرد سلمانؓ فارسی کی رائے و مشورہ سے تیار کی گئی تھی ، مگر جب اہلِ عرب کا میل جول عجمی لوگوں سے بڑھا تو جن چیزوں کا اقتباس انھوں نے اہل عجم سے کیا منجملہ اُن کے آلات محاصرہ بھی تھے اور ان میں بھی اہم آلات حسبِ ذیل تھے منجنیق ۔ دبابہ ۔ کبش ۔ اور یونانی آگ ،

منجنیق ایک قاذب آلہ تھا ۔ قدیم زمانہ میں فینیقیہ والوں نے اُسے استعمال کیا اور ان سے یونانیوں اور اسرائیلی لوگوں نے اخذ کیا ، اِس کا ذکر مکابئین کے سفر میں کئی جگہ آیا ہے ، یہ صنعت یونانیوں کے ذریعہ سے تمام دنیا کی سلطنتوں میں پھیلی اور اس کو اہل فارس نے بھی استعمال کیا جن سے اِسلام کے بعد اہل عرب نے اخذ کیا ،



(رومانی منجنیق گرز سے پھینکتا)

مشہور یہ ہے کہ قرنِ اوّل کے وسط میں روم و فارس والوں سے ملکر اہلِ اسلام نے اس آلہ کا استعمال نہیں کیا، مگر ہم نے "سیرۃ حلبیہ" میں دیکھا ہے کہ عرب والوں نے اس آلہ کو محاصرۂ طائف میں استعمال کیا اور اس سے کام لینے کی ترکیب بھی سلمان فارسی نے اس طرح بتائی تھی جس طرح انھوں نے اہلِ فارس کے دیگر فنونِ حرب سکھائے اور کہا جاتا ہے کہ منجنیق تو خود سلمان رضؓ نے اپنے ہاتھوں سے تیار کر دیا تھا، سیرۃ حلبیہ کے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس زمانہ میں مسلمانوں نے خیبر کا ایک دشوار گذار قلعہ فتح کیا ہے تو انھیں وہاں سے کئی منجنیقیں اور "دبابے" دستیاب ہوئے تھے۔

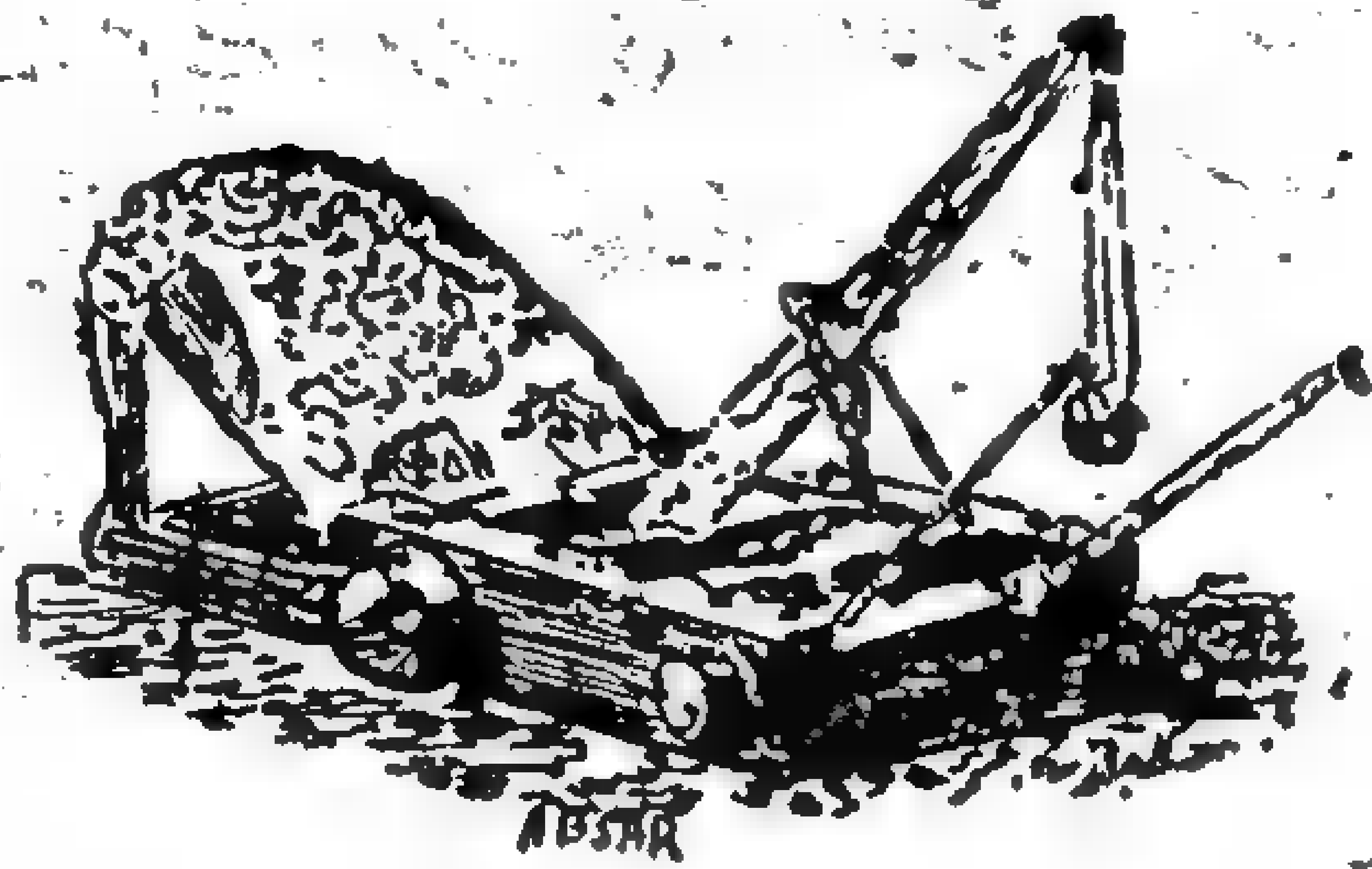
منجنیق کی قسمیں

منجنیق کی بہت سی قسمیں تھیں جن میں بڑی چھوٹی اور لبلبیوں اور کمانیوں کے ذریعہ سے کھینچنے والی یا گوپھن کی طرح چکر سے چلنے والی ہوتی تھیں، ان کا استعمال تیر پتھر یا نفط کے شیشے پھینکنے کی غرض سے ہوتا تھا اور کبھی کبھی بچھو وغیرہ موذی جانور بھی ان کے ذریعہ سے پھینکے جاتے تھے، اگر وہ چیزیں جن کو پھینکنا منظور ہوتا وزن میں ہلکی ہوتیں تو شیشہ کے ڈلے رکھکر ان کو بھاری کر دیتے اور اگر سیال ہوتیں جیسے نفط وغیرہ تو اس کے لئے ایک پیالہ نما برتن ترازو کے پلّے کی طرح زنجیروں سے لٹکا ہوا استعمال میں لایا جاتا۔

بیسویں شکل میں ایک رومانی منجنیق کی تصویر دکھائی گئی ہے جس کے ذریعہ سے تیراندازی کیجاتی تھی، اس تصویر سے معلوم ہوگا کہ ب اور ج دو قائموں کے اندر بہت سے تیر لگے ہیں۔ جن کے سرے دشمن کی جانب ہیں۔ دو شخص (د) چرخی کو گھما رہے ہیں اور (د) چرخی (ن) دندانہ دار چرخی کو چکّر دیتی ہے جس پر ایک قائمہ کے کنارہ سے ممتد ہونے والی رسی (ل) لپٹتی جاتی ہے جو (س) چکر سے اور (ف) سے لشکر قائمہ (د) کے کنارہ کی جانب ہے۔ یہ قائمہ ایک لوہے کے ٹکڑے سے بنا ہے اور اس میں تسمے لگے ہیں۔ جس وقت وہ کمان کی طرح کھنچ چکتا ہے اور اس کی قوت اتنی ہو جاتی ہے کہ اگر اس کی رزہ کو چھوڑا جائے تو تیروں کے سروں پر زور سے گرے گا۔ اور انھیں دور تک پھینک دیگا

اگلی شکل میں پتھروں کے پھینکنے کے منجنیق دکھائی گئی ہے یہ ایک لکڑی کا سیدھا

پھرڑا ہے جس کے سرے پر ایک گوپھن نما چیز لٹک رہی ہے۔ اس میں پتھر رکھکر پھرڑ کو تسموں کے ذریعہ پیچھے کی جانب کھینچتے ہیں، پھرڑ کے نیچے ایک مضبوط کمانی لگی ہے جس وقت کمانی پوری



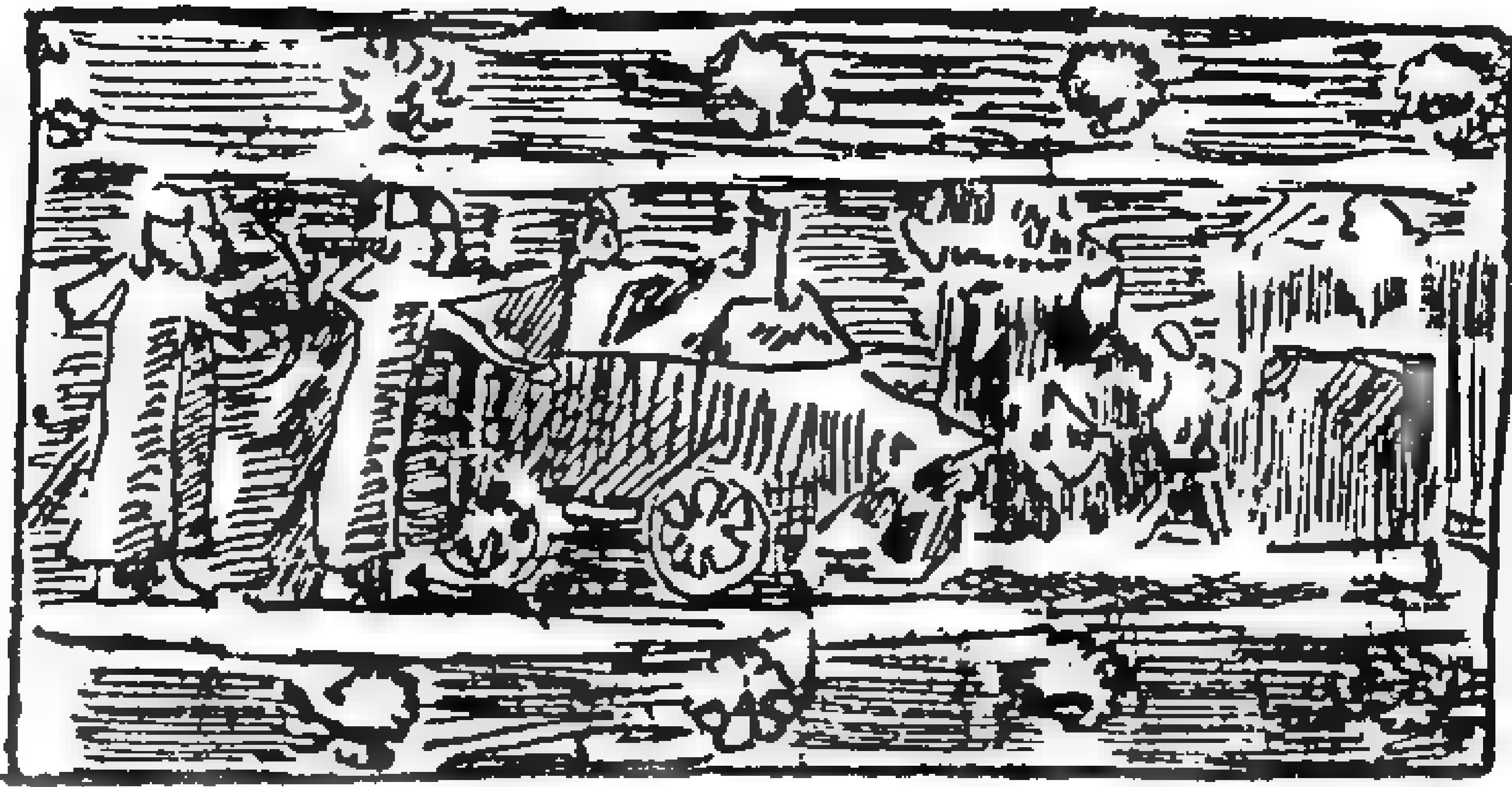
(پتھر پھینکنے کی منجنیق)

طرح دب جاتی ہے، یکایک اُسے چھوڑ دیتے ہیں اور پھروہ زور کے ساتھ آگے کو جھکے ہوئے ایک مسطح تختہ پر گر جاتا ہے۔ اور پتھر نکلکر دور جا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ منجنیق کی چند اور صورتیں بھی ہیں جو اسی شکل کے تحت میں آجاتی ہیں۔

منجنیق کا استعمال منجنیق کا استعمال بڑے بڑے پتھروں کے ذریعہ سے قلعوں کے منہدم کرنے، دشمنوں پر تیر برسانے، دشمنوں کے مکانات کو نفط کے ذریعہ سے جلانے وغیرہ ضرورتوں میں کیا جاتا تھا۔ آگ سے جلا کر شعلہ زن نفط کو بیتی کے پلڑوں میں رکھکر اور ہانڈی وغیرہ کے ہمشکل ظروف میں بھر کر پھینکا جاتا تھا۔

منجنیقیں قدوقامت کی چھوٹائی بڑائی میں مختلف ہوا کرتی تھیں۔ اکثر اوقات بعض صفتوں کے لحاظ سے منجنیقوں کے بھی ویسے ہی نام رکھدئے جاتے تھے۔ جیسے آج کل جہازوں اور توپوں کے ہوتے ہیں۔ حجاج بن یوسف کے پاس جو منجنیق تھی اس کا نام "عروس" تھا۔ اور اس کے استعمال کے لئے پانچسو آدمیوں کا عملہ مقرر تھا، اس منجنیق کو ۸۹ھ میں محمد بن قاسم ہندوستان کی جنگ پر لایا تھا، اور اس کے ذریعہ سے اہل ہند کا ایک بہت بڑا بت خانہ توڑ ڈالا تھا،

(ایک اشوری دبابہ جس کے ذریعہ سے شہر پناہ منہدم کیجا رہی ہے)



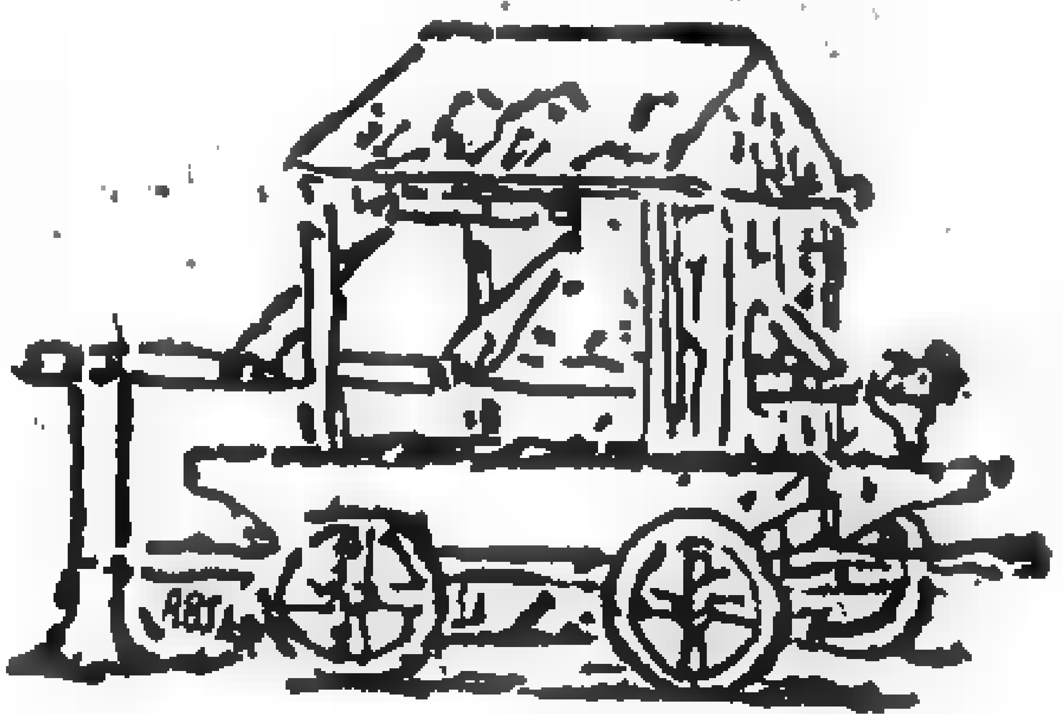
دبابہ ایک چلانے کا آلہ ہوتا تھا جو بھاری لچکدار لکڑی کے تختوں سے بنا کر سرکہ میں تر کئے ہوتے نمدوں اور کھالوں سے منڈھا جاتا تھا، تاکہ اس پر آگ کوئی اثر نہ کر سکے۔ اس کے بعد پہیوں پر چڑھا کر اُسے چلاتے۔ کبھی اس تدبیر سے ایک لکڑی کا بُرج تیار کیا جاتا۔ اس کو بہت سے لوگ گول پہیوں کے ذریعہ سے دھکیلتے لے چلتے تھے، کچھ لوگ اس کے اوپر چڑھتے اور اُس پر سے شہر پناہ کی فصیلوں پر چڑھ جاتے جس کا بیان آگے چلکر آئے گا۔ یہ آلہ بہ نسبت منجنیق کے زیادہ قدیم ہے۔ ابتداءً اس کو اہل مصر نے اور اشور والوں نے استعمال کیا، اُن سے یونانی اور پھر رومانی اور پھر فارسیوں نے اخذ کیا۔ سب سے آخر میں مسلمانوں نے بھی اس کا استعمال سیکھا۔ یہ آلہ کیا تھا گویا پہیوں پر چلنے والا ایک قلعہ ہوتا تھا، جس کے وسیلہ سے فصیلوں پر دھاوا کیا جاتا اور محاصرین سے ان پر چڑھکر جنگ کی جاتی تھی۔



کبش رومانی

کبھی قلعہ کی دیواریں منہدم کرنے کے لئے دبابہ کو کام میں لاتے اُسے چلا کر دیوار کے نیچے پہنچا دیتے اور اس کا سر نوکدار بنا دیتے تھے تاکہ اس سے دیواروں کو ٹکرا کر کھود ڈالیں۔ اس طرح پر بالآخر بڑی بڑی فصیلوں کو منہدم کر دیتے۔

کبش یہ بھی دبابہ کی شکل کا ہوتا تھا لیکن اتنا فرق تھا کہ اس کا سر آگے کو بینڈھے کے سر سے مشابہ اور نکلا ہوا ہوتا تھا جس کے اندر لوگ پناہ لے کر بیٹھتے اور کبش کو بھی قلعہ یا شہر پناہ کی دیواریں منہدم کرنے کے کام میں لاتے تھے، مذکورہ بالا مینڈھے کا سر لکڑی یا لوہے کی ایک موٹی سی بلّی میں لگا ہوتا تھا .... ، اور وہ بلّی دو رسیوں میں جو دبابہ کی چھت سے لگی ہوئی چرخیوں پر کھنچا کرتی تھیں، لٹکا کرتی تھی تاکہ اس کے کھینچنے میں آسانی ہو۔ اس طریقے پر صرف ایک آدمی دبابہ کے اندر یا اس کے پیچھے سے اس سر کو دیوار میں مارتے رہنے کے لئے کافی ہوتا۔ یہاں تک کہ اسے کھود کر سوراخ بنا لیتا۔



(کبش کا سرا)

پچھلی شکل میں ایک رومانی کبش کی تصویر دی گئی ہے جس کے ذریعہ سے برطانیہ والوں کی شہر پناہ پر حملہ ہو رہا ہے اور برطانی لوگ اس نئے آلہ کو دیکھ کر خوف کھاتے ہیں۔ اور نشان صلح دکھانے کو اطاعت قبول کرنے کو نکلے ہیں:

مسلمانوں نے اپنی بہت سی جنگوں میں فصیلوں پر چڑھنے کے لئے دبابہ اور کبش سے کام لیا ہے اور ان کے منہدم کرنے یا توڑ کر راستہ بنانے کا بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ مسلمانوں کا دستور تھا کہ ایک فوج میں متعدد دبابے رکھا کرتے تھے، جن میں زیادہ تر چھوٹے اور مختصر اس قسم کے ہوتے کہ ان میں صرف چند شخص سما سکیں جو موقع بموقع ڈھب لگا کر فصیلوں پر چڑھ جائیں خلیفہ معتصم باللہ نے "عموریہ" کو فتح کرنے کے لئے بہت سے دبابے بنوائے تھے۔ جن میں کئی ایک اتنے بڑے بنے تھے، کہ ان کے اندر دس آدمی بخوبی سما سکتے تھے۔

فصیلوں پر چڑھنے کے لئے دبابوں کے استعمال میں لانے کی یہ صورت تھی کہ کچھ لوگ انہیں سوار ہو کر انہیں لڑھکاتے ہوئے شہر پناہ کی دیواروں پر لیجاتے۔ اگر کوئی خندق دیوار تک پہنچنے میں حائل ہوتی تو اُس پر پلوں کی طرح تختے اور شہتیر ڈالدیتے، اور اگر خندق چوڑی ہوتی تو اُسے لکڑیوں اور ریت سے بھرے ہوئے بوروں اور مٹی وغیرہ سے جو اُن کے ساتھ رہتی پاٹ لیتے جو لوگ خندق پاٹنے میں مصروف رہتے تھے دبابہ کے اندر بیٹھنے والے لوگ اُن کی حفاظت ڈھالوں اور بڑی بڑی تھالیوں سے کرتے تھے، تاکہ ان پر ان تیروں پتھروں اور نفط کے شعلوں کا اثر نہ ہونے پائے، جن کی بارش محاصرین کی طرف سے فصیلوں پر سے ہوا کرتی تھی۔ خندق پاٹ کر دبابہ کو دیوار کے متصل لیجاتے اور اُسے ستونوں کے ذریعہ قائم کرنے کے بعد پھر کر اُس میں سے نکل پڑتے اور دیوار سے چمٹ جاتے۔ اگر اس طریق سے فصیل کی سطح ہاتھ نہ آتی تو اوپر چڑھنے کے واسطے سیڑھیاں لگا لیتے اور اوپر چڑھکر اندر شہر میں اُتر جاتے بشرطیکہ اس کارروائی کا موقع ملتا ورنہ فصیلوں کے اوپر ہی لڑتے رہتے تھے۔



یونانی آگ

اہلِ عرب نے روم والوں سے جن چیزوں کا اقتباس کیا منجملہ اُن کے ایک چیز یونانی آگ بھی تھی یہ آگ اصل میں مشرق والوں کی اختراع ہے کیونکہ ایشیائی لوگ اپنی لڑائیوں میں ایک قسم کا جلد بھڑک اُٹھنے والا مرکب استعمال کیا کرتے تھے جس کی خبر یورپ والوں کو ساتویں صدی عیسوی سے

پہلے نہ ہوئی تھی، گمان یہ ہے کہ "کالینکوس" نامی ایک شامی شخص نے اس مشتعل ہونے والے مادہ کو یورپ تک پہنچایا، اور انھیں اس کے استعمال اور بنانے کا طریقہ سکھایا، روم والے اس زمانہ میں اس کے سخت محتاج تھے۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے قسطنطنیہ وغیرہ اپنے شہروں سے جو یورپ اور ایشیا میں باقی رہ گئے تھے، اہلِ عرب کو پسپا رکھ سکیں اور اس مرکب مشتعل ہونے والے مصالحہ کے دستیاب ہونے سے وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اہلِ عرب نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کئی مرتبہ کیا۔ مگر اسی آگ کی وجہ سے اُسے فتح نہ کر سکے۔ رومیوں نے ان چیزوں کے نام چھپانے میں بہت کوشش کی جن سے یہ مرکب بنتا تھا، یہاں تک کہ اہلِ عرب خود ہی اس سے واقف ہو گئے۔ اور انھیں معلوم ہو گیا کہ یہ روغن گندھک اور بعض روغنی اشیاء اور تیلوں کے میل سے بنتا ہے۔ جو سیّال ہونے کی وجہ سے ایک تانبہ کے نل کے ذریعہ سے جس کو جہاز یا کشتی کے اگلے حصہ پر باندھ رکھتے تھے مخالفوں پر پھینکا جاتا ہے۔ اس سیّال مادّہ کو جلا کر پھینکتے تھے، یا جلتے بلتے باتوں کی شکل میں اُسے پھینکتے تھے۔ یا کتان کے چیتھڑے اُس میں تر کر کے اور آگ لگا کر جہازوں اور مکانوں پر پھینک مارتے جس سے وہ جلکر خاک ہو جاتے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس آگ سے عبد اللہ بن زبیرؓ کو محاصرہ میں لیتے ہوئے حصین بن نمیر نے خانہ کعبہ کو جلا دیا تھا۔ وہ اس قسم کے مشتعل مادّہ سے لگی تھی "پیرس" کے مکتبۂ اہلیہ میں ایک قلمی مسوّدہ رکھا ہوا ہے۔ جن پر کچھ عربوں کی تصویریں بنی ہیں کوئی ان میں گھوڑے پر سوار ہے۔ اور کوئی پیادہ ان کے ہاتھوں میں چیتھڑے گدڑے یونانی آگ سے جلتے ہوئے موجود ہیں جن کو وہ اپنے دشمنوں پر پھینک رہے ہیں (دیکھو شکل پچھلی اور اہلِ عرب یونانی آگ کو پھینکا جانے والا لفظ کہا کرتے تھے۔

بارود کی ایجاد اس مقام پر ایک اعلےٰ درجہ کی اختراع پائی جاتی ہے۔ جس کو موجد ہونے کا فخر فرنگی لوگوں کی جانب منسوب کیا جاتا ہے، حالانکہ وہ چیز عرب کی ایجاد ہے۔ اس سے ہماری مراد بارود کا اختراع ہے۔ اہلِ فرنگ کے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ بارود کا موجد ایک شخص "شوارتز" نام گزرا ہے۔ جس نے ۱۳۲۰ء میں اس مصالحہ کو ایجاد کیا۔ مگر ایک انگریز پادری مسمیٰ "روجر بیکن" نے جو تیرھویں صدی عیسوی میں گذرا ہے ایک ایسے مرکب مصالحہ کا ذکر کیا ہے جو بارود کی قسم سے اس کے زمانہ میں رائج تھا اور

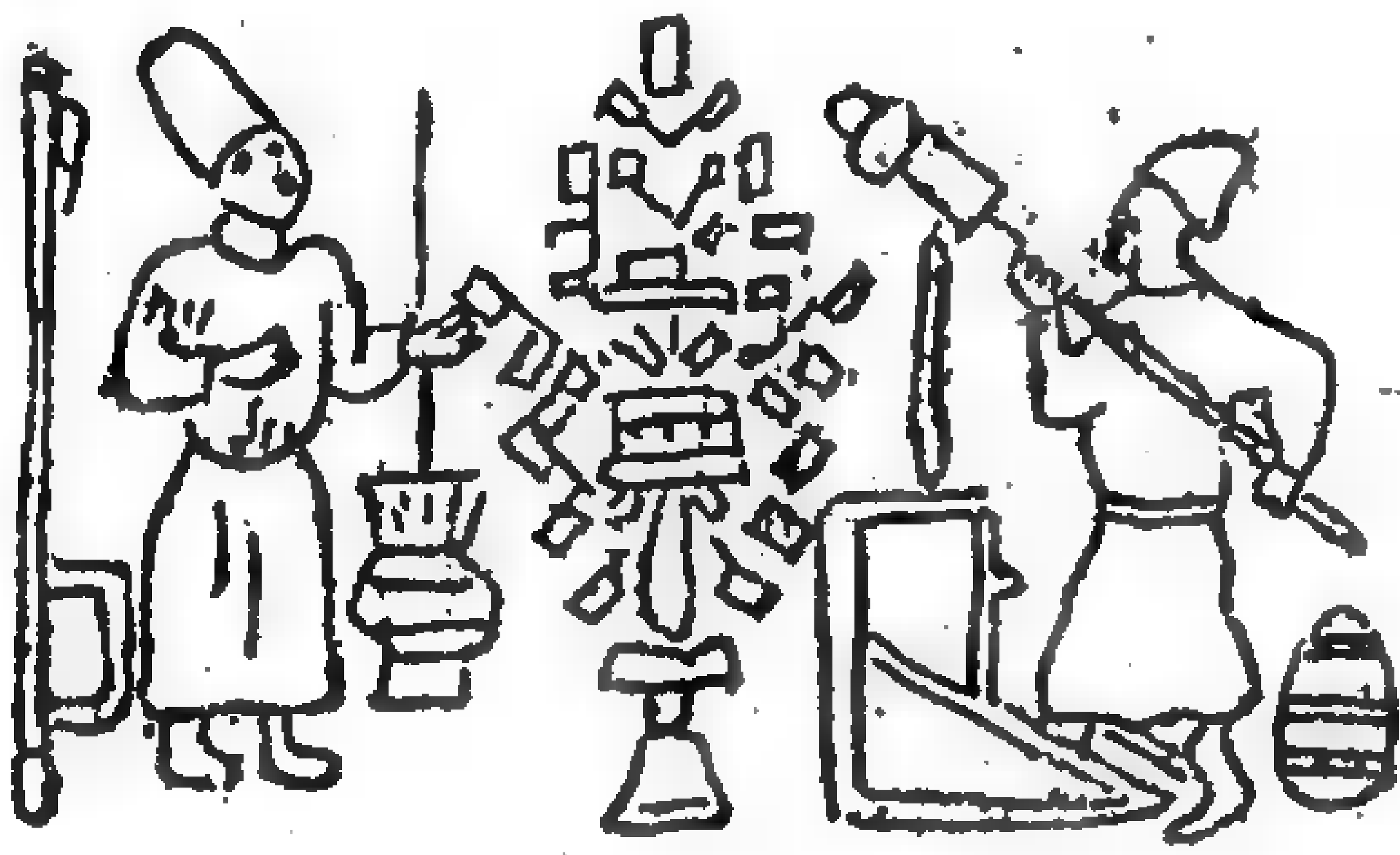
یہی بیان ہے کہ بارود کے استعمال کرنے میں اہل عرب تمام لوگوں سے سبقت لیگئے ہیں اور اگر انہوں نے وہ ایجاد نہیں کی تو کم از کم اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اس مادہ کو ایسی حد تک ضرور پہنچا دیا تھا کہ وہ قرون وسطی میں اچھی طرح رائج و مشہور ہوگیا۔ اسپین کے نامور مشرقی مورخ "کانڈی" (المتوفی ۱۸۲۰ء) نے بیان کیا ہے کہ مراکش والوں نے ۱۱۱۸ء میں "سرقوسہ" کے باشندوں سے جنگ کرتے وقت آتشبار اسلحہ کا استعمال کیا تھا

ابن خلدون کا بیان اس پرانی بات اور مستزاد کرنی چاہیے کہ عربی تواریخ اس امر کیجانب اشارہ کر رہی ہیں کہ بلاد مغرب میں جنگ کرتے وقت تیرھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے اس قسم کے آتشبار اسلحہ استعمال کئے۔ اس کیفیت کا صریح ذکر ہمیں "ابن خلدون" کے اس بیان میں ملتا ہے جو اس نے ابی یوسف سلطان مراکش کے "سجلماسہ" کو فتح کرنے اور اس کو "بنی عبدالواد" کے ہاتھوں سے نکالنے کیلئے ۶۷۲ھ (۱۲۷۳ء) میں چڑھائی کرنے کے متعلق لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے جسوقت سلطان ابو یوسف نے مغربی ممالک کو فتح کرکے وہاں کے شہر اپنے مطیع و منقاد بنائے اور بنی عبدالمومن کے دارالخلافت پر تسلط کرکے ان کو نیست و نابود کر ڈالا۔ طنجہ کو فتح کر لیا۔ مغربی سرحد اور شرارت و فتنہ انگیزی کے بندرگاہ "سبتہ" کو مطیع کر لیا تو اسوقت اسے قبلہ رخ والے ملکوں کی طرف خیال کرنے کی نوبت آئی اور اس نے قصد کیا کہ "سجلماسہ" کو فتح کرکے بنی عبدالواد کو جو اس ملک پر قابض و متصرف تھے وہاں سے نکال دے اور بجائے ان کی حکومت کے اپنا اثر و اقتدار قائم کرے سلطان ابو یوسف تمام فوجیں لے کر بہر و بنگاہ کیساتھ رجب ۶۷۲ھ میں اسپر فوج کشی کرنے کو اٹھا اور اسے جا گھیرا۔ تمام اہل مغرب زناتہ عرب اور بربر کے لوگ اور اپنی ساری فوجیں کیا پیدل اور کیا سوار سب وہاں جمع کر دیں۔ ہر قسم کے آلات حصار لگا دیئے منجنیقیں گردوں اور نفط اندازی کے آلات ان کے علاوہ ایسے آلات جو بارود سے مشتعل ہونیوالی آگ کے ذریعہ سے لوہے کے ٹکڑے برساتے اور قدرت باری کا تماشہ دکھاتے تھے۔ نصب کرکے ایک سال تک صبح و شام اس پر دھاوے کئے گیا۔ مگر کوئی صورت کامیابی کی نہ نکلتی تھی۔ آخرکار پتھروں کی بوچھاڑ سے شہر پناہ کا ایک مختصر حصہ ٹوٹ گیا اور ایسی بے خبری میں ٹوٹا کہ شہر "سجلماسہ" کے لوگ اس کے درست کرنے کی تدبیر بھی نہ کر سکے اور ابی یوسف کے سپاہی لپک کر شہر میں گھس گئے۔ جسے انہوں نے بزور بازو فتح کر لیا۔

ابن خلدون کے مندرجہ بالا قول سے اس بات کی صریح شہادت ملتی ہے کہ بارود اہل عرب کے یہاں ایک مشہور چیز تھی۔ اور وہ لوگ اس زمانہ سے نصف صدی قبل ہی اس کا استعمال اپنی

لڑائیوں میں کرتے رہے تھے جس زمانے میں کہ اہل فرنگ "سورٹس" کو اس کا موجد بتاتے ہیں اور یہ بات بھی ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اہل عرب نے بارود بنانے کی ویسی ہی ترکیب بیان کی جیسی کہ آج کل پائی جاتی ہے۔

قدیم تصویروں سے ثبوت سینٹ پیٹرسبرگ دارالخلافہ روس کے کتبخانہ میں ایک قدیم عربی مسودہ موجود ہے جس میں دو عربوں کی تصویریں بنی ہیں جو آتشبار اسلحہ بنانے میں مصروف ہیں



ایک شخص دائیں جانب ہے اور ہاتھ میں بندوق کی شکل کا ایک آلہ لئے ہے۔ اس آلہ میں توڑا لگا ہے اور توڑے کے اندر بارود بھری ہے اس شخص نے اس توڑے کو ایک شعلہ سے جو اس کے سامنے ہے قریب کر دیا ہے تاکہ بارود مشتعل ہو کر گولی کو دور پھینکدے

اسی مقام کے مناسب ایک سوار کی تصویر بنی ہے جو روئیں دار کپڑے میں لپٹا ہوا ایک نیزہ



لئے ہے تاکہ ضرورت کے وقت انھیں رووں کو نوچ کر اور نفط میں تر کرکے دشمن پر پھینکا جاسکے۔ اس سوار کے دونوں جانب دو پیدل آدمی ہیں۔ ان دونوں شخصوں اور سوار کے گھوڑے کے جسم پر بھی ویسا ہی روئیں دار لباس ہے جو وقت حاجت نفط کے لئے استعمال ہوسکتا ہے۔

حالت جنگ میں فوجی نظام

تاریخ فوج کے بیان میں ہم اسبات کا ذکر کرچکے ہیں کہ متمدن قوموں کے یہاں فوجی نظام کی دو صورتیں تھیں یعنی سیدھی صفیں بنانا علیحدہ علیحدہ حصے کرنا۔ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں کسی قاعدہ اور نظام کے پابند نہ تھے

ان کی جنگ اس قسم کی ہوتی تھی جسے وہ "کر" اور "فر" سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ اور اس طریقہ کا نام خود ہی اپنے معنوں کو عیاں کر رہا ہے۔ کیونکہ جسوقت وہ لڑنے کے لیئے تیار ہوتے تو یکایک اپنے دشمنوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اور جب دیکھتے کہ انھیں کسی قسم کی کمزوری لاحق ہو رہی ہے تو فوراً بھاگ نکلتے۔ اور پھر پلٹ کر حملہ کر دیتے۔ اسی طرح بلا کسی نظام اور قاعدے کے لڑتے رہے۔ اسلام کا ظہور ہوا تو منجملہ اس کے احکام ایک حکم جنگ میں صفیں مرتب کرنے کا بھی ہوا۔ جو اس آیت میں مذکور ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ بیشک اللہ پاک ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں "بنیان مرصوص" کی طرح صف باندھ کر لڑتے ہیں۔ یعنی جس طرح دیوار میں ایک اینٹ دوسری اینٹ کی مدد ہو کر باہمی استقامت کا باعث ہوتی ہے اسی طرح وہ لوگ ایکدوسرے کے استقلال و پامردی کا وسیلہ ہو جاتے ہیں۔ جو قریب مل کر سیدھی صفیں استادہ ہوں اور حدیث میں آیا ہے "المومن للمومن کالبنیان المرصوص یشد بعضہ بعضاً"۔ اسی بنا پر نبی صلعم کے عہد میں مسلمانوں کی لڑائیاں صف بندی کے ساتھ ہوا کرتی تھیں اور اسی طریقہ کو "زحف" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ اس طرح سیدھی صف مرتب کرتے تھے جس طرح نماز کے لئے سیدھی صفیں بناتے ہیں۔ اور اسی انداز سے صفیں باندھے اور قدم ملائے ہوئے دشمن پر بڑھتے تھے۔

اسلامی نظام جنگ کے فوائد مسلمانوں کا بدوی قبائل کیساتھ ایک ایسے نظام سے جنگ کرنا بھی جس سے وہ لوگ محض ناآشنا تھے منجملہ ان امور کے تھا جنکی وجہ سے مسلمانوں نے کر و فر والے عربی قبیلوں کو نیچا دکھایا۔ اس بات کا بڑے بڑے نامور فاتحوں کے حالات پر نظر غائر ڈال کر اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً اسکندر، سلطان سلیم عثمانی اور نپولین بونا پارٹ وغیرہ کی سوانحعمریاں دیکھنے کے بعد صاف طور سے عیاں ہو جاتا ہے۔ کہ ان لوگوں نے دنیا کو محض اس اپنے نئے نظام کے ذریعہ سے فتح کیا۔ جسے انہوں نے اپنی فوجوں میں جاری کیا تھا اور ان جدید اسلحہ کے ذریعہ سے غلبہ حاصل کیا جو ان کے دشمنوں کو نصیب نہ تھے

اہل کر و فر اپنے جنگجو لوگوں کو بذریعہ اپنے اونٹوں اور ان بار برداری کے جانوروں کے جنپر وہ سامان رسد اور خیمہ و خرگاہ بار کیا کرتے تھے شکست کھانے اور پیٹھ دکھانے سے روکا کرتے تھے۔ ان چیزوں کو لڑنے والوں کے پیچھے صف بستہ کھڑا کر دیا کرتے تاکہ ان کے واسطے دم لینے اور آرام پانے کا موقع بن جائے۔ اس صف کو "مجبوزہ" کے نام سے موسوم کرتے تھے اور یہی ایک ایسی چیز تھی جو میدان جنگ میں ان کو ثابت

قدم رکھتی تھی۔ مگر مسلمانوں نے باوجودیکہ "زحف" (صف بندی) کیساتھ ان کو ثبات کا فائدہ حاصل ہوتا تھا پھر بھی اپنے پیچھے عورتوں بچوں اونٹوں اور سامان رسد وغیرہ کا رکھنا اختیار کیا تھا۔ اسلئے وہ جنگ میں بڑھتے رہتے۔ اور لڑنے مرنے پر بہت صابر رہتے تھے۔

زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں فوج اگر قلیل ہوتی تو ایک ہی دو یا دو صفوں میں مرتب ہوا کرتی تھی۔ خلفائے راشدین کے عہد میں مسلمانوں کی کثرت ہوگئی تو پھر ان کی کئی صفیں بننے لگیں۔ اس صف بندی میں سپاہیوں کے اسلحہ اور انکی خاص حالات پر لحاظ کرکے مقدم اور موخر صفیں بنائی جاتی تھیں۔ یہاں ہم نمونہ کے طور پر اس وصیت کا ذکر کرتے ہیں جو علیؓ نے مشہور جنگ صفین کے دن سنہ ۳۷ھ میں اپنی فوجی لوگوں کو فرمائی تھی۔ اس وصیت کے مختصر الفاظ سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں جنگ کے وقت فوجی نظام کی کیا حالت ہوتی تھی۔ علیؓ نے فرمایا تھا۔

اپنی صفیں سیدھی کرو۔ انھیں مضبوط دیوار کی مانند بناؤ زرہ پوشوں کو آگے رکھو اور بے زرہ لوگوں کو پیچھے۔ دانتوں کو بھیچ لو کیونکہ یہ صورت (ہم سے زیادہ تلواروں کی ضرب میں قوت پیدا کرنے والی ہے) نیزہ کی سنانیں باہم ملا لو اس سے سنانوں کی حفاظت خوب ہوتی ہے۔ آنکھیں نیچے کرلو اس سے دل خوب مضبوط رہتا ہے۔ اور قلوب کو تسکین ہوتی ہے آواز پست رکھو اس لئے کہ یہ صورت ہزیمت اٹھانے کو دور رکھنے والی ہے۔ اور وقار کے زیادہ لائق ہے۔ اپنے نشانوں کو قائم رکھو انھیں جھکنے نہ دو۔ اور جو لوگ تم میں بہت بہادر ہیں ان کے سوا نشانوں کو کسی اور کے حوالے نہ کرو۔ صدق اور صبر سے مدد لو اس لئے کہ صبر ہی کے اندازہ سے فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے۔

کرادیس

اس کے بعد بنی امیہ کے زمانہ میں عربی فوجوں کی اور بھی کثرت ہوئی اور وہ اہل عجم سے ملے جلے تو ان کا خیال تعبیہ کیجانب رجوع ہوا یعنی فوجی جماعتوں کو کرادیس کی شکل میں مرتب کرنے کا طریقہ اختیار کیا جسکے حالات ہم فوج کی تاریخ میں بیان کر چکے ہیں۔ کرادیس کی ترتیب یوں ہوتی تھی کہ اہل روم جنگ کے وقت اپنی فوجوں کے کئی حصے کر دیا کرتے تھے جنھیں یونانی زبان میں "کردیس" کہتے۔ اس لفظ کے معنے ٹکڑہ یا فوجی جماعت کے ایک حصے کے ہیں۔ ہر ایک کردوس کی کئی صفیں کرکے اسے خوب مربع کی شکل میں بنالیتے تھے۔ بادشاہ یا کمانڈر انچیف (اعلیٰ سپہ سالار) اور اس کے حاشیہ کے لوگ معہ نشانوں اور شعار وغیرہ کے ایک کتیبہ مقرر کرکے بیچ میں استادہ کرتے اور اسے قلب کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اس

کیتبہ کے مقابل سامنے کی طرف ایک اور کیتبہ ہوتا جو کہ قلب غالب صرف سواروں سے مرتب و قائم کیا جاتا اس کا نام مقدمہ ہوتا بادشاہی کیتبہ کے داہنے طرف ایک کیتبہ "میمنہ" نامی اور اسی طرح بائیں طرف ایک کیتبہ "میسرہ" نام کا متعین ہوتا اور ایک ٹکڑا فوج کا سب سے پیچھے رہتا اسکو فوج کا ساقہ کہتے تھے جسکی صورت حسب ذیل ہوتی :-

مقدمہ ۱

میمنہ ۲ قلب الجیش ۳ میسرہ ۴

ساقہ ۵

طریق جنگ فوجوں کو اس طرح جمانے میں اس کے پانچ ٹکڑے ہوتے ہیں اسی سبب سے فوج کو "خمیس" کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ غرضکہ اس صورت پر فوج مرتب ہو کے قدم ملائے صفیں درست کئے دشمن کی طرف چلا کرتے تھے۔ اور اکثر اوقات اپنے پیچھے کوئی اس قسم کا سامان کر لیا کرتے جو ان کی پیشقدمی میں ثبات و استقلال پیدا کر سکے۔ جس طرح کہ اہل فارس جنگ کے میدانوں میں بہت سے ہاتھیوں پر ہودج اور عماریاں بندھوا کر ان میں طرح طرح کے ہتھیار اور لڑنے والے لوگوں کو بھر دیتے اور نشانات بھی اسی جماعت کے ساتھ ہوتے اس گروہ کو وہ لوگ میدان جنگ میں اپنے پیچھے اس طرح رکھا کرتے تھے جیسے بہت سے قلعے ہوں اور ان کے ذریعے سے ان کے دلوں کو تقویت رہتی تھی۔ بعض اوقات اہل فارس شاہی تختوں کو اپنا جائے پناہ مقرر کر لیا کرتے انکی یہ صورت ہوتی کہ لڑنے والوں کے پس پشت میدان جنگ ہی میں بادشاہ کا تخت نصب کیا جاتا۔ شاہی خدم و حشم اور اس کے حاشیہ نشین لوگ اور بعض وہ فوجی افسر جو علاوہ بادشاہ کے فوج کا دل بڑھانے کا کام دیتے تھے۔ یہ سب لوگ شاہی تخت کو اپنے حلقہ میں لئے رہتے اس شکل سے گویا تخت کی ہیکل میں ایک عجیب قسم کی عظمت پیدا ہو جاتی اور وہ مقام لڑنے مرنے والوں کے لئے پناہ لینے اور دم لینے کا ایک عمدہ موقع بن جاتا۔ اکثر عادتیں عرب و باشندے بھی کرد و فریب کے ساتھ لڑا کرتے تھے۔ اور اپنی سپاہ کے پیچھے اسی طرح کی جائے پناہ بنا لیا کرتے جسکا قائم کا شمار کرنا دشوار ہے۔ رومیوں اور فارس والوں سے جنگ چھیڑ کر اہل عرب کو اکثر میدانوں میں اس بات پر مجبور ہونا پڑا کہ وہ بھی کردیوں کے طریقے پر جنگ کریں۔ اسکی ایک مثال یہ ہے کہ خالد بن ولید نے ۱۳ھ میں مشہور معرکہ یرموک کے وقت یہ طرز اختیار کیا اور انہوں نے اہل عرب کی فوجوں کو اس شکل سے میدان میں جمایا کہ وہ اس سے پہلے کبھی اس طرح مرتب نہ ہوئی تھیں خالد نے اپنی فوج کے ۴۰ ۳۶ ٹکڑے کر دیے

بنائے. قلب کو کئی حصوں میں بانٹ کر اس کا افسر ابا عبیدہؓ کو بنایا میمنہ کے کئی ٹکڑے کرکے اس پر عمرو بن عاص اور شرحبیلؓ بن حسنہ کو سردار کیا اور میسرہ کے کئی اجزا کرکے اس پر یزیدؓ بن ابی سفیان کو افسر بنا دیا الخ اور ۱۴ھ کی جنگ قادسیہ میں سعد بن ابی وقاصؓ نے بھی اسی ترتیب سے کام لیا تھا

مگر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عرب نے اس ترتیب کا برتاؤ رومیوں سے لڑنے کے لئے ان کے بالمقابل مجبوراً کیا تھا اور در اصل اپنی جنگوں کا اصول تعبیہ کے ساتھ فوجوں کا مرتب کرنا مروان بن محمد بن امیہ کے آخر خلیفہ کے وقت ۱۲۷ھ میں قرار دیا کیونکہ اسی خلیفہ نے صفوں کو توڑ کر کرادیس کو منتظم کیا اور یہ اصول اختیار کرنے کے بعد پہلے ضحاک خارجی اور بعدہٗ خیبری سے لڑا۔ صفوف کے اصول کو باطل کر دینے کے بعد رفتہ رفتہ "زحف" کا قاعدہ لوگوں کو بھول گیا۔ اور اس کے بعد لڑنے والوں کے پس پشت کسی زائد صف کا رکھنا بھی اسلامی حکومت میں عیش پسندی کا دخل ہونے کی وجہ سے مٹ گیا۔ شدہ شدہ اہل عرب میدان جنگ میں عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ لیجانا بھی ترک کرنے لگے یہاں تک کہ آخر کار بالکل چھوڑ بیٹھے

اسلامی صف بندی

علاوہ ازیں بعض ان دعویداران خلافت نے جو اہلبیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھے صف بندی کے اصول کو ترک کرکے کرادیس کا نظام اختیار کرنا اسلام میں بدعت پھیلانا سمجھا وہ صفوں کے ساتھ "زحف" کو اچھا سمجھ کر اسی پر قایم رہے۔ گو اس کا نتیجہ ان کے حق میں خطرناک ہی کیوں نہ ثابت ہوا۔ اس امر کا شاہد وہ قصہ ہے جو ابراہیم بن عبداللہ بن حسن بن علی بن ابی طالب کیجانب منسوب ہے۔ جسوقت خلیفہ منصور عباسی نے عیسیٰ بن موسیٰ کو ان کے مقابلہ پر روانہ کیا اور یہ دونوں جماعتیں کوفہ سے ۱۶ فرسخ کے فاصلہ پر مقام "باخمرا" میں مقابل ہوئیں تو امام ابراہیم کو ان کے کسی دوست نے صلاح دی کہ وہ اپنی فوج کو کرادیس میں مرتب کریں کیونکہ کرادیس بحالت جنگ زیادہ ثابت قدم رہتے ہیں اگر ایک کردوس کو شکست ہو جائے تو اسکی جگہ دوسرا کردوس جم سکتا ہے لیکن صفوں میں یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کا ایک حصہ بھی منہزم ہو تو سب کی سب پامال ہو جائیے۔ اس نیک صلاح کے جواب میں خود ابراہیم اور اس کے تمام رفقا نے کہا ہم اہل اسلام کی صف بندی کے علاوہ کسی اور صف بندی کو اختیار نہیں کرینگے" اس سے انکی مراد اس آیۃ کا حکم تھا، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ الآیۃ۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم تو جو کچھ ملی اور تباہ و برباد ہو گئے

جنگی اصولوں میں ترقی

مسلمانوں نے مدنیت میں رسوخ حاصل کرنے کے بعد قدر مار کے فنون جنگ کیا

تفنن بھی کیا اور انکی کتابوں کا ترجمہ کرنے اور انھیں پڑھنے کے بعد اس صیغہ میں بہت سے جدید طرز اور اصول رائج کئے۔ مسلمانوں کے یہاں فوجی تعبیہ کی قسمیں متعدد ہو گئیں۔ یہاں تک کہ سات شکلیں قایم ہوئیں اگرچہ وہ ان تمام صورتوں کو ایک ساتھ نہیں برتتے تھے۔ تاہم انہوں نے ان کو اپنے فنون جنگ میں داخل ضرور کیا۔ پہلا تعبیہ یہ تھا کہ فوج کی ترتیب ہلال کی شکل پر کیجاتی۔ کہتے ہیں کہ قدیم اہل فارس نے ہلالی ترتیب کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک سیدھا ہلال یا نوکدار ہلال یہ صورت بہت آسان اور سادہ ہے جیسے آسمان کا چاند ہوتا ہے ◡۔ دوسری ترتیب ہلال مرکب کی۔ اسکی یہ صورت تھی کہ ہلال کے دونوں طرف بھی دو ہلال نما صفیں بنائی جاتیں گویا کہ اس کے دو بازو ہیں: تیسرا تعبیہ مربع مستطیل ہوتا اور چوتھا الٹے ہلال کی وضع کا ◠۔ پانچواں تعبیہ یہ تھا کہ فوج کو معین یا ترچھے مربع کی شکل میں منظم کیا جاتا۔ چھٹا تعبیہ مثلث △ اور ساتواں تعبیہ دائرۂ "مزدوجہ" کی شکل پر یعنی دو دائرے اس طرح ہوتے کہ ایکدوسرے کے اندر بنایا جاتا۔ یہ آخری قسم کا تعبیہ اسوقت اختیار کیا جاتا جبکہ ان کی فوج قلیل اور غنیم کی سپاہ بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اور یہ تعبیہ اس تعبیہ سے ملتا جلتا ہے جو متمدن لوگوں نے تفنن کرتے کرتے سب سے آخری اور مکمل تعبیہ دریافت کیا ہے۔ اس سے ہم وہ تعبیہ مراد لیتے ہیں جو کہ بونا پارٹ نے قائم کیا تھا۔ اور جس کے ذریعہ سے اس نے تمام ملکوں کو پامال کر ڈالا اور جو آجتک کی تمام منتظم فوجوں کا بہترین نظم ہے۔

مسلمان لوگ فوج کو جنگ کے لئے مرتب کرتے تو اسے کرادیس یا مربعوں یا مثلثوں کی صورت میں ترتیب دیتے۔ اور یا فوج کا کچھ حصہ کرادیس کی شکل کا رکھتے اور کچھ حصہ کو مربع یا ہلالی یا معین یا مثلث کی صورت پر مرتب کرتے جیسا موقع ہوتا یا جیسی حالت پیش آتی۔

فوجی کمپ اوائل اسلام میں نظم و ترتیب لشکر کا کوئی خاص علم نہ تھا بلکہ اہل عرب اپنے خیموں کے نصب کرنے میں اور انکو ترتیب دینے میں اسی ڈھنگ پر چلتے تھے جسپر وہ زمانہ جاہلیت میں چلتے آئے تھے۔ امیر کا بڑا خیمہ وسط میں ہوتا تھا۔ اور اسکے گرد ماتحت افسروں اور خاص لوگوں کے خیمے نصب ہوتے تھے۔ اگر ان کے ساتھ عورتیں اور بچے ہوتے تھے تو انکو پڑاؤ کے پیچھے ٹھہراتے مگر جب انہوں نے بال بچوں کا ساتھ رکھنا ترک کیا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے تو انہوں نے کمپ قائم کرنے میں روم اور فارس والوں کی پیروی اختیار کی اور حسب اقتضائے حالات اس میں تفنن بھی کیا اور جس زمانے

میں فوجی فرقوں کی تعداد بڑھ گئی حاشیہ کے لوگوں اور غلاموں کی کثرت ہوئی تو فوجی کیمپ نے ایک خاصے بارونق آباد شہر کی صورت اختیار کرلی جسمیں فوجی سپاہیوں کے اقسام کے علاوہ منشی عالم طبیب کمال اور طبل بجانے والے (نقارہ نواز) اور اتباع وغیرہ بھی ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ شکل سے معلوم ہوسکتا ہے اور یہ نقشہ اسلامی عہد میں فوجی کیمپ کا سب سے بڑھیا ترقی یافتہ نظام کا ہے۔

فوجی قواعد اور شعار

فوجی قواعد اوائل اسلام میں جسوقت فوج جنگ پر آمادہ ہونے کو ہوتی تو اسکے سردار "النفیر النفیر" کی آواز دیتے تھے یہ صدا ان کے محاورہ میں حملہ کرنے کی علامت تھی جسطرح آجکل مصر کے فوجی افسر ایسے موقعہ پر پہلے ہجوم "حاضر آل" اور پھر صرف لفظ "ہجوم" کی صدا لگاتے ہیں۔ اور اگر سپاہ کو جنگ سے باز رکھنے کی ضرورت ہوتی تو اہل عرب "الرجعۃ الرجعۃ" کہتے تھے جس کی جگہ ان دنوں ملک مصر میں "جریہ" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ سواروں کو لڑنے پر تیار ہونیکا اشارہ کرنا مقصود ہوتو "الخیل الخیل" کی ندا دی جاتی تھی۔ اس غرض کے لیے مصری فوجوں میں پہلے "بین مانہ حاضر آل" اور اس کے بعد سے صرف لفظ "بین" کا استعمال ہوتا ہے جب یہ منظور ہوتا کہ سوار لوگ گھوڑوں سے اتر آئیں تو "الارض الارض" کہتے ہیں۔ اسکی مثال بصری فوج میں "این مایہ حاضر آل" اور اسکے بعد تنہا لفظ "این" کا استعمال کرتا ہے۔ جب اہل اسلام متمدن قوم کی حیثیت میں آئے اور انکی فوج کے مختلف حصے اور قسمیں بن گئیں اور فوجی حرکتوں کی جدا جدا شکلیں قائم ہوئیں تو انہوں نے ہر ایک حرکت کے لیے ایک خاص ندا مقرر کی جس کا لفظ اپنے معنے اور مراد پر دلالت کرتا تھا۔ ان صداؤں کے نام حسب مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) المیل (۲) الانقلاب (۳) الانفتال (۴) تسویۃ الانفتال (۵) استدارہ صغریٰ (۶) استدارہ کبریٰ (۷) تقاطر (۸) اقتران (۹) رجوع الی الاستقبال (۱۰) استدارہ مطلقہ (۱۱) انضمام (۱۲) اتباع المیمنہ (۱۳) اتباع المیسرہ (۱۴) جیش منحرف (۱۵) جیش مستقیم (۱۶) جیش مورب (۱۷) رحض (۱۸) تقدم (۱۹) حشو (۲۰) راوند (۲۱) ترتیب بعد ترتیب۔

جنگی کلمات جسوقت فوجی افسر کا ارادہ ہوتا کہ اپنی فوج کو کسی طرف مائل کرے یا اسے کوئی خاص صورت انہی صورتوں میں سے اختیار کرلے وہ انہیں کلمات میں سے ایک کلمہ پکار دیتا اور فوجی سپاہی

۔جو ان کلمات کے معنے اور مراد سے واقف ہو چکے ہوتے تھے، فوراً وہی حرکت اور شکل اختیار کر لیتے جس طرح آجکل کی فوجیں کرتی ہیں۔ اس کے کچھ مدت بعد ان سب کلموں کو صرف دو کلموں میں مختصر کر دیا جو حسب ذیل ہیں "ہوجُوا" اور "ہو برا" اور اپنی مراد کے پورا کرنے میں اشاروں سے مدد لیا کرتے تھے اسلئے فوجی سپاہیوں پر لازم ہوتا تھا کہ وہ اپنے افسر کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتے رہیں۔ جس وقت وہ کسی طرف پھرے خود بھی اسی کے ساتھ پھر جائیں ان دونوں لفظوں کی تشریح یوں کی گئی ہے۔ "ہوجوا" سے یہ مراد ہے کہ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو جاؤ اور "ہو برا" سے اسکے برعکس۔

فوجی شعار

ایام جاہلیت میں عرب نے چند خاص لفظ مقرر کر رکھے تھے۔ جنکے ذریعہ سے وہ حالت جنگ کے پیکار میں اپنے موافق اور طرفدار شخص کو شناخت کیا کرتے ان الفاظ کا نام "شعار" تھا۔ وہ الفاظ معین نہیں تھے۔ بلکہ حالت اور ضرورت کے مطابق ایک لفظ کو اپنی اصطلاح ٹھہرا لیا کرتے۔ جنگ اُحد کے دن کفار عرب کے قبائل کا شعار "یا للعزی یا للہبل" کا کلمہ تھا۔ حیرہ میں تنوخ کے قبیلہ وائل کا شعار "یا آل عباد اللہ" مقرر تھا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار میں سے ہر ایک کیلئے ایک علیحدہ شعار مقرر فرما دیا تھا۔ مہاجرین کا شعار تھا "یا بنی عبد الرحمٰن" قبیلہ اوس (انصار کا ایک قبیلہ) کا شعار تھا "یا بنی عبید اللہ" اور "خزرج" (انصار کا دوسرا خاندان) کا شعار "یا بنی عبد اللہ" تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خیل کو "خیل اللہ" کے اسم سے موسوم فرمایا تھا۔ اسکے بعد اہل اسلام اپنی فوجوں کے مختلف شعار مقرر کرتے رہے جنکے ذریعہ سے وہ اپنے لوگوں کو باہم پہچانتے تھے۔ اور یہ شعار اسی انداز پر مقرر کئے جاتے جس طرح اوپر بیان ہو چکے ہیں۔

ثغور اور عواصم (سرحدیں)

اس سے اسلامی مملکت کی بری اور بحری حدود مراد ہیں۔ بیانات مندرجہ بالا میں دکھایا گیا ہے کہ اہل عرب ملک شام کی فتح کے لیے بڑھے تو انہوں نے پہلے ملک شام کے اس خشکی کے حصہ کیطرف سے پیشقدمی کی جو صحرا سے متصل ایران کی سمت میں واقع ہے۔ چونکہ رومیوں کی بڑی بڑی قوتیں زیادہ تر ساحلی شہروں میں رہتی تھیں اسلئے اہل عرب نے اپنی فتوحات کو ترسے بحر کی جانب بڑھانا اور پھیلانا شروع کیا۔ اور ملک کے اصلی باشندوں پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد رومیوں کو بھی زیر کر لیا۔ دمشق کو فتح کر لینے کے بعد وہ لوگ سواحل کیجانب بڑھے جو اسلامی فوجیں ساحلی

مقامات کی طرف بڑھی تھیں۔ ان کے افسر یزید بن ابوسفیان اور ان کے بھائی معاویہ تھے۔ یہ فوج کشی اس زمانہ میں ہوئی جبکہ دمشق پر ابو عبیدہؓ حکمراں تھے۔ یزید بن ابی سفیان نے حملہ کر کے بیروت قیدا اور جبیل کو فتح کر لیا مگر چند روز کے بعد اہل روم نے پلٹ کر پھر ان مقامات کو مسلمانوں سے واپس لے لیا جس کی وجہ یہ تھی کہ روم والوں کی بحری قوت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ یہ مقامات زمانہ دراز تک برابر رومیوں ہی کے قابو میں رہے جبکہ حضرت عثمانؓ خلیفہ مقرر ہوئے اور امیر معاویہ ان کی طرف سے ملک شام کے عامل تھے تو انہوں نے طرابلس وغیرہ مقامات کو فتح کیا۔ معاویہ بحری جنگ کے بہت شائق تھے اور عثمان اس جنگ سے اسی طرح ڈرتے تھے جس طرح خلیفہ عمر بن الخطابؓ۔ معاویہ نے عثمان سے بہت کچھ، الحاح و اصرار کے بعد آخر کار بحری جنگ چھیڑنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اور اس وقت ملک شام کی سرحدیں (دریا کے ساحلی شہر) مسلمانوں کے قابو میں آئے عرب لوگ چاروں سمت سے آن آن کر ان شہروں میں آباد ہونے لگے اور بہت سے مسلمان وہاں مقیم ہو گئے۔

خلفائے راشدین کے عہد میں ثغور (سرحدیں) شام۔ انطاکیہ وغیرہ وہ ساحلی مقامات تھے جن کو خلیفہ رشید عباسی نے عواصم کے نام سے موسوم کیا۔ اہل اسلام عواصم سے پرلی طرف کے مقامات پر حملے کرتے رہتے تھے۔ اسکندرونہ اور طرطوس کے مابین چند قلعوں میں تھوڑے بہت اہل روم باقی رہ گئے تھے۔ بنو امیہ نے اپنی حکمرانی کے زمانہ میں ان مقامات کو بھی فتح کر لیا۔ سرحدی مقامات کی آبادی اور رونق عباسی خاندان کے دور میں بہت بڑھ گئی۔ اور وہاں بہت بڑی تعداد محافظ سپاہ کی معہ سامان جنگ کے اس غرض سے رکھی جانے لگی کہ رومیوں کی لوٹ مار کو روک سکے۔ کیونکہ وہ لوگ عرب والوں سے چھیڑ چھاڑ رکھنے پر آمادہ رہتے اور موقع پاکر نہایت سخت قتل و غارت کر جاتے تھے۔ اہل عرب نے ان مقامات پر بہت سے پائدار جدید قلعے بنائے اور ان قلعوں کی بھی مرمت کر لی جو رومیوں کے بنائے ہوئے تھے اور وہاں کے باشندوں کے وظائف میں بڑی بڑی رقمیں مقرر کر کے ان کو جہاد کا حکم دیا۔

سرحدی مقامات کا انتظام

اسلامی مملکت کی سرحدوں پر بھی جو خشکی میں واقع تھیں انہوں نے ایسا ہی کیا کئی ایک مضبوط شہر چنکر انہیں سرحدی شہر بنا دیا ان میں فوجیں رکھیں اور اسلحہ خانے بھی متعین کیے تاکہ وہ سپاہ غنیم کے حملوں کو روکنے کے کام آئیں اور وقتاً فوقتاً دشمنوں پر خود بھی جہاد کیا کریں۔

بنابریں اسلامی ممالک کی سرحدیں بعض اہل روم کے محاذی اور کچھ اہل فارس کے برابر میں واقع تھیں اور جو سرحدیں رومیوں کے مقابل واقع تھیں ان میں سے کوئی مقام سمندر کی طرف رومی ممالک سے متصل ہوتا تھا اور

کوئی خشکی کیجانب اور بعض مقامات ایسے بھی تھے جہاں خشکی اور تری دونوں سمتوں سے اہل روم کے حملہ کا خطرہ رہتا تھا۔ بحری حدود مطلق طور پر مصر اور شام کے سرحدی مقامات تھے۔ اس لئے اگر ہم شمال کی طرف سے شامی سرحدوں کو گنتا شروع کریں تو سب سے پہلے طرطوس اسکے بعد اذنہ پھر مصیصہ ۔عین زربہ ۔کنیسہ ۔ہارونیہ بیاس اور نقابلس وغیرہ مقامات واقع ہوتے ہیں۔ ان تمام مقامات کی آمدنی ..... ادینار ہوتی تھی۔ جو انہیں کی ضرورتوں اور کاموں مثلاً فوج کی تنخواہوں قلعوں اور شہر پناہوں کی مرمت اونٹوں اور گھوڑوں کے لشتے بنوانے اور جدید قلعوں کی تیاری وغیرہ امور میں یہ سب رقم خرچ کی جاتی تھی اس میں سے بچ کر بیت المال میں کچھ بھی داخل نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی فوج کی تنخواہیں بیت المال سے ادا کرنی پڑتی تھیں ۔مصری سرحدی مقامات میں بلاد رفح ۔عریش دمیاط اور اسکندریہ شمار ہوتے تھے۔

شمالی سمت کی شامی سرحدوں سے وہ سرحدی مقامات بھی متصل تھے۔ جنکو جزیرہ عراق کیجانب منسوب ہونے کیوجہ سے "جزازی" کہتے تھے۔ ان میں سب سے پہلا مقام "مرعش" تھا۔ اس کے بعد "الحدث اور الحدث" کے بعد شمشاط کی ثغور تک مسلسل بہت سے قلعے چلے گئے تھے۔ اور شمشاط کے بعد ملطیہ (مالٹا) واقع تھا ان سرحدی ممالک کی سالانہ آمدنی مالٹا کی آمدنی سمیت .... ۷ دینار ہوتی تھی۔ جس میں سے .... ۴ دینار سالانہ انہیں مقامات کی ضرورتوں میں صرف ہو جاتا اور .... ۳ دینار باقی بچتے جن میں .... ۱۷ دینار ملا کر پورے دو لاکھ دینار کی رقم ان اولیاء اللہ اور رگداگروں کے مصارف میں اٹھتی تھی۔ جو وہاں رہتے تھے۔ جہاد کے لئے جو فوجیں روانہ ہوتیں۔ ان کے اخراجات اس کے علاوہ تھے۔ مذکورہ بالا سرحدیں ہی جہادوں کے واقع ہونے کا ذریعہ تھیں۔ ان ثغور کے عواصم (صدر مقامات) "دلوک" "رعبان" اور منبج تھے اور جو سرحدیں شرقی سمت میں ممالک ہند سے ملتی تھیں ان کے بیان سے ہم بخوف طوالت قطع نظر کرتے ہیں۔

غزوات سرحدات متذکرہ بالا اسلامی ممالک کی حدود تھیں انہیں کو سنہ میں ہارون الرشید عباسی نے جزیرہ اور قنسرین سے توڑ کر ان کا نام عواصم رکھ دیا۔ اہل اسلام ہر سال ان مقامات سے خشکی اور تری میں جہاد کرنے کو نکلا کرتے اور اشاعت اسلام کے لئے سعی کیا کرتے تھے۔ جہاد مسلمانوں پر فرض تھا اور خلفا ان کو اس کا خیال دلاتے رہتے تھے جس کی مثال ابو بکر صدیق کا یہ قول ہے لا یدع احد منکم الجہاد فانہ لا یدعہ قوم الا ضربہم اللہ بالذل یعنی اے اہل اسلام تم لوگوں میں سے کوئی شخص جہاد کو ترک نہ کرے۔ کیونکہ کوئی قوم ایسی نہیں جو جہاد کو چھوڑ دیتی ہو اور اللہ پاک اسے ذلیل وخوار نہ کر دیتا ہو۔ یہ فقرہ

خلیفہ ممدوح نے اپنے خلیفہ مقرر ہونے کے دن فرمایا تھا۔ بحری غزوات کی یہ صورت تھی کہ مسلمانوں کے جہاز سواحل مصر و شام پر اکٹھے ہو کر جزیرۂ قبرس میں باہم مل جاتے ان جہازوں کی تعداد ۸۰ اور ۱۰۰ کے مابین ہوتی تھی۔ جسقدر جہاز قبرس میں مجتمع ہوتے ان کو اسطول (بیڑہ) کہتے تھے۔ اور اسطول کی کمان ثغور شام کے جہازی افسر کے حوالے ہوتی جس زمانے میں یہ بیڑہ مصر اور شام کے سواحل پر جنگ میں مصروف رہتا تھا اسوقت اس کے مصارف میں ایک لاکھ دینار خرچ ہوتے تھے۔

غزوات کی قسمیں

اہل عرب کے غزوات فصلوں اور موسموں کے اعتبار سے معین ہوتے تھے۔ کوئی غزوہ صیفی ہوتا (موسم سرما کا) تو کوئی شتوی (ایام سرما کا) اور کسی کو ربیعی (موسم بہار کا) کے نام سے موسوم کیا جاتا۔ ربیعی غزوہ ماہ "ایار" (مئی کی دسویں تاریخ کو واقع ہوتا تھا۔ یعنی مسلمان اپنے چار پاؤں کو موسم بہار میں خوب چارہ چگا چکتے۔ اور ان کے گھوڑوں کی حالت عمدہ ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ لوگ جہاد پر نکلتے تھے۔ پورے تیس دن یعنی دس یونیو (جون تک) وہ لوگ جہاد میں مصروف رہتے۔ گویا اس زمانے میں ان کو رومی ممالک کے اندر عمدہ چارہ مل سکتا تھا جن کیوجہ سے ان کے گھوڑے دوسری بار موسم بہار کا لطف اٹھالیتے تھے۔ اور خوب چرائی کر لیتے تھے۔ بعد ازیں اہل اسلام جنگ و جہاد بند کر دیتے اور ۲۰ دن یعنی دس تموز (جولائی) تک مقیم رہتے۔ پھر اس عرصہ میں ان کے گھوڑے تر و تازہ اور قوی ہو جاتے تو صیفی غزوہ کیلئے مجتمع ہو کر دسویں تموز (جولائی) کے بعد سے جہاد میں مصروف رہتے۔ اور اس کے بعد سے اپنے قفول (جہاد سے رکے رہنے) کے وقت تک پورے سال طولا اسی حالت پر قائم رہتے۔ بعض سالوں میں موسم گرما کے اندر دو بار غزوہ کرتے اور ان حملوں کا نام "صائفۃ الیمنیٰ" اور "صائفۃ الیسریٰ" رکھتے ہیں۔

جاڑوں کے موسم میں وہ لوگ بہت کم جہاد کرتے اور بیس راتوں (دن) سے زیادہ اس میں مصروف نہیں رہتے اور زیادہ دور بھی نہ جاتے تھے۔ یہ حملہ شباط (فروری) کے آخر میں ہوا کرتا اور غازی لوگ شروع آذار (مارچ تک) دشمنوں کے ملک میں پڑے رہ کر اپنے ملک میں واپس آجاتے اور اپنے گھوڑوں کو موسم بہار میں آرام دیتے۔

جہاد کا ذوق و شوق

اس بیان سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسلمان خلفاء نے صرف اپنی قلمرو کی حفاظت ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ وہ ممالک متصلہ پر حملہ آور ہوتے رہنا بھی اپنا فرض سمجھتے

تھے۔ اور یہ صورت خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے قسم سے تھی۔ جیسے کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس جہاد کے معاملہ میں بنو عباس کا شوق تمام خلفاء سے بڑھ کر دیکھا جاتا ہے۔ ان کو ظلیفان کے ساتھ حکومت کرنا نصیب ہوا اور اسلامی مملکت پوری طرح ان کے تابع فرمان ہو گئی تو انہوں نے مغازی (جہاد) کی جانب توجہ کی اپنی حکومت کے اوائل میں ہر سال اپنے یہاں سے ایک یا چند سپہ سالاروں کو اہل روم سے جہاد کرنے کیلئے اسی طرح بھیجتے رہتے جس طرح پر کہ حاجیوں کی جماعت حج کے لئے روانہ کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد بذات خاص رومیوں پر حملہ کرنے میں شریک ہونے لگے ۱۶۳ھ میں خود خلیفہ مہدی عباسی نے رومیوں کے ملک پر حملہ کیا اور ۱۶۵ھ میں اپنے بیٹے رشید کو ۹۵۷۹۰ سپاہیوں کے ساتھ روم والوں سے جہاد کرنے کے لئے روانہ کیا رشید اپنی جرار فوجوں کو لئے ہوئے رومی ممالک میں گھستا ہوا اور راستہ میں رومی لوگوں کے "مسالح" پر گزرتا ہوا خلیج قسطنطنیہ تک جا پہنچا۔ راہ میں جس قدر قلعے رومیوں کے ملے وہ سب پامال ہو کر مسلمانوں کے قابو میں آ گئے گمراں مقامات کے سرداروں نے ۱۹۳۴۵۰ دینار اور ۲۱۱۴۰۰۰ درہم نذر کر کے مسلمانوں کو صلح پر رضامند کر لیا۔ اور اپنی بستیوں کو بچا لیا۔ رشید بڑھتا ہوا جب قسطنطنیہ کے قریب پہنچ گیا تو وہاں کے باشندے سخت خائف ہوئے اس زمانہ میں امپرس "ارینی" قسطنطنیہ کے تخت پر جلوس فرما تھی۔ اس نے رشید سے ستر ہزار دینار سالانہ فدیہ ادا کرتے رہنے کی شرط پر صلح کر لی اور یہ بھی شرط قرار پائی کہ رشید کی واپسی میں رہبر دیئے جائیں گے اور راہ میں قیام کرنے کے مقامات پر بازار کھلوا دیئے جائیں گے تاکہ اسلامی فوج اور مسلمان خلیفہ کو کسی چیز کی تکلیف نہ ہو۔ صلح کی میعاد تین سال تھی۔ اس حملہ میں مسلمانوں کو علاوہ رقوم متذکرہ بالا کے ۵۶۴۳ نفر اسیران جنگ بیس ہزار راس چارپائے اور ایک لاکھ راس گائیں اور بکریاں بھی غنیمت میں ملیں اور صرف اسی ایک غزوہ میں ۵۴ ہزار رومی علاوہ قیدیوں کے ان کے ہاتھ سے قتل ہوئے اسی قدر بیان کر دینا اس امر کی توضیح کے لئے کافی ہے کہ مسلمانوں کو جہاد کی رغبت کیونکر زیادہ ہوتی تھی۔

جنگی جہازوں کے بیڑے

دریائی سفر اہل عرب اسلام سے قبل دریائی سفر کے عادی نہ تھے البتہ "تبابعہ" بادشاہوں کے عہد میں جو حمیر اور سبا کے گھرانے سے تھے کچھ کشتیاں ان کے یہاں تھیں وہ بھی محض اس وجہ سے کہ یہ لوگ خشکی اور تری دونوں میں کاروبار تجارت کیا کرتے تھے۔ حجازی عرب ہمیشہ سے دریائی سفر

کرنے میں خائف رہتے چلے آئے تھے اور انکو اس سفر میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں پڑتی تھی۔ چنانچہ بدوی لوگوں کی آجتک یہی حالت ہے۔ ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں کے نشانات حکومت مصر اور شام کے سواحل پر لہرانے لگے اور انہوں نے اہل روم کے جنگی جہازوں اور انکی دریائی جنگ کا مشاہدہ کیا تو ان کے دل بھی دریا میں جہاد کرنے کیلئے گدگدائے مسلمانوں میں سب سے اول جس شخص نے دریا کا سفر کیا وہ "علاء ابن الحضرمی" تھے جو عمر بن الخطاب کے عہد خلافت میں بحرین کے عامل تھے۔ انہوں نے سواحل فارس کو فتح کرنیکی خواہش کی لیکن چونکہ خلیج فارس کے بیچ میں حائل ہونیکی وجہ سے انکو سواحل مذکورہ تک پہنچنا بغیر دریائی سفر کے ناممکن تھا لہذا وہ جہازوں کے ذریعہ سے اس خلیج کو عبور کر گئے انہوں نے عمرؓ سے اس امر کی اجازت نہیں لی تھی اور انکو اپنے حملہ میں فتح بھی نصیب نہوئی اسلیے عمرؓ کو ان کا یہ خود مختارانہ حیثیت سے کام کرنا ناپسند ہوا اور خلیفہ ممدوح نے انکی یہ سزا تجویز فرمائی کہ وہ امیر کوفہ سعد بن ابی وقاص کے ماتحت رہیں۔ عمرؓ نے مسلمانوں کو دریائی سفر سے روکنے میں نہایت سختی سے کام لیا تھا معاویہ بن ابی سفیان دمشق اور اردن کی افواج کے کمان افسر جنرل بہت عالی حوصلہ اور بلند خیال شخص تھے انکو بحر روم کے اس پار والے ملکوں پر حملہ آور ہونیکے شوق نے عمرؓ سے دریائی سفر کی اجازت لینے پر آمادہ کیا۔ خلیفہ ممدوح نے انکی درخواست کی منظوری سے انکار کیا۔ اسپر معاویہؓ نے اصرار کیساتھ خلیفہ کیخدمت میں سود مند امیدوں کا طومار لکھ بھیجا۔ خلیفہ ممدوح نے عمرو بن العاص ملک مصر کے امیر سے یہ خواہش کی کہ وہ دریائی سفر کی صحیح حالت کا خاکہ تحریر کریں اور ایک خط بھیجکر ان سے اس سفر کی ٹھیک ٹھیک حالت کا اندازہ لینا چاہا جس کے جواب میں امیر مذکور نے حسب ذیل تحریر بھیجی :۔ "امیرالمومنین! میں نے دریا کی یہ حالت دیکھی ہے کہ وہ گویا ایک بہت بڑی مخلوق ہے جسپر چھوٹی مخلوق (انسان) سوار ہوتی ہے۔ وہاں آسمان اور پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر پانی گدلا ہوتا ہے تو دلونکو غمگین بنا دیتا ہے اور تلاطم میں آتا ہے تو ہوش اڑا دیتا ہے اسمیں یقین کی کمی اور شک کی زیادتی بڑھ جاتی ہے۔ انسان کی دریائی سفر میں ایسی حالت ہوتی ہے جیسے ایک لکڑی پر کیڑا بیٹھا ہو اگر وہ لکڑی الٹ پلٹ جائے تو کیڑا ڈوب جائیگا اور اگر وہ لکڑی سلامتی سے کنارے جا لگے تو کیڑا خوشی سے چمک کر اڑ جائیگا۔ عمرؓ کے پاس یہ تحریر پہنچی تو انہوں نے معاویہ کو لکھ بھیجا اس ذات پاک کی قسم ہے جسنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کیساتھ مبعوث کیا ہے میں ہرگز دریائی سفر میں ایک مسلمان کو بھی نہ بھیجونگا۔ مگر عثمان کی خلافت کا دور آیا تو انہوں نے معاویہ کا اصرار دیکھکر انکی درخواست منظور کر دی لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ دریائی سفر میں جہاد کرنا کیلئے جانا اختیاری فعل ہے جسکا دل چاہے جائے جسکا دل نہ چاہے نہ جائے۔ اس اجازت کے بعد ۲۸ھ میں معاویہ پہلی بار دریا کی راہ سے قبرس پر حملہ آور ہوئے

جزیرہ مذکور کے باشندوں نے ۲۰۰۰ دینار سالانہ ادا کرتے رہنے کے اقرار نامے پر امیر مذکور سے صلح کر لی یہ سب سے پہلا حملہ تھا جو مسلمانوں نے دریائی سفر کے ذریعہ سے کیا۔ اور چونکہ اسمیں انکو فتح نصیب ہوئی اسلئے ان کے شوق کی آگ زیادہ بھڑک اٹھی اور اسکے بعد سے وہ دریائی جنگوں میں بخوبی حصہ لینے لگے اسکے واسطے بھی انہوں نے گرمی اور سردی کے موسم میں خاص خاص اوقات اسیطرح مقرر کر لئے جیسے کہ خشکی میں حملہ کرنے کے معین کر رکھے تھے جنکا اوپر بیان آچکا ہے۔

اسلام میں جہازوں کے بیڑے

اہل عرب کو فن ملاحی میں کچھ دخل نہ تھا اسلئے پہلے انہوں نے ان رومی لوگوں کو جو ان کے قبضہ میں آچکے تھے اس کام پر لگایا جنہیں جہاز بنانیوالے کاریگر لوگ اور ناخدا بکثرت موجود تھے ان لوگوں نے مسلمانوں کیلئے جہاز وغیرہ تیار کئے انکو فوجی جوانوں اور اسلحہ جنگ سے آراستہ کیا اور انپر فوجیں اور جنگی سپاہیوں کو سوار کرا کے دریا کے اس پار والے مقامات پر حملہ کی تیاریاں کیں۔ جہازوں کے مجموعے کا نام اہل عرب نے اسطول مقرر کیا جو در اصل ایک یونانی نام کا لفظ (ى ى ى) ہے جسے اہل عرب نے معرب کر لیا تھا۔ اہل عرب نے اپنے اسطولوں کی خاص قیامگاہ بحر روم کو ٹھہرایا۔ دریائی سفر (ملاحت) میں شام افریقیہ اور اندلس کے مسلمان شریک ہوئے۔ اور ان سبھوں نے جہاز سازی کے کارخانے (ترسانہ) قائم کئے جو ان ممالک میں ہر ایک جگہ جہازوں کی ساخت اور ان کے ضروری سامان کی تیاری و بہم رسانی کا کام دیتے تھے۔ عہد اسلام میں پہلا دار الصناعہ عبدالملک بن مروان کے دور میں بمقام "تیونس" بنایا گیا خلیفہ مذکور نے اپنے عامل حسان بن نعمان کو جو افریقیہ پر حکمراں تھا اسکی ہدایت کی تھی جسنے خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں کارخانہ کھولا جہاز بنوائے اور انکو سامان رسد اسلحہ جنگ اور جنگی سپاہی بھر کر صقلیہ (سسلی) پر حملہ کرنے کیلئے روانہ کر دیا۔ مگر اس حملے والے لوگوں کو جزیرہ مذکور کا فتح کرنا نصیب نہوا بلکہ یہ خاندان بنو غالب کے حکمرانوں کے عہد میں مکمل ہوا اور زیادۃ اللہ بن ابراہیم بن اغلب کے زمانہ میں اس جزیرہ کی فتح کا اسد بن فرات کے سر سہرا بندھا۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی اسنے توصرہ کو بھی فتح کر لیا۔ اسکے بعد سے مسلمانوں کو دریائی جنگوں کا شوق بڑھتا گیا اور انہوں نے افریقیہ اور اندلس میں اسطولوں کی تیاری کا کام بڑھا دیا۔ چنانچہ عبدالرحمٰن ناصر کے عہد میں صرف اندلس کے اندر جنگی جہازوں کی تعداد ۲۰۰ تک پہنچ گئی تھی اور اسطرح افریقیہ میں جہازوں کی کثیر تعداد پائی جاتی تھی یہ واقعہ چوتھی صدی ہجری کے وسط کا ہے اندلس کے سب سے زیادہ مشہور بندرگاہوں میں بجایہ اور "مریہ" کا نام لیا جاتا ہے۔ اندلس میں متعدد دار الصناعہ بنگئے تھے اور ہر ایک کارخانہ ایک اسطول تیار رکھتا تھا جسپر ایک کماں افسر اور رئیس مقرر ہوا کرتا تھا۔ کماں افسر بیڑہ کے اسلحہ جنگ اور سپاہیوں سے معاملات کا انتظام کیا کرتا تھا اور رئیس اسکو بادبانوں یا چپوؤں سے چلانیکا اہتمام کرتا جب بہت سے جنگی جہازوں کے بیڑے کسی جگہ پر حملہ کرنے یا کسی اور غرض سے ایک ہی مقام پر مجتمع ہوجاتے تو وہ اپنی خاص بندرگاہ میں صف باندھکر کھڑے ہوتے اور ان سبھوں پر

سلطنت کے اعلیٰ طبقوں میں سے کسی امیر کو منتظم اور مہتمم بنا دیا جاتا تھا۔

مصر میں بحری بیڑے

ملک مصر میں ان ترسانوں کی بنیاد پہلی صدی ہجری کے اواخر ہی میں پڑ گئی تھی جسکا بیان آگے چلکر آئیگا اور سب سے پہلے جس شخص نے مصر میں اسطول قائم کیا وہ "عنبسہ بن اسحٰق" مصر کا امیر تھا جو متوکل علی اللہ عباسی کیطرف سے مصر کا حکمران مقرر ہوا تھا۔ ان جنگی بیڑے کے قائم ہونیکا باعث یہ امر تھا کہ اہل روم ۲۳۸ھ میں "دمیاط" پر قبضہ کرکے اسپر قابض ہو گئے اور دل کھول کر قتل و غارت کیا۔ امیر مصر کو اسبات کا سخت صدمہ ہوا۔ اس نے اسطول کے واسطے جہازوں کے تیار کرنیکا حکم دیا اور دریائی مجاہدوں کی بھی طرز پر ایک جماعت مرتب کی جسطرح بری فوج کی جماعتیں مرتب تھیں۔ اور انکے روزینے خود انکی پیدا کی ہوئی آمدنیوں میں سے مقرر کر دیئے لوگوں نے یہ صورت دیکھکر اپنی اپنی اولاد کو تیر اندازی اور اصول جنگ کے سکھانے میں بہت کوشش شروع کر دی اس کام کیلئے امیر مصر نے تجربہ کار اور ہوشیار افسر منتخب کرکے ان جہازوں پر فوجیں سوار کیں اور اسلحہ وغیرہ سامان رسد وجنگ انکیلئے کے ان جہازی بیڑوں کے زمرہ میں شامل کر دیا جو افریقیہ اندلس اور شام کیطرف سے رومیوں کے مقابلے پر جا رہے تھے مسلمانوں اور اہل روم کی دریائی لڑائی متذبذب حالت میں رہتی تھی کبھی رومی غلبہ پاتے اور کبھی مسلمان۔ چونکہ غالب فریق مغلوب کو گرفتار کر لیتا تھا اسلیے خلفائے اسلام کو ایک نئی ضرورت فدیہ دیکر اپنے ہم قوم اسیروں کی آزادی دلانیکے متعلق پیش آئی اور اس زرتاوان کا نام انہوں نے "فدا" رکھا۔


عربی جنگی جہازوں کا بیڑا

(شکل ۲۹) عربی جنگی جہازوں کا ایک بیڑہ روم والوں کیساتھ مصروف جنگ ہے اور اہل روم اسپر یونانی آگ برسا رہے ہیں۔

زر فدیہ: مسلمان اسیران جنگ کو زر فدیہ دیکر سب سے اول ہارون الرشید عباسی نے سنہ ۱۹۲ھ میں آزادی دلائی تھی۔ اس سے قبل فدیہ کی صورت یہ تھی کہ آدمی کو آدمی بدل لیا جاتا تھا۔ جتنے مشہور فدیے مسلمانوں نے ادا کئے انکی تعداد تیرہ ہے اور وہ سب بنی عباس کے عہد میں دیئے گئے تھے جنمیں سب سے آخری فدیہ ۳۵۵ھ میں مطیع اللہ عباسی کے عہد کے اندر ادا کیا گیا۔

اور جن لوگوں کو خلفاء نے اس تمام مدت کے اندر فدیہ دے کر آزادی دلائی ان کی تعداد پچاس ہزار کے قریب پہنچی تھی، زرِ فدیہ ادا کرنے یا اس کے متعلق گفت گو کرنے کا کام اکثر اوقات "لامش" کے مقام پر انجام پاتا تھا جو بحرِ روم کے سواحل میں طرطوس کے قریب ایک جگہ ہے "فدا" کے موقع پر مسلمانوں اور رومیوں دونوں کی بڑی بڑی جماعتیں موجود ہو کر اس کے تصفیہ اور تبادلہ وغیرہ میں دو تین ہفتے بلکہ اس سے زیادہ عرصے تک مصروف رہتے تھے۔ پہلی فدا کے موقع پر مسلمانوں کے قریب ۵۰۰۰۰۰ آدمیوں کا بہت بڑا مجمع تھا۔ اور وہ ہر طرح کے عمدہ سامان اسلحہ اور گھوڑوں اور زرق برق سامانوں سے آراستہ تھے، انھوں نے تمام کوہستان اور ہموار زمینوں کو بھر دیا تھا۔ اور اپنے زور و قوت کو پورے طمطراق سے دکھایا تھا، اسی کے مقابلہ میں رومی لوگوں کے جنگی جہاز دوسری طرف بہت ہی آراستہ ہو کر اپنا جاہ و جلال دکھلاتے ہوئے آئے تھے۔ اور مسلمان قیدی اُن کے پاس تھے، اس فدا میں جتنے آدمیوں کا فدیہ ادا کیا گیا۔ ان کی تعداد ۲۷۰۰۰ تھی۔ چنانچہ اسی کے بابت "مروان بن ابی حفصہ" شاعر خلیفہ ہارون الرشید کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

وفکت بک الاسری التی شیدت
لہا محابس ما ینہا حمیم یزورہا
علی حین اعی المسلمین افکاکہا
وقالو سجون المشرکین قبورہا

اے خلیفہ تیری وجہ سے وہ قیدی اسیری سے چھوٹے جن کے واسطے اس قسم کے مضبوط قید خانے بنے تھے جن میں کوئی رشتہ دار بھی نہیں نظر آتا جو ان کے ملنے کو آتا ہو۔ جس وقت مسلمانوں کو ان قید خانوں سے آزادی پانے کی طرف سے یاس ہو چکی تھی۔ اور قید نے اُن کو تھکا دیا اور وہ کہہ رہے تھے۔ کہ مشرکوں کے بندیخانے ان کی قبریں ہیں۔

فاطمیوں کی بحری طاقت

جب مصر کا ملک عبیدیین (فاطمی لوگوں) کے قبضۂ اقتدار میں آیا جو افریقیہ کے فرمانروا تھے، ان لوگوں نے اسکندریہ دمیاط اور مصر کے اندر جنگی بیڑوں کے بنانے میں بڑی سرگرمی سے کام لیا۔ اور ان کے زمانہ میں بحری فوجوں کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ گئی تھی جن کی تنخواہیں مقرر تھی۔ ان تنخواہ پانے والے فوجی ملازموں میں دس جانباز افسر تھے۔ جن کو دس سے بیس دینار تک ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اور ایسے سپاہی بھی تھے جو اس سے کم تنخواہ پاتے۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کی تنخواہ صرف دو درم ماہوار

تھی اور یہ سب سے کم درجہ کی تنخواہ تھی۔ بحری فوج کے ملازموں کو جاگیریں بھی دیجاتی تھیں اور ان جاگیروں کا نام "غازیوں کے ابواب" مقرر تھا، یہ جاگیریں تنخواہ کے علاوہ ہوتی تھیں۔ جنگ کے وقت جہازی افسروں کے حلقہ میں کسی ایک افسر کو بیڑہ کا کمانڈر بنا دیا جاتا تھا۔ اور جہاد پر جانے کی حالت میں وہی کمان افسران کو حکم و احکام دیتا رہتا۔ اس رئیس کے ساتھ سلطنت کے امراء میں سے کوئی بڑا امیر بھی ہوتا تھا۔ جنگی جہازوں کے بیڑوں پر جو مجاہدین رہتے تھے۔ ان کی تنخواہ خود خلیفہ بذاتِ خاص وزیر کے مواجہہ میں اپنے ہاتھ سے تقسیم کیا کرتا۔ اور اس کارروائی سے بحری مجاہدین کی عزت و تکریم مقصود ہوتی تھی۔ فاطمی خلفاء کے سب سے اوّل خلیفہ معز الدین کے دور میں جہازوں کی تعداد ۶۰۰ ہو گئی تھی۔ اور اس کے بعد گھٹتے گھٹتے صرف سو تک رہ گئی۔

جنگی بیڑوں کا جلوس جنگی بیڑے کو لڑنے کے روانہ کرتے وقت بہت دھوم دھام کا جلسہ اور خوب شان و شکوہ کا اظہار کیا کرتے۔ خود خلیفہ بھی جہازات کی روانگی اپنی نظر سے دیکھنے میں شریک ہوتا۔ اور وہ ایک جھروکہ میں جو بمقام "مقس" نیل کے ساحل پر اس کی نشست اور سیر کے واسطے مخصوص تھا (قاہرہ کے بیرونی جانب) جلوس فرما ہوتا۔ اور جہازی بیڑے کے افسران اس مکان کے نیچے جہازوں کو لاتے۔ جہاز اسلحہ اور سامانِ جنگ سے خوب سجے ہوئے اور جھنڈیاں اُڑاتے سامنے سے گذرتے۔ جہازوں پر منجنیقیں نصب کی ہوتی تھیں۔ اور وہ ان کے ذریعہ سے سنگ باری کرتے جاتے تھے، دوسرے جہاز پتھروں کی مار بچاتے اور جنگ کے کرتب دکھاتے باری باری سے سلامی اتارتے ہوئے نکلجاتے۔ غرضیکہ جہازات اُس وقت میں تمام وہ حرکتیں کرتے تھے جو ان کو حالتِ جنگ میں کرنی پڑتی تھیں، اور جسے آج کل مصنوعی جنگ کہتے ہیں۔ اس کے بعد رئیس اور مقدم خلیفہ کے روبرو حاضر ہوتے۔ اور خلیفہ ان کو رخصت کرتے ہوئے مقدم کو ۱۰۰ دینار اور رئیس کو ۲۰ دینار عطا فرماتا۔ اور اسی طرح کا جلسہ اس وقت بھی کیا جاتا جبکہ جنگی بیڑے لڑائی سے فارغ ہو کر واپس آتے تھے۔ سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں جنگی بیڑوں کا ایک خاص دفتر بھی قائم ہو گیا تھا جس کا نام "دیوان الاسطول" اور اس کام میں جس قدر اخراجات پڑتے تھے وہ اسی دفتر سے ادا کئے جاتے تھے۔

بحری بیڑوں کی اہمیت اسلامی مملکت کو وسعت دینے میں اسطولوں کو بہت بڑا اثر

حاصل تھا۔ اس لئے کہ مسلمانوں نے اس کے ذریعہ بحرِ روم کے مشہور جزیرے فتح کر لئے تھے جس میں سردینیا، سسلی، مالٹا، کریٹ اور قبرص وغیرہ سب شامل تھے، ان جزائر کے علاوہ اہلِ اسلام نے بحرِ روم کے اکثر ساحلی مقامات بھی جو یورپین ممالک سے متصل تھے فتح کر لئے تھے، اور اس دریا کے اندر ان کے جہازات آمد و رفت رکھتے ہوئے اسلامی فوجوں کو لے کر سسلی سے شمال کی سمت میں برِّاعظم یورپ کے اس حصے کو جو اٹلی کے مقبوضات میں داخل تھا، پامال کرتے تھے، اور اسلامی فوجیں ممالکِ فرنگ کے بادشاہوں پر حملہ کر کے ان کے ملکوں میں بڑھتی چلی جاتی تھیں۔
ایسے حملے یوں تو عموماً ہوتے رہے، لیکن شاہان بنوالحسن کے عہد میں جو سسلی کے حکمران اور فاطمی خلفا کی دعوت کے مؤید تھے بہت زور شور کے حملے مسلمانوں کی طرف سے ممالکِ فرنگ پر ہوئے۔ اور ان سے تمام یورپین ملکوں میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ فرنگی لوگ اپنے جنگی بیڑوں کو بحرِ روم کے شمالی مشرقی گوشہ کی جانب ہٹا لئے گئے۔ اور اہلِ اسلام اپنے بیڑوں اور جہازوں کے ذریعہ سے تمام سمندر کے مالک ہو گئے۔ اور بحری دنیا میں ویسے ہی بادشاہ بن گئے۔ جیسے کہ خشکی کے سلطان تھے اس وقت یورپین اقوام کی کمزوری حد تک پہنچ چکی تھی۔ اور یہ حالت ایک مدت تک قائم رہی تا آنکہ ناموسِ تاریخ کے مقتضا سے مصر میں عبیدی حکومت اور اندلس کی اموی سلطنت میں کمزوری اور ادبار کے آثار عیاں ہوئے، اور اہلِ یورپ غفلت کی گہری نیند سے چونک کر سنبھلے۔ اور اپنے قبضہ سے نکلے، سوتے ملکوں کو اہلِ اسلام سے واپس لینے پر آمادہ ہو کر انہیں پھر فتح کرنے لگے، یورپ کی قوموں نے خاص اسلامی ممالک پر حملے کئے۔ اور اس کے بعد سے صلیبی لڑائیوں کے جو واقعات گزرے وہ نہایت مشہور و معروف ہیں۔

مسلمانوں نے جنگی جہازوں کا معاملہ مہمل کر دیا تھا، اور بحری فوج کو گھٹا دیا۔ اس صیغہ کا خاص دفتر بھی ان کی حکومت سے نیست و نابود ہو گیا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا، کہ دریائی فوجوں کے سپاہی مجاہدین فی سبیل اللہ اور غزاۃ فی اعداء اللہ کے معزز لقب سے یاد کئے جاتے تھے اور لوگ ان کی دعاؤں سے برکت حاصل کرنے کے متمنی رہتے تھے۔ یا ایک وقت ایسا آیا کہ "اسطولی" کا لفظ ملکِ مصر میں ایک اہانت کا لفظ خیال کیا جانے لگا۔ اور جنگی جہازوں کی خدمت ان کے یہاں شرم و ذلت کا باعث سمجھی جانے لگی، مصر والوں کی یہ کیفیت اس زمانہ تک برابر قائم رہی جبکہ

ملک ظاہر بیبرس بندقداری کا ظہور ہوا ہے۔ جو ممالیک (غلاموں) کے خاندان کا مشہور بادشاہ تھا، اس فرمانروا نے جنگی بیڑوں کی حالت دوبارہ کچھ درست کی۔ مگر اب وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی تھی۔ جو عروج اسلام کے عہد میں تھی۔

مصر اور شام میں اسطولوں کی شان بہت گر گئی تھی۔ مگر اندلس اور افریقیہ میں اس کی قوت قائم تھی۔ یعنی مغربی حکومت دریائی طاقت کے لئے مخصوص تھی۔ اور ان کی یہ حالت ان کے عہد حکومت کے آخر زمانہ تک قائم رہی۔ مغربی مسلمان حکمرانوں کے اسطولوں کی تعداد یورپ اور افریقیہ کے دونوں خطوں میں صرف ایک سو اسطول رہ گئی تھی۔ یہ روایت ابن خلدون کی ہے۔ اسی اثنائیں ملک مغرب کے اسطولوں کا مشہور امیر البحر احمد صقلی پیدا ہوا۔ جو چھٹی صدی ہجری میں گزرا ہے۔ اس کے عہد میں مسلمانوں کے اسطولوں نے اس قدر ترقی کی کہ نہ کبھی اس سے قبل اتنی زیادتی ہوئی تھی اور نہ بعد میں ہی۔ اور اس کے بعد سلطنت کی کمزوری کے ساتھ ساتھ اسطولوں کی قوت بھی کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اندلس کے ملک میں اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوتے ہی مسلمانوں کی بحری طاقت کا وجود بھی گم ہو گیا۔

دار الصّناعہ اہلِ عرب کے نزدیک دار الصناعۃ سے وہ کارخانہ مراد ہے جس کو ہم آج کل "ترسانہ" یا "ترسخانہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ اسی دار الصناعۃ سے منقول ہیں۔ اس لئے کہ اہل یورپ نے ممالکِ عرب کو فتح کرنے کے بعد جن باتوں کو اُن سے حاصل کیا منجملہ اُس کے ایک جہاز سازی کا بھی فن تھا۔ جس طرح پر اہلِ عرب نے اس فن کو اپنے اسلاف سے سیکھا تھا۔ اسی طرح یوروپین اقوام نے اہلِ عرب کی شاگردی کی۔ اسپین والوں نے دار الصناعۃ کا نام رکھا تھا، اسی طرح یوروپین اقوام نے اس لفظ کو ہسپانی زبان سے لیا۔ جس کی وجہ سے تلفظ کا فرق ہوتے ہوتے یہ لفظ بن گیا۔ اور عرب لوگوں نے اس لفظ کو اسپین والوں کی زبان سے لیا۔ جس میں اُسکا تلفظ ترکی طرز پر . . . . . . تھا۔ اس لئے انھوں نے اسے ترکی لفظ سمجھکر اس کا معرب ترسخانہ یا ترسانہ بنا لیا۔ مگر بہتر یہ تھا، کہ اس کا نام دار الصناعہ رکھا جاتا۔ اسی طرح کی وجوہ یوروپین زبان کے لفظ . . . . . (امیرال) کے عربی لفظ امیر البحر سے بدلجانے کے بارہ میں بیان

کی جاتی ہیں۔

مصر کے کارخانے

منجملہ اسلامی ممالک کے اندلس۔ افریقیہ۔ شام، اور مصر میں بکثرت دار الصناعہ واقع تھے۔ اسی لئے سب سے پہلے جو کارخانہ مصر میں بنایا گیا وہ فسطاط کے مقابل جزیرہ روضہ میں پہلی صدی ہجری کے اندر تعمیر ہوا تھا، اس کے بعد احمد بن طولون نے اسے بڑھانے اور اعلےٰ درجہ کا بنانے پر توجہ کی اور بعد ازاں وہ کارخانہ اخشید کے عہد میں جو چوتھی صدی ہجری کے شروع میں گذرا ہے خاص فسطاط میں منتقل کر دیا گیا تاکہ اس کارخانہ اور فسطاط کے مابین دریا نہ حائل رہے۔ اس کے بعد آنے والے زمانہ میں فاطمی خلفا نے ایک دار الصناعۃ بمقام "مقس" اپنے آباد کئے ہوئے شہر قاہرہ کے قریب بنوایا۔ ان کارخانوں میں طرح طرح کے جہاز بنوائے جاتے تھے۔ جن میں جنگی مصرف کے بھی ہوتے اور معمولی کاروبار کے اغراض میں کام دینے والے بھی اور بعض باربرداری کے لئے بھی استعمال ہوتے، مگر جس قدر جہاز یہ کارخانہ تیار کرتا ان کی بالعموم دو قسمیں ہوتی تھیں ایک جنگی دوم نیلی۔ نیلی جہاز وہ کہلاتے تھے جو صرف دریائے نیل میں اس کے سب سے اعلیٰ چڑھاؤ سے دہانہ تک آمد و رفت رکھتے۔ اور غلہ وغیرہ سامان تجارت لاتے۔ اور لیجاتے۔ اور جنگی جہاز وہ ہوتے جو جنگ میں استعمال ہوا کرتے۔ اور لڑنے والوں کو جہاد میں لیجاتے انھیں جہازوں کے مجموعہ کا نام اسطول ہوتا تھا۔

کشتیوں کی صورتیں اور ان کے اسباب

جنگی جہاز کئی قسم کے ہوتے تھے۔ جو شکل میں متفاوت قد و قامت اور زور و قوت میں کم و بیش ہوتے تھے۔ ایک قسم کے جہاز کو شونہ کہتے تھے۔ یہ بڑے بڑے جہاز ہوا کرتے تھے، جن میں دشمنوں کے حملہ سے اپنی مدافعت کرنے کے لئے قلعے اور برج بنائے جاتے تھے، دوسری قسم کا نام "حراقہ" تھا۔ اس میں منجنیقیں رہتی تھیں جن کے ذریعہ سے دشمنوں پر جلتا ہوا نفط پھینکا جاتا تھا۔ اور منجنیق کو "عرادہ" کہا کرتے تھے، تیسری قسم "طرادہ" یہ ایک چھوٹی سی تیز رو کشتی ہوتی تھی۔ چوتھی قسم کے جہاز جن کے ذریعہ سے نیل میں گشت لگایا کرتے تھے "عشاریات" کہلاتے تھے۔ نیز چند اور خاص قسموں کی کشتیاں بھی اور کاموں کے لئے پائی جاتی تھیں۔

مثلاً شلندات اور مسطحات وغیرہ اہل عرب اپنے یہاں کے جہازوں کو یونانی اور رومانی اقوام کے جہازوں کی مانند بنایا کرتے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اس فن میں مذکورہ بالا قوموں کی شاگردی کی تھی

جنگی جہازوں کا سامان اہل عرب کے ہاں جنگی جہازوں کے ضروری سامان میں حسب ذیل اشیاء داخل تھیں۔ زرہ۔ خود۔ درق۔ ڈھالیں نیزے۔ کمانیں کلالیب اور باسقیلات جو لوہے کی زنجیریں ہوتی تھیں۔ اور ان کے سروں پر آنکڑے لگے رہتے تھے اور عرادات (منجنیقیں) اور عرب والوں نے ایک اور طریقہ بھی نکالا تھا۔ وہ یہ تھا کہ مستولوں کے بالائی حصہ پر اوپر کی طرف سے کھلے ہوئے منہ کے بہت سے صندوق لگا دیتے تھے۔ اور دشمن کے آنے سے قبل ان صندوقوں میں کچھ لوگ جا بیٹھتے۔ جب تک غنیم قریب آجاتا۔ اور جنگ چھڑ جاتی تو ان تھیلوں میں سے جو صندوقوں کے برابر لٹکتے رہتے تھے۔ پتھروں کی بھرمار کرتے تھے۔ اور خود بخوبی تمام صندوقوں کے اندر محفوظ بیٹھے رہتے۔ اور کبھی کچھ لوگوں کے پاس تھیلوں اور پتھروں کی جگہ پر جلتے ہوئے نفط کے قدرے ہوا کرتے جن کے ذریعہ وہ دشمنوں پر آتشباری کرتے تھے۔ یا بن بجھے چونے کا سفوف ہوتا تھا، جو خام چونہ اور ہرتال کو باہم ملاکر اور باریک پیس کر رکھ لیا جاتا تھا۔ اس کو دشمنوں پر پھینکتے تھے۔ اس کے غبار سے غنیم اندھے ہو جایا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات جب غبار کثرت سے جسم پر پڑ جاتا تو بدن میں سوزش پیدا کر دیتا۔ یا دشمنوں پر سانپوں اور بچھوؤں سے بھرے ہوئے ظروف پھینکا کرتے تھے۔ یا کھولے صابون ڈالتے تھے۔ تاکہ دشمنوں کے قدم پھسل جائیں۔ اور وہ جم کر لڑ نہ سکیں۔ اہل اسلام جہازوں کے چاروں طرف کھالیں اور نمدے، سرکہ، پانی پھٹکری وغیرہ میں تر کر کے لٹکا دیا کرتے تھے۔ تاکہ وہ نفط کی بلا سے محفوظ رہیں اور ان پر آگ اپنا اثر نہ کرنے پائے۔ اور بعض اوقات احتیاطاً بورق اور نطروں میں ملی ہوئی یا سرکہ میں گندھی ہوئی خطمی استعمال کرتے تھے، کیونکہ یہ چیزیں بھی نفط کے اثر کو باطل کر دیتی ہیں۔

اثنائے جنگ میں اہل عرب جس قسم کی احتیاطیں کرتے تھے۔ منجملہ ان کے ایک یہ امر بھی تھا۔ کہ رات کی تاریکی غالب ہونے پر اپنے جہازوں میں آگ نہ جلاتے تھے۔ اور نہ اس میں کسی مرغ کو رکھتے تھے، اور جب احتیاط میں زیادہ مبالغہ منظور ہوتا تو جہاز پر پالین بھی نیلے رنگ کی چڑھا دیتے تاکہ وہ دور سے نمایاں نہ ہونے پائے۔

مسلمان اپنے جہازوں کے نکڑ پر ایک آلہ تبر کی شکل کا لگاتے اور اُس کو لجام کہا کرتے تھے یہ ایک لوہے کا لمبا اور نہایت تیز نوکدار ٹکڑا ہوتا تھا۔ اسکا پچھلا حصہ نیزہ کی انی سکی طرح پولا (کھوکھلا) بنایا جاتا تھا۔ اور اُسے پچھلے حصہ کی طرف سے ایک لکڑی میں لگایا جاتا تھا، جو جہاز کے اگلے سرے پر برچھی کی طرح نکلی رہتی تھی۔ اور اُسے اسطام کے نام سے نامزد کرتے تھے، اس طرح لگام کی صورت جہاز کے اگلے سرے پر ایک نکلے ہوئے نیزے کی طرح ہو جایا کرتی تھی۔ اور اس سے دوسرے جہازوں کو صدمہ پہنچانے میں کام لیتے تھے۔ جس وقت یہ آلہ کسی جہاز کے پہلو میں زور سے لگتا تھا اُسے پھاڑ دیتا تھا، اور اس میں پانی بھر جانے سے ڈوبنے کا خطرہ پیش نظر ہو جاتا تھا، جس سے اس جہاز کے لوگ امان کے طالب ہوتے۔ اور اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ کلالیب یعنی آنکڑے دار زنجیروں) کا فائدہ یہ تھا۔ کہ جس وقت دشمن کے جہازوں میں سے کسی جہاز کے قریب جا پہنچتے تو ان زنجیروں کو اُس پر ڈالکر اُسے پھنسا لیتے اور روک کر ان زنجیروں کو تان دیتے، پھر جلد جلد ان پر تختے بچھا کر پل باندھ لیتے اور غنیم کے جہاز میں گھس جاتے تھے مگر جب دشمن زور آور ہوتا تو وہ ان کے آنکڑوں کو فولادی بھاری تبروں کے ذریعہ سے کاٹ کر بے کار کر دیتا تھا۔

بیت المال

بیت المال سے بحث کرتے وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ حکومت کے مالی صیغہ سے متعلق خراج۔ صدقہ۔ عشر۔ خمس اور جزیہ وغیرہ شاہی آمدنی پر بھی نظر ڈالی جائے اور ان سب کے حالات بیان کئے جائیں۔ بیت المال کی تعریف یہ ہے کہ جس چیز کے مسلمان لوگ مستحق ہوں اور اس کا کوئی خاص مالک متعین نہ ہو سکے وہ بیت المال کا حق ہے اور ہر ایک ایسا خرچ جو مسلمانوں کی ضروریات اور اسباب بہبود سے متعلق واجب ہو اُس کا برداشت کرنا بیت المال کے ذمے ہے۔ جن مالوں کے مسلمان لوگ حق دار قرار پا سکتے ہیں وہ تین قسم کے ہیں۔ صدقہ، غنیمت اور فئی۔ ان اموال میں سے ہر ایک کے واسطے خاص احکام بھی ہیں جن کا بیان آگے چلکر آئے گا اور جو مصارف بیت المال کے ذمہ ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔ فوج کی تنخواہیں اور روزینے دینا ہتھیاروں یا دیگر سامان حرب کی قیمتیں ادا کرنا۔ اس کے علاوہ رفاہ عام پر صرف کرنا۔

صدقہ صدقہ کیا ہے؟ زکوٰۃ ہے اس میں اور زکوٰۃ میں نام کا فرق ہے اور رسمی ایک ہی ہے۔ وہ مالدار مسلمانوں سے لے کر ان کے محتاج لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور اس کی حقیقت ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ صدقہ کا ایک صدر دفتر مرکز خلافت میں رہتا۔ اور ماتحت ولایتوں یا شہروں میں اس کی شاخیں ہوتی تھیں، ہر ایک مقام پر صدقہ کا ولی (حاکم محصل) مستقل طور پر وہاں کے مالداروں سے صدقہ کو وصول کر کے وہیں کے غربا پر تقسیم کرنے کا مجاز ہوتا تھا۔ زکوٰۃ کے مصادر چار تھے۔ چوپاؤں کی زکوٰۃ، سونے چاندی کی زکوٰۃ، پھلوں میووں کی زکوٰۃ، اور کھیتی کی زکوٰۃ۔

جانوروں کی زکوٰۃ کے احکام چوپایوں کی زکوٰۃ اونٹ گائے اور بھیڑ بکریوں پر ہوتی تھی۔ اس کے چند احکام بھی ہیں۔ جن کو خود نبی[1] صلے اللہ علیہ وسلم نے وضع فرمایا تھا۔ اس بات پر ایک خط سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ جو ابوبکرؓ نے انس بن مالک کے نام اس وقت لکھا تھا جبکہ ان کو بحرین کا عامل بنا کر بھیجا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ صدقہ فریضہ ہے جس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر لازمی مقرر فرمایا اور جس کا خداوند پاک نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے۔ اس لئے جس مسلمان سے اس صدقہ کا واجبی حق مانگا جائے اُسے فوراً ادا کرنا چاہیئے۔ اور اگر کسی سے زیادہ طلب کیا جائے تو وہ نہ ادا کرے چوبیس اونٹوں یا اس سے کم کی زکوٰۃ بکریوں کے ساتھ ادا کی جائے گی۔ اس طرح پر کہ ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری زکوٰۃ کے طور پر دیجائے، جب اونٹوں کی تعداد پچیس ۲۵ تک پہنچ جائے تو پینتیس اونٹوں تک زکوٰۃ میں ایک مادہ "بنت مخاض" (ایک سالہ کامل اونٹ کا بچہ) دیجائے گی۔ ۳۵ سے ۴۵ اونٹوں تک ایک مادہ "بنت لبون" (دو سالہ کامل اونٹ) ۴۶ سے ۶۰ اونٹوں تک ایک "حقہ" (پورے تین سال کی اونٹنی جو بلوغ کو پہنچ چکی ہو) ۶۱ سے

---

[1] فاضل مؤلف کا یہ بیان ان کے پندار کے مطابق خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن ہمارے زعم و اعتقاد میں باطل ہے۔ کیونکہ ہمارا صحیح عقیدہ یہ ہے کہ حضور انور روحی فداہ کا قول کلام اللہ کی تفسیر ہوتا ہے اور احکام میں جمہور علمائے اسلام اسی کے قائل ہیں۔ لہٰذا اصل قوانین زکوٰۃ حضرت خداوندی کے وضع کردہ ہیں اور ان کا اعلان پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی ہوا ہے۔ قرآن مجمل ہے اور حدیث اس کی تفسیر۔ (مترجم عفی عنہ)

۷۵ تک ایک مادہ "جذعہ" (پانچ برس کی پوری اونٹنی) ۷۶ سے ۹۰ اونٹوں تک دو بنت لبون۔ ۹۱ سے ۱۲۰ تک دو حقے۔ جس کے پاس صرف چار اونٹ ہوں اُس پر کچھ زکوٰۃ نہیں ہے۔ تاوقتیکہ خداوندِ پاک اُسے اس قابل بنا دے کہ وہ زکوٰۃ ادا کر سکے مگر جس وقت پانچ اونٹ ہو جائیں تو ان پر ایک بکری دیجائے۔ چرائی پر چھوٹی رہنے والی بکریوں پر جبکہ وہ چالیس یا اس سے اوپر ہوں ایک سو بیس تک ایک بکری زکوٰۃ دینی چاہیئے۔ ایک سو بیس بکریوں سے زائد دو سو تک دو بکریاں اور دو سو کے اوپر تین سو تک تین بکریاں زکوٰۃ میں نکالی جائینگی لیکن اگر بکریوں کا ریوڑ جو محض چرائی پر بسر کرتا ہے۔ چالیس سے ایک بھی کم ہو تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ لیکن اس وقت جبکہ خدا کو منظور ہو اور وہ شخص قابل ادائے زکوٰۃ یعنی صاحب نصاب ہو جائے۔

سونے چاندی کی زکوٰۃ مسکوک چاندی (روپیہ درم وغیرہ) $\frac{1}{40}$ حصہ زکوٰۃ دینی واجب ہے لیکن اگر ۱۹۹ درم سے زائد نہ ہوں تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ البتہ اگر خداوند کریم اُسے مالک نصابِ کامل یعنے ۲۰۰ درم کا مالک بنا دے اور فقیہہ لوگوں نے اس بارے میں بہت سی تفصیل بیان کی ہے۔ جس کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔ گھوڑوں، گدھوں اور خچروں پر زکوٰۃ نہیں ہوتی۔ اور چاندی کی زکوٰۃ ۲۰۰ درم سے کم پر واجب نہیں ہوتی۔ دو سو درم پر سالانہ ۵ درم زکوٰۃ ہے۔ یعنی $2\frac{1}{2}$ فیصدی یا $\frac{1}{40}$ حصہ اس حساب سے سونے کی زکوٰۃ بھی لی جاتی ہے۔ یعنی ہر ۲۰ مثقال سونے پر نصف مثقال سونے کے۔ سونے کے بیس مثقال سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور جب بیس مثقال سے زائد ہو تو اسی سبب سے زکوٰۃ کی مقدار بڑھتی جائے گی۔ تجارتی مال یا اس کے مثل چیزیں سونے چاندی کی قسم سے سمجھی جاتی ہیں۔

پھلوں کی زکوٰۃ پھلوں کی زکوٰۃ ان کی آب رسانی کی مختلف اقسام کے لحاظ سے جدا جدا ہوتی تھی۔ اگر اس قسم کے پھل ہوتے کہ انھیں پانی دینے میں صاحب مال کو زیادہ وقت یا صرف برداشت کرنا نہ پڑتا یعنی بارانی یا نہری پانی سے ان کو سیراب کرتے تھے تو ان کی زکوٰۃ پیداوار کا دسواں حصہ نکلتی تھی۔ اور اگر اس قسم کے پھل ہوتے جن کی آبپاشی

میں محنت اور صرف کثیر اٹھانا پڑتا ہو تو اس کی زکوٰۃ بیسواں حصہ نکالی جاتی اور ہر حالت میں پھلوں پر اس وقت تک زکوٰۃ واجب ہوتی تھی۔ جب تک کہ وہ پانچ وسق یا اس سے زائد نہ ہوں۔ ایک وسق ساٹھ صاع کا اور ایک صاع عراق کی تول سے ⅓ رطل (۵ پونڈ) کا ہوتا تھا۔ انگور کی بیل اور کھجور یا اسی قسم کے دیگر پھلدار درخت میوہ جات کی قسم میں داخل تھے۔

زکوٰۃ کے مصارف کاشت کی اجناس پر بھی جن سے تمام قسموں کے غلے مراد ہیں مثلاً گیہوں، چاول، لوبیا اور چنا وغیرہ، اس وقت تک زکوٰۃ نہیں لیجاتی تھی جب تک کہ یہ پانچ وسق تک نہ پہنچ جائیں۔ اور ان کا حکم بھی مثل پھلوں کی زکوٰۃ کے ہے جہاں جہاں زکوٰۃ کے مال کا صرف کرنا مناسب ہے اس کا قرآن پاک میں صریح ذکر آچکا ہے۔ اور وہ یہ ہے "انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله وابن السبیل۔"[1]

اسی بنیاد پر زکوٰۃ کی آمدنی آٹھ برابر حصوں پر تقسیم کر دیتے تھے۔ ایک حصہ فقیروں کو دیتے تھے، فقیر وہ لوگ جن کے پاس کچھ بھی نہ ہو، دوسرا حصہ مسکینوں کو دیا جاتا یہ ایسے لوگ ہوتے جن کے پاس تھوڑا بہت مال ہوتا تو سہی لیکن ان کے بسر اوقات کے لئے کافی نہیں۔ یہ لوگ فقیروں کی نسبت ذرا خوشحال ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا حصہ اس کی حالت کے لحاظ سے اتنا مقرر کرتے جو اس کی گذران کو کافی ہوتا یا جیسا ولی الصدقہ (صیغہ زکوٰۃ کا افسر) کو مناسب معلوم ہوتا تو اسی کے موافق وہ تقسیم کر دیتا۔ مگر شرط یہ تھی کہ ان میں سے کسی ایک شخص کو اتنا مال نہ دیا جائے جو ۲۰۰ درم سے زائد ہو۔ کیونکہ جب اسے اس قدر مال مل جائے گا۔ تو اس پر خود بھی زکوٰۃ دینی واجب ہو جائے گی۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں جو روایت لکھی ہے اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ عمر بن الخطاب نے اس بارہ میں یہ حکم صادر فرمایا تھا۔ کہ المساکین کا لفظ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے فقراء کو بھی شامل ہے۔ لیکن فقراء کا لفظ صرف مسلمان حاجتمندوں پر لیا جاتا ہے۔ تیسرا حصہ ان لوگوں کو ملتا تھا جو زکوٰۃ کے وصول کرنے اور بانٹنے پر عامل مقرر ہوتے

---

[1] خیرات کا مال تو بس فقیروں کا حق ہے اور محتاجوں کا اور ان کارکنوں کا جو مال خیرات کے وصول کرنے پر متعین ہیں اور ان لوگوں کا جن کے دلوں کا پرچانا منظور ہے۔ اور نیز یہ مال قید غلامی سے غلاموں کی گردنیں چھڑانے میں قرضداروں کے قرضہ میں، مجاہدین کے ساز و سامان میں اور مسافروں کے زاد راہ میں صرف ہونا چاہیئے۔

جن میں امین اور مباشر (وصول کرنیوالے) افسر اور ماتحت ہر قسم کے عملے ہوتے اور وہ اپنی اپنی اجرتیں لیتے تھے۔ جب اُن کے حصہ کا مال فاضل بچ رہتا یا ان کے حقوق سے بڑھ جاتا۔ تو وہ فاضل رقم باقیماندہ حق داروں پر حصہ رسدی تقسیم کر دیجاتی تھی۔ چوتھا حصہ مؤلفۃ القلوب خرچ کیا جاتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہوتے تھے جن کو نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) اور ان کے خلفاء یا تو مسلمانوں کو ان کے شر سے بچانے کے لئے اور یا انھیں اُن کی قوم اور قبیلہ کو اسلام کی طرف رغبت دلانے کی غرض سے مالی امداد دے کر ان کو اپنی جانب مائل کرتے تھے۔ جس کا بیان اوپر آچکا ہے۔ مگر جبکہ مؤلفۃ القلوبؔ لوگوں میں سے کوئی شخص مسلمان نہ ہوتا تھا تو اُسے مالِ زکوٰۃ میں سے کوئی رقم نہیں دیجاتی تھی۔ بلکہ مالِ غنیمت یا فی میں سے اس کو مل جاتا۔ پانچواں حصہ غلاموں کو خرید کر آزاد کر دینے میں خرچ کر دیا جاتا تھا۔ چھٹا حصہ قرض داروں کو دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ ادائے قرض سے سبکدوش ہوں۔ ساتواں حصہ راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کے لئے سامانِ جنگ بہم پہنچانے پر خرچ ہوتا۔ اور آٹھواں حصہ ان مسافروں کو ملتا جن کے پاس سفر خرچ نہیں ہوتا تھا۔

صدقات کا عامل دیگر صیغہ مال کے عاملوں سے یوں ممتاز ہوا کرتا تھا کہ اُسے اپنی تحصیل کردہ آمدنی میں سے بلا اجازت غیرے خرچ کرنے کا حق حاصل ہوتا تھا۔ بجز اس صورت کے جبکہ اسے اس کی کسی وجہ سے ممانعت کر دی گئی ہو۔ بخلاف اموال فیٔ و غنیمت کے جن کے عاملوں کو بجز خلیفہ یا اس کے قائم مقام والی یا وزیر کا حکم حاصل کرنے کے کسی طرح ان مالوں کو خرچ کرنے کا اختیار نہیں ہوتا تھا۔

غنیمت:- غنیمت اس آمدنی کا نام ہے جس کو مسلمان جنگ کر کے حاصل کریں۔ اور اس کی چار قسمیں ہیں۔ جنگی قیدی، لونڈی، غلام جو جنگ میں پکڑے گئے ہوں۔ اراضیاں اور نقد مال و دولت، اسیر وہ مرد ہوتے جو حالتِ جنگ میں پکڑے جاتے۔ اس بارہ میں اسلامی شریعت کے بہت سے احکام و شرائط ہیں۔ اور اماموں نے اس کی حد مقرر کرنے میں اختلاف کیا ہے جس کے بیان کا یہ موقع نہیں منجملہ ان شرطوں اور حکموں کے فدیہ کا قبول کرنا بھی ہے یعنی وہ مال جو گرفتار شدہ دشمن اپنی آزادی کے معاوضہ میں دے اُسے لے لینا۔ اور جو مال اس طرح لیا جاتا وہ باقی مالِ غنیمت پر اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ "سبی" وہ

عورتیں اور بچے" جو حالتِ جنگ میں مفتوحہ ملکوں سے گرفتار ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ آتے ان کا قتل کرنا جائز نہ تھا۔ مگر وہ مالِ غنیمت میں شامل کر کے فاتح لوگوں پر تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ ہاں فدیہ کا لینا ان لوگوں کی بابت بھی درست تھا۔

زمین جو حالتِ جنگ میں لی جاتی تھی۔ اس کی یا تو یہ صورت ہوتی کہ بزور شمشیر اس پر قبضہ کیا جاتا اور وہاں کے باشندے زبردستی نکال دیئے جاتے تھے۔ یا یہ کہ وہاں کے لوگ بلا کسی جنگ کے محض خوف کی وجہ سے خود ہی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے ہوتے تھے۔ اور یا یہ صورت ہوتی تھی کہ وہ زمین چند شرطوں کے ساتھ مسلمانوں کی صلح میں داخل ہو جاتی تھی۔ یہ آخری نسق فئی کی قسم سے تھی۔ انہیں حالات و اختلافات کی وجہ سے ان اراضیوں پر مختلف قسم کے لگان مقرر ہوتے تھے۔ مثلاً عشر وغیرہ۔

مالِ غنیمت کے احکام

منقولہ جائدادوں کو جن کا منتقل کرنا آسان ہوتا تھا مثلاً چوپائے اور مال وغیرہ لڑنے والے لوگوں پر تقسیم کر دیتے تھے۔ ابتدائے اسلام میں یہ تقسیم بقاعدہ طور پر ہوتی تھی۔ خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم اپنے خیال کے مطابق اسے تقسیم فرما دیا کرتے تھے مسلمانوں کو سب سے پہلے جو مالِ غنیمت ہاتھ لگا وہ سنہ ۲ھ کے واقعہ "بدر" کے موقع پر ملا تھا۔ مہاجرین اور انصار اس کے باہم بانٹ لینے میں جھگڑنے لگے تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم بھی مثل ایک مسلمان کے تھے۔ آپ نے اپنا حصّہ بھی سب کے برابر ہی لگایا۔ اس کے بعد آیہ وَاعْلَمُوا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کے حکم سے خمس کا قاعدہ مقرر ہوا۔ اور سب سے پہلی غنیمت جس میں خمس (⅕) حصہ نکالا گیا غزوہ بنی قینقاع کی غنیمت تھی۔ اور جو اسی سال حاصل ہوئی اس کے مال کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ جس میں سے چار حصے لڑنیوالوں کو برابر برابر بانٹ دیئے گئے۔ اور ایک پانچواں حصہ جو کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا خمس تھا پانچ حصوں میں بانٹا گیا۔ پہلا نبی صلے اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتِ خاص اور اپنی ازواجِ مطہرات پر صرف فرماتے تھے۔ اور اس میں سے مسلمانوں کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتے تھے۔ دوسرا حصہ قرابتمندوں پر صرف کرتے تھے۔ جو خاصکر بنو ہاشم (نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمقوم اور گھرانے کے لوگ) اور بنو عبد المطلب اور بنو عبد مناف ہوتے

ان کے سوا قرابتی لوگوں میں سے اور کسی گھرانے والے کو یہ حق حاصل نہ تھا۔ تیسرا حصہ حاجتمند یتیموں پر خرچ کیا جاتا۔ اور اس حصہ میں لڑکے اور لڑکی دونوں کے لئے یکساں حکم تھا۔ چوتھا حصہ ان مسکینوں کو تقسیم کر دیا جاتا جن کے پاس بقدر ضرورت خرچ نہ ہوتا۔ اور پانچواں حصہ ان مسافروں کے لئے مخصوص تھا۔ جن کے پاس سفر خرچ وغیرہ نہ ہوتا تھا۔

مفتوحہ اراضی کی تقسیم ۔ اسلاب یعنی مقتول لوگوں کے کپڑے اور ان کے ہتھیار بھی مال کی قسم سے شمار ہوتے تھے اور ان کو مقتول کے لوگوں پر تقسیم کر دیتے تھے۔ اور ہر ایک شخص اپنے مقتول دشمن کا سلب پاتا تھا۔ جو اراضیاں مسلمانوں کے قبضہ میں آتی تھیں خواہ وہ بزور شمشیر لی گئی ہوں یا صلح کے ذریعہ سے ان کی بابت صدر اسلام میں چند شخصوں نے یہ چاہا تھا کہ انھیں بھی مال غنیمت میں داخل کر کے فاتح لوگوں اسی طرح تقسیم کر دیا جائے جس طرح اور مالوں کو بانٹ دیا جاتا ہے۔ مگر عمر بن الخطاب نے اس امر کی اجازت نہیں دی۔ جیسا کہ ان کی ایک تحریر سے عیاں ہوتا ہے۔ جو انھوں نے فتح عراق کے بعد وہاں کے عامل سعد بن ابی وقاص ؓ کو ارسال فرمائی تھی خلیفہ ممدوح اس میں رقم فرماتے ہیں۔ حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ میرے پاس تمھاری وہ تحریر پہنچی جس میں تم نے یہ ذکر کیا ہے کہ لوگوں (مسلمانوں) نے تم سے درخواست کی ہے۔ کہ مفتوحہ اراضیاں بھی ان کو اسی طرح تقسیم کر دی جائیں جس طرح اور اموال غنیمت بانٹ دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے جس وقت تم کو میری یہ تحریر ملے، تم دیکھو کہ فوجی لوگ مال اور اسباب کی قسم سے تمھارے پاس کیا کیا لائے ہیں۔ ان سب کو موجودہ لوگوں میں تقسیم کر دو۔ اور اراضیوں اور نہروں کو ان کے کاروبار کرنے والوں کے ہاتھوں میں رہنے دو تاکہ مسلمانوں کے عطیات میں کام آئیں۔ کیونکہ اگر تم اراضیوں کو بھی موجودہ لوگوں میں تقسیم کر دو گے تو جو لوگ ان کے بعد ہوں گے ان کے واسطے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

عمر بن الخطاب کی تحریر پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ اراضیاں بھی ہمارا حق ہے۔ کیونکہ ہم نے ان کو اپنی تلواروں کے ذریعہ سے فتح کیا ہے مگر سعد بن ابی وقاص نے ان سے بحث کر کے ان کو بند کر دیا اور کہا کہ امیر خراج مقرر کیا جائے گا اور وہاں کے باشندوں پر جزیہ مقرر ہوگا۔ اور یہ دونوں آمدنیاں بہت عرصہ تک مسلمانوں کے لئے مال غنیمت رہیں گی اسی

بنیا دپر عمرؓ نے جزیہ اور خراج مقرر کیا۔ اور عراق اور اس کے علاوہ دیگر ملکوں کی سب زمینوں پر جو فتوحات ہوئی تھیں لگان مقرر کر دیا گیا اس کی تفصیل کتابوں میں لکھی گئی جس طرح اہلِ فارس اور رومیوں کے ہاں اندراج کا قاعدہ تھا۔ اور اسی صورت کو ترتیبِ فاتر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔

فیئ بیت المال کے اموال میں سے تمام باقی حصہ کا نام ہے۔ اور شرع میں "فیئ" ہر ایسے مال کو کہتے ہیں جو مشرک لوگوں سے بغیر جنگ اور فوج کشی کے ہاتھ آیا ہو۔ اس میں جزیہ۔ خراج اور عشر وغیرہ سب داخل ہیں، نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کو فیئ کے مال میں سے ویسا ہی خمس ملتا تھا جس طرح مالِ غنیمت میں سے مگر ان کے دنیا سے رحلت فرما جانے کے بعد ان کا وہ حصہ بھی جو فیئ میں سے مقرر تھا بیت المال کا حق ہو گیا۔ صدرِ اسلام میں فیئ کے چار باقی حصے فوج والوں پر تقسیم ہو جاتے تھے جو مہاجرین اور انصار کا گروہ تھا۔ اور سب کو برابر برابر حصہ ملتا تھا۔ یہاں تک کہ عمرؓ نے دفتر مرتب کیا۔ اور جنگی لوگوں کی تنخواہیں مقرر کیں جن کا ہم اوپر ذکر آئے ہیں۔ اس وقت سے فیئ کی آمدنی بیت المال میں جمع ہونے لگی۔ اور اس میں سے فوجی سپاہیوں اور دوسرے لوگوں کو ان کے مقررہ حقوق دینے میں خرچ کیا جانے لگا۔

مہاجر اور اعراب کا فرق اس سے قبل جو امور بیان ہو چکے ہیں ان میں دکھا دیا گیا ہے کہ اہلِ صدقات فیئ اور غنیمت پانے والوں کے علاوہ ہوتے تھے۔ اس لیے صدقے فیئ کے مستحقوں میں اور فیئ کا مال صدقہ کے حق داروں میں تقسیم نہیں ہوتا تھا۔ مالِ غنیمت ہجرت کرنیوالوں اور ان جنگی لوگوں کا حق تھا جو اشاعتِ اسلام میں سعی کرتے تھے۔ اور صدقہ کے مستحق لوگ نہ جنگی لوگوں میں سے تھے، اور نہ مہاجرین، کیونکہ صدرِ اوّل میں مہاجر کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا تھا جنھوں نے اسلام کی طلب کے لئے اپنے وطن سے مدینہ کی جانب ہجرت کی تھی۔ جب گھرانے کے تمام لوگوں نے اسلام قبول کر کے ترکِ وطن کر دیا تھا۔ وہ "بررۃ" کہلاتے تھے۔ اور جس خاندان کے چند لوگوں نے ترکِ وطن کیا تھا، ان کو "خیرۃ" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، گویا اس لحاظ سے تمام مہاجر لوگ دو قسم کے تھے۔ ایک "بررۃ" دوسرے "خیرۃ"، اس کے بعد ایک وہ زمانہ آیا کہ ہجرت کا حکم منسوخ ہو گیا۔۔۔

اور جزیرہ عرب کے اسلامی مفتوحات میں داخل ہونے کے بعد مسلمانوں کی صرف دو قسمیں رہ گئیں۔ ایک قسم کے لوگ "مہاجر" کہلاتے تھے۔ اور دوسرے "اعراب"۔ کیونکہ صدقہ پانیوالے لوگ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد میں "اعراب" کے نام سے موسوم ہوتے تھے۔ اور "فیئ" کا حصہ پانیوالے "مہاجرین" کہلاتے تھے۔ اسی بارہ میں ایک شاعر یوں کہتا ہے

قد لفها اللیل بعصلبی اروع خراج من الدوامی

مھاجر لیس باعرابی

صدر اسلام میں خلیفہ لوگ مہاجرین اور "اعراب" کے مابین فرق کرنے میں نہایت چھان بین کیا کرتے تھے اس لئے جس وقت خلیفہ یہ ارادہ کرتا کہ کسی طالب کو کچھ مال عطا کرے تو اس کو فیئ کے مال میں سے اس وقت تک نہ دیتا تھا جب تک کہ اس عطیہ کا نفع عامہ مسلمین کے رفاہ تک نہ پہنچتا ہو ورنہ وہ اس شخص کو صدقہ کے مال میں سے دیتا اور عمر بن الخطاب رضؓ کی نسبت اس قسم کے بہت سے قصے روایت کئے جاتے ہیں۔ جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اس قاعدہ پر نہایت سختی کے ساتھ قائم رہے۔ منجملہ ان قصوں کے ایک حکایت یہ بھی ہے۔

عمرؓ کی خدمت میں ایک اعرابی نے حاضر ہو کر عرض کی۔

اعرابی کا قصہ:

یا عمر الخیر جزیت الجنۃ [1] اکس بنیاتی وامھنہ
وکن لنا من الزمان جنۃ [2] اقسم باللہ لتفعلنہ

عمرؓ نے فرمایا "اگر میں اس بات کو نہ کروں تو کیا ہوگا؟"

اعرابی نے کہا "اذن اباحفص لاذھبنہ"[3]

عمرؓ۔ "اگر تم نے بسر کر لیا تو کیا ہوگا؟"

اعرابی یکون[4] عن حالی لتسالنہ یوم یکون الاعطیات ھنہ

والموقف المسئول بینھنہ اما الی نار واما جنہ

---

[1] جسے رات کے سونے کیلئے ایسا بستر دیا ہو جو قیمتی بستر سے زیادہ خوش وضع اور گرانبہا ہو تو وہ مہاجر ہے۔ نہ کہ اعرابی۔
[2] اے نیک عمر تم کو جنت ملے تم میری لڑکیوں اور ان کی ماں کو کپڑے پہنا دو۔ تم میرے واسطے زمانہ کے صدمات کو روکنے والی ڈھال بن جاؤ۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم ایسا ضرور کروگے۔ [3] تو ایسی حالت میں بھی اے ابا حفص ہم سب اس کو (زمانہ) کو جوں توں بسر ہی کر لیں گے۔ [4] وہ ایسی جگہ ہوگی جہاں تم سے ان کا حال دریافت کیا جاوے گا۔ اور ایسا دن ہوگا کہ وہاں عطیات نہیں دیئے جا سکیں گے۔ وہ ایسی بازپرس کی جگہ ہوگی جس کے بعد دوزخ

"اعرابی کے برجستہ جوابات سنکر عمرؓ اس قدر روئے کہ ان کی ریشِ مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اور انھوں نے اپنے غلام سے کہا "اے غلام! میرا یہ کرتہ اس شخص کو اس دن کے واسطے دیدے۔ میں کچھ اس کی شاعری کے صلے میں نہیں دیتا بلکہ اس دن کے ڈر سے دیتا ہوں اور خدا تعالیٰ کی قسم ہے کہ اس کرتہ کے سوا میں کسی اور چیز کا مالک بھی نہیں ہوں"؛ اس کے بعد اعرابی کو کچھ انعام وغیرہ دیا۔ صرف اپنے ذاتی مال میں سے عطا فرمایا۔ مسلمانوں کے مال میں سے نہیں۔ اس لئے کہ اس کی نغز گوئی کا صلہ ان کی ذات کے علاوہ کسی دوسرے پر نہیں پڑتا تھا۔ لہٰذا وہ عام مصالح کی حد سے خارج ہو گیا تھا۔

فئی کے مال میں توسیع

جن باتوں نے لوگوں کو عثمان کا دشمن بنا دیا منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی تھی کہ انھوں نے فئی کے مال میں سے لوگوں کو انعامات بانٹنے شروع کر دیئے اور متذکرہ بالا دونوں باتوں کے مابین کسی فرق کا لحاظ نہیں رکھا تھا۔ ہجرت کا زمانہ گزر کر اسلامی دولت (حکومت کا دور) شروع ہوا تو مسلمان حکمرانوں نے دونوں قسم کی آمدنیوں زکوٰۃ وصدقات اور فئی کو دونوں مذکورہ بالا فریقوں کے مابین حسبِ ضرورت وقت اور مناسب حال صرف کرنا جائز رکھا۔ جوں جوں اسلامی مملکت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اُسی قدر فئی کی آمدنی بڑھتی گئی۔ اور اس کے ابواب متعدد ہوتے گئے اور آخر کار یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ ملکی حکام کی وصول کردہ رقمیں جو اموال کی مختلف اقسام مثلاً زکوٰۃ۔ جزیہ۔ خراج۔ عشر جہازوں کی آمدنی کا دسواں حصہ وہ خمس کی آمدنیاں جو کانوں کی پیداوار اور چراگاہوں کے محاصل سے ہاتھ آتی تھیں یا ٹکسال کی آمدنی، رصد خانوں، جاگیروں، اور محفوظ ذخائرِ غلہ کے محاصل وغیرہ وغیرہ ان سب کا نام فئی رہ گیا۔ صدقات کے متعلق اوپر بہت تفصیل کر دی گئی ہے۔ مگر اب آگے چلکر ہم ان آمدنیوں کا ذکر کریں گے جو فئی کی آمدنیوں میں سب سے زیادہ ضروری اور اہم تھیں۔

جزیہ

جزیہ اور خراج اس طرح تو باہم بہت ملتے ہوتے ہیں کہ وہ دونوں مال غیر مسلم لوگوں سے وصول کئے جاتے ہیں۔ اور فئی کی آمدنیوں میں داخل ہیں۔ جو ہر سال مقررہ اوقات میں واجب الادا ہوتی ہیں۔ مگر اس حیثیت سے ان دونوں میں

فرق ہے کہ جزیہ ہر آدمی پر مقرر ہوتا ہے اور اسلام قبول کر لینے سے وہ ساقط ہو جاتا ہے لیکن خراج اسلام لانے سے بھی ساقط نہیں ہوتا، بلکہ اس کا ادا کرنا مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے ضروری ہے۔

جزیہ کی تاریخ جزیہ کچھ اسلام کے محدثات (نئی پیدا کی ہوئی باتوں) میں سے نہیں ہے بلکہ یہ تمدن قدیم کے زمانہ سے رائج چلا آیا ہے ایتھنز کے رہنے والے یونانیوں نے پانچویں صدی قبل مسیح میں سواحل ایشیائے کوچک کے رہنے والوں پر جزیہ مقرر کیا تھا اور انھوں نے اس جزیہ کا تقرر اس ذمہ داری کے مقابلہ میں کیا تھا جو انھوں نے ان مقامات کے باشندوں کو اہل فنیقیہ کے حملوں سے محفوظ رکھنے کی بابت اٹھائی تھی اور فنیقیہ اس زمانہ میں اہل فارس کا مقبوضہ ملک تھا اُن سواحل کے باشندوں کو اپنی جانوں کے حفاظت کے مقابلہ میں مال کا دیدینا آسان معلوم ہوا اور انھوں نے اسے خوشی کے ساتھ منظور کر لیا تھا رومانی لوگوں نے جن قوموں کو زیر کرکے اپنا تابع فرمان بنایا اُن پر انھوں نے مسلمانوں کی اس مقدار جزیہ سے جس کو فاتحین اسلام نے اس زمانہ کے بعد عرصہ بعد مقرر کیا تھا کہیں اور کئی حصہ بڑھ کر جزیہ مقرر کر دیا تھا کیونکہ رومانی لوگوں نے جس زمانہ میں گال (فرانس) کا ملک فتح کیا ہے تو انھوں نے وہاں کے ہر ایک باشندہ پر جزیہ مقرر کیا تھا جس کی مقدار سے (۹)، (۱۵) گنی سالانہ تک کے مابین ہوتی تھی یا یوں کہنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے مقرر کردہ جزیہ سے سات گنی تھی رومانی لوگوں نے جن ممالک کو فتح کیا تھا کچھ ان سبھوں میں جزیہ کی مقدار اتنی ہی بھاری نہیں رکھی تھی مگر وہ گال یا ایسے ہی بعض اور مقامات میں اتنا بھاری جزیہ لگانے کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ ان جگہوں میں جزیہ کی رقم اشراف سے اُن کی اپنی امدان کے نوکروں چاکروں اور غلاموں کی بابت وصول کی جایا کرتی تھی فارس والے بھی اپنی رعایا سے جزیہ وصول کرتے تھے ہمارے مشہور ہندی علامہ دوست شیخ شبلی نعمانی کا یہ خیال ہے کہ جزیہ کا لفظ اصل میں فارسی زبان کا ایک لفظ ہے جس کا اصلی تلفظ "گزیت ہے"، چنانچہ علامہ موصوف نے اپنے اس قول کا ایک رسالہ میں جو انھوں نے ۱۸۹۴ء کے اندر شائع کیا ہے بہت تفصیل کے ساتھ بنایا بھی ہے اور علامہ ابن اثیر نے کسریٰ نوشیرواں کے اس برتاؤ کا بیان کرتے ہوئے جو اُس نے خراج اور فوج کے بارہ میں برتا تھا لکھا ہے اہل فارس کے

حکمرانوں نے محکوم لوگوں پر جزیہ کا ادا کرنا لازم کر دیا تھا ـــــ سوائے بڑے بڑے لوگوں اور شریف خاندان والوں اور فوجی خدمت انجام دینے والوں اور مرزبانوں اور منشیوں اور ان لوگوں کے جو بادشاہ کی خدمت میں رہتے تھے ہر ایک انسان پر اس کے مرتبہ اور آمدنی کے انداز سے ۱۲ - ۸ - ۶ اور ۴ درم مقرر کئے گئے تھے " یہ قول بھی ہمارے فاضل دوست شیخ شبلی نعمانی کے کلام کا موید ہے اس لئے یہ بات ظاہر ہے کہ اہل عرب نے جزیہ کے لفظ کو لفظاً اور معناً دونوں اعتباروں سے فارس والوں سے لیا اور اُسے معرب کر لیا جس کی وجہ سے وہ لفظ (جزیہ) ہو گیا، اور مسلمانوں نے اس آمدنی کے جمع کرنے کی کیفیت میں عدل اختیار کیا، جیسا کہ دیکھا جا چکا ہے اور مسلمانوں نے بھی اس رقم کو اہل اسلام کے ذمہ سے اُسی طرح اٹھا دیا جس طرح کسرےٰ کے معزز لوگوں اور بڑے گھرانے والوں وغیرہ کو اس سے بری کر دیا تھا کیونکہ مسلمان حکام کے ہاں عام اہل اسلام کا وہی درجہ تھا۔ جو کسرےٰ کے ہاں فوجی سپاہیوں اور معزز لوگوں وغیرہ کو حاصل تھا اور جن کو اس نے جزیہ سے بری کر دیا تھا،

جزیہ کی مقدار

مسلمانوں نے جزیہ کی جو مقدار مقرر کی تھی اس کی صورت مختلف ہے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) حالت اور موقع کے مطابق اور اس باہمی رضا مندی کا لحاظ کر کے جو مسلمانوں اور اُن کے دشمنوں کے مابین قرار پا جاتی تھی جزیہ مقرر فرماتے تھے چنانچہ جس وقت انھوں نے "نجران" کے رہنے والوں سے مصالحت کی ہے تو اُن کے مابین رضامندی اس بات پر ہوئی تھی کہ نجران والے سال میں دو مرتبہ اس انداز سے جزیہ ادا کیا کریں کہ ۲۰۰ حُلّے صفر کے مہینہ میں اور ۱۰۰۰ حُلّے رجب کے مہینے میں دیں اور ہر حلہ کی قیمت ایک اوقیہ (چاندی) ہو اور اوقیہ چالیس درم کے برابر ہونا چاہیئے " اوزرخ " والوں سے ہر رجب کے مہینے میں سو دینار ادا کرنے پر مصالحت کی اور " مقضا " کے باشندوں سے اُن کے ہاں کی لکڑی سے بنے ہوئے کپڑوں اور پھلوں کے چہارم حصہ سالانہ لیتے رہنے پر صلح کی اور اُن کے علاوہ اسی طرح پر جزیرہ عرب کے یہودیوں سے بھی صلح کر لی تھی،

ابی بکر رضؓ کے آخر عہد تک جزیہ کی کوئی مقدار معین نہیں رہی مگر جس وقت عمر رضؓ کا دور خلافت شروع ہوا اور اسلامی فتوح میں وسعت و کثرت ہوئی تو جزیہ کی بھی ایک مقدار مقرر کی گئی عمر رضؓ نے

فوجی افسروں کے نام یہ حکم صادر فرمایا کہ ہر ایسے شخص پر جس پر استرا چل گیا ہو (یعنے اس کے ڈاڑھی مونچھیں آگئی ہوں) جزیہ مقرر کردو اور جن کے پاس صرف چاندی کے سکے ہیں اُن سے چالیس درم اور سونے کے سکے رکھنے والوں سے چار دینار سالانہ لو اس کے علاوہ ان جزیہ ادا کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ مسلمان کی خوراک کے لئے ہر مہینہ میں دو "مد" (ایک پیمانہ تھا) گیہوں اور تین "اقساط" زیت (روغن زیتون) بھی ادا کیا کریں اور ہر انسان کے لئے جو شام اور جزیرہ میں ہے اتنا ہی ہوگا، اس کے بعد جزیہ کی شرح معتدل ہو کر لوگوں کے درجوں اور مقدرت کے اعتبار سے مقرر کی گئی اب اس کا تعین یوں ہوا کہ بظاہر اچھے مالدار شخص پر سالانہ ۴۸ درم واجب الادا کئے گئے جو ۴ درم ماہوار کے قسط سے ادا کرنے پڑتے تھے متوسط الحال آدمی پر یعنی ۲۴ درم سالانہ یعنی دو درم ماہوار کی قسط سے اور فقیر پر ۱۲ درم سالانہ اور بچوں اور عورتوں اور اہل عاہات اور اُن رہبانوں سے جو گوشہ نشینی اختیار کر کے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیتے تھے کچھ بھی نہ لیا جاتا تھا۔

یہ مقدار جزیہ کی عام طور پر رائج تھی لیکن وہ ممالک اس قاعدہ سے خارج تھے جن کی فتح کے وقت کسی خاص اتفاق سے جزیہ کی شرطیں قرار پائی تھیں جیسے کہ امیر عمرو بن العاص کے ساتھ مصر کی صلح قرار پاتے وقت یہ ٹھہرا تھا کہ قبطی لوگ شریف ہوں یا وضیع جو اُن میں سمجھدار اور بالغ ہو چکے ہیں وہ سب فی نفر دو دو دینار ادا کریں گے۔ شیخ فانی اور نابالغوں اور عورتوں پر کچھ بھی نہیں ہوگا اور قبطیوں پر لازم ہوگا کہ جو مسلمان لوگ اُن کے ملک میں آئیں وہ اُن کی تین دن دعوت کریں اور اس کے سوا کئی اور باتیں بھی طے پائی تھیں اکثر حالتوں میں جزیہ کی مقدار اس لحاظ سے مقرر کرتے تھے کہ جو کچھ لوگوں کے پاس ان کی آمدنی اور خرچ کا موازنہ کرنے کے بعد بچ رہے وہ مقدار جزیہ میں لے جائے جیسا کہ ملک عراق میں جزیہ والوں کے ساتھ کیا گیا کیونکہ جس افسر نے اس ملک کو فتح کیا اُس نے وہاں کے ہر نفر پر ایک دینار جزیہ مقرر کر دیا تھا مگر جس زمانہ میں عبد الملک بن مروان خلیفہ ہوا تو اُس نے رقم مذکورہ کو بہت کم خیال کیا اور اپنے اس عامل کو جو جزیرہ پر مقرر تھا اس کی بابت تحقیقات کرنے کا حکم بھیجا اُس نے وہاں کی مردم شماری کرائی اور تمام لوگوں کو کاروباری اور پیشہ ور بنایا اور یہ حساب کیا کہ ایک پیشہ یا کاریگر تمام سال میں کس قدر کماتا ہے اس آمدنی میں سے اس کے کھانے پہننے کے اخراجات حسب حیثیت کم کئے اور تعطیلوں کے دن مجرا دے کر

حساب لگانے سے ان سب کا حاصل یہ ہوا کہ فی کس چار دینار سالانہ بچتے ہیں اس لئے اُس نے ان لوگوں پر چار دینار جزیہ لگا دیا اور سب کو ایک ہی طبقہ اور درجہ میں رکھا ؛

جزیہ کے احکام جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں جزیہ صرف غیر مسلم لوگوں سے لیا جاتا ہے اور جس وقت کوئی جزیہ دینے والا مسلمان ہو جائے تو اس کے ذمہ سے وہ ساقط ہو جاتا ہے مگر عبد الملک بن مروان کے عہد میں اس قاعدہ کی پابندی ترک کر دی گئی تھی، کیونکہ حجاج نے اُن ذمیوں پر بھی جزیہ مقرر کر رکھا تھا جو داخل اسلام ہو چکے تھے عبدالملک نے اپنے بھائی عبدالعزیز کو جو اس کی طرف سے ملک مصر کا عامل تھا فرمان بھیجا کہ وہ بھی مصر میں نومسلم ذمیوں کو جزیہ سے بری نہ کرے عبدالعزیز بن مروان نے عبدالعزیز بن حجیرۃ سے جو اس کے خواص میں سے تھے اس بارے میں رائے طلب کی۔ "ابن حجیرۃ" نے اس بات کو بہت بُرا خیال کیا، اور کہا خدا کی پناہ! کیا تمہیں کو ملک مصر میں اس برے قاعدہ کے رواج دینے میں سب سے اول نمبر لینا ہے؟ واللہ اہل جزیہ اپنے راہبوں تک کا جزیہ تو برداشت کرتے ہی نہیں اب تم اُسے اُن لوگوں پر کیونکر مقرر کرو گے جو اُن میں سے مسلمان ہو گئے ہیں؟" یہ بات سُنکر عبدالعزیز بن مروان اس خیال سے باز آ گیا مگر جب مشہور زاہد اور نیک طینت خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا عہد آیا تو انھوں نے اس بُرے قانون کو ملک عراق سے بھی اُٹھا دیا اور اُس کے بعد سے پھر کبھی کسی مسلمان پر جزیہ مقرر نہیں ہوا غیر مسلم لوگوں سے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے کیوں نہ ہوں جزیہ قبول کیا جاتا مگر بت پرست عرب لوگوں یا مرتد (دین اسلام سے پھر جانے والے) لوگوں سے نہیں بلکہ ان کے لئے سوا اسلام یا تلوار کے اور کسی بات کی منظوری نہیں ہوتی باقی رہے۔ نصاریٰ یہود۔ مجوس (آتش پرست) اور عجمی بت پرست اُن سے تین چیزوں میں سے ایک قبول کی جاتی۔ اسلام۔ جزیہ۔ یا تلوار؛

جزیہ کا مقصد اس خاص قید و بند لگا دینے سے مقصود یہ تھا کہ عربی قوم قوم واحد کی حیثیت سے تیار ہو اسی لئے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی حیات ہی میں جزیرہ عرب سے بت پرستی کا نشان کھو دیا تھا اور عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ان باقیماندہ یہود اور نصاریٰ کو بھی نکال دیا جو عہد نبوت میں کہیں کہیں پڑے رہ گئے تھے

ہم اس بات کو بیان کر آئے ہیں کہ جزیہ ان لوگوں کے سوا اور کسی پر مقرر نہیں ہوتا جو بالغ ہوں اور تندرست اور اس کے معنے یہ ہیں کہ جزیہ قتل یا قتال (جنگ) کا بدلہ ہے یعنے یہ کہ جزیہ کا ادا کرنے والا شخص نہ قتل کیا جائے گا اور نہ جنگ میں بلایا جائے گا چنانچہ سلطنت عثمانیہ کی بھی نصرانی رعایا ‹‹عسکریہ›› کے نام سے مشہور ٹیکس ادا کرتی ہے جو اس لحاظ سے جزیہ کے ساتھ بہت مشابہ ہے کیونکہ یہ ٹیکس ان سے فوجی خدمت سے معاف ہونے کے معاوضہ میں لیا جاتا ہے،

خراج

خراج کی تاریخ

خراج اُس کو کہتے ہیں جو لگان کی قسم سے زمین پر مقرر کیا جاتا ہے یا اراضیات کا محصول جو اقسام لگان میں سب سے قدیم ہے اس کے وضع ہونے کی اصل یہ ہے کہ لوگ زمین کو بادشاہ یا شہنشاہ کی ملک خیال کرتے تھے، یہ اعتقاد بھی بہت قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ توراۃ میں زمین کے فراعنہ مصر کی ملکیت میں داخل ہونے کی بابت صاف وصریح اقوال پائے جاتے ہیں، سفر تکوین (پیدائش) کے سنتالیسویں باب میں مشہور قحط وگرانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس وقت قحط کے زمانہ میں مصر کے رہنے والوں کو بھوک نے تنگ کیا تو انھوں نے یوسف علیہ السلام کے پاس سے غلہ خریدنے میں اپنی تمام کمائی از قسم سونے چاندی اور چارپایوں کے بیچ دی اور جب اُن کے پاس زمین کے سوا اور کوئی چیز نہ بچی تو وہ بھی روٹیوں کے معاوضہ میں بیچ دی،

دیگر قدیم ملکوں میں بھی زمین کی یہی حالت تھی پس زمین بادشاہ کی ملک ہے اور اس کے رہنے والے صرف اس کی پیداوار سے نفع اُٹھاتے ہیں اس پیداوار میں حکومت کا بھی ایک حصہ مقرر ہوتا ہے اسی کو خراج کہتے ہیں تاتاری لوگوں کی عادت میں داخل تھا کہ انسان چوپایوں ..... کی ملک سے مالدار ہوتا ہے باقی رہی زمین اُس کی ملکیت کا حق افراد کو حاصل ہونا وہ ناپسند کرتے تھے قدیم جرمنی والے زمین کو صرف اپنے حکام اور رئیسوں کی ملکیت خیال کرتے تھے، اسی

لئے اُن کے ہاں جو شخص قبیلہ کا سردار ہوتا تھا وہ اراضیوں کو افراد قبیلہ پر تقسیم کر دیتا تھا اور آئندہ سالوں میں پھر اُن کو باری باری سے ادل بدل کر وہی اراضیاں تقسیم کرتا رہتا غرض کہ ایک قطعہ کو ایک ہی شخص برابر دو برس تک زیر کاشت نہ رکھ سکتا تھا، چنانچہ "صقالیہ" کے بعض گھرانوں میں آج تک ایسی ہی عادت شائع ہے

اسی سے رومانی لوگ اپنی سلطنت کی اراضیوں پر لگان باندھتے تھے اور مصر و شام وغیرہ بھی منجملہ انھیں ممالک کے تھے جنکو مسلمانوں نے اہل روم کے ہاتھوں سے چھینا اور فتح کیا تھا، رومانی لوگوں کے زمانہ میں ہر ایک صوبہ کے آمد خراج کا ایک خاص دفتر ہوتا تھا جس میں اس صیغہ کے اعمال اور اس کی آمدنی و خرچ مرتب رکھا جاتا تھا اس صیغہ (محکمہ) میں محرر، محصّل اور کارکن ملکی لوگوں میں سے یا فرقہ حکام سے مقرر کئے جاتے تھے اہل فارس کی بھی عراق و فارس میں یہی حالت تھی، کیونکہ فارس والوں نے رومان ..... اور یونان کے قوانین میں سے اکثر کا اقتباس کیا تھا۔

خراج کے دفاتر

مسلمانوں نے ظاہر ہو کر شام، مصر اور عراق وغیرہ ممالک فتح کرنے کے بعد اُن میں کسی قسم کا تغیر نہیں کیا بلکہ وہاں خود بھی اسی طرح دفاتر اور محکمے قائم کئے۔ دفتروں کے محرر خاص ملکی لوگوں میں سے مقرر ہوتے تھے جو مذہبًا نصاری اور مجوس تھے اور جس طرح اگلی حکومتوں کے عہد میں ان خدمتوں پر مامور رہتے چلے آئے تھے اسی طرح اس دور میں بھی جگہ پاتے رہے، چنانچہ ملک مصر میں محکمہ خراج کے کارکن قبطی لوگ تھے اور اُن کے دفاتر قبطی ہی زبان میں لکھے جاتے تھے، شام میں جو دفتر تھا اُس کے کارپرداز رومی تھے جو رومی ہی زبان میں لکھا پڑھا کرتے تھے، اور عراق کا دفتر فارسی زبان میں تحریر کیا جاتا تھا اہل عرب دفتروں کے کام کو دیکھنے بھالنے اور اُن کی آمدنی اپنے قبضہ میں کر لینے سے مطلب رکھتے تھے گویا کہ ان کو ملک کے فتح کرنے سے کچھ وہاں کا مالک بننا مقصود ہی نہیں تھا اور اُس کی اصلی وجہ ان دنوں میں ان کا دینداری کی جانب مائل اور دنیا کی جانب سے متنفر ہونا تھی مگر جس وقت حکومت کا سررشتہ بنو اُمیہ کے ہاتھوں میں آیا اور مسلمان لوگ بدویانہ زندگی کی تاریکی سے نکل کر شہری زندگی کی روشنی میں آئے اور اُن کی بے علمی و سادہ لوحی لکھنے پڑھنے اور باخبر ہو جانے پر

فہم و فراست سے بدل گئی اور اہل عرب اور اُن کے آزاد شدہ غلاموں میں بہت سے لائق لائق منشی اور حساب دان پیدا ہوگئے تو انھوں نے دفاتر کو اپنی زبان میں بدل لیا اور وہاں کے کاروبار پر مسلمانوں میں سے کام کرنے والوں کا تقرر کرنے لگے۔ اہل عرب میں سے جس شخص نے سب سے اول اس باب کو رائج کیا وہ عبدالملک بن مروان تھا اس نے ۸۱ھ کی قریب یہ تغیر کیا اسی وقت سے تمام دفتر عربی زبان میں ہوگئے اور دراصل عربی دفاتر کہلانے کے مستحق ہوئے اور ایک خیال یہ بھی ہے کہ عبدالملک اس تغیر کا صرف شروع کرنے والا تھا مگر پھر اسکی تکمیل اس کے جانشینوں نے کی کیونکہ ملک مصر کے دفاتر ۸۷ھ کے قریب جاکر ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں پوری طرح عربی میں منتقل ہو چکے تھے،

باقی رہا حجاز کا صوبہ اس کا دفتر مدینہ میں اسی طرح اور انداز پر تھا جس طرح کہ عمر بن الخطاب نے اُسے مقرر کردیا تھا اور جسے ہم اس کی جگہ پر بیان کر آئے ہیں اور وہ دفتر اس صورت سے بہت مشابہ تھا کہ اُسے فوجی یا اعمال اور وصول لگان کا دفتر کہیں اسلئے کہ اس میں صحابہ کے نام مدون کئے گئے تھے اُس کے وظائف اور طبقے متعین ہوئے تھے اور مصر شام اور عراق کے ممالک سے فوج کی تنخواہیں اور روزینے کے بعد جس قدر بقایا حصہ خراج اور جزیہ کا مدینہ کو آتا تھا وہ بھی اسی دفتر میں منضبط کیا جاتا تھا،

مرکزی دفتر خراج

ابتدائے اسلام میں راشدین اور بنو اُمیہ کے عہد کی حالت یہ تھی کہ خود خلفاء بہ نفس نفیس خراج کے کاروبار کی نگرانی اور اس کی وصولیابی کا بندوبست کیا کرتے تھے مگر جب عنانِ حکومت بنو عباس کے قبضہ میں آئی تو انھوں نے خراج کا بھی ایک صدر دفتر دارالخلافت میں قائم کیا اور صوبہ جات کے دفتر کو اس کا ماتحت بنادیا اس دفتر کا افتتاح خلیفہ سفاح نے کیا تھا اور اس کا کاروبار برامکہ سے بعد خالد بن برمک کے سپرد فرمایا تھا برامکہ کے معاملات حکومت میں دخیل ہونے کا یہ پہلا زینہ تھا جس کی وجہ سے ان کو سلطنت کے خزانوں میں تصرف حاصل ہوگیا جس قسم کے تصرفات برامکہ نے حکومت کے مالی صیغہ میں کئے منجملہ اُن کے ایک یہ بات بھی تھی، کہ وہ لوگ اپنے کنبہ والوں اور بیٹوں کو ممالک کے خراج کا ٹھیکہ (اجارہ) دیدیتے تھے جس طرح پر کہ خلیفہ مہدی کے عہد میں برمک کے

بیٹے یحیےٰ نے ملک فارس کے خراج کی ضمانت کی اور آخر کار اس میں اس کو خسارہ اٹھانا پڑا اس کے بعد سے خراج کا دفتر بھی دیگر دفاتر کی طرح وزیروں کے قابو میں آگیا یہاں تک کہ عباسی حکومت میں ضعف پیدا ہونے پر جبکہ امراء دولت حکومت کے صیغوں پر مالک بن بیٹھے تو راضی باللہ عباسی کے ایام میں تمام دفتر توڑ دیئے گئے

خراج کا مقرر کرنا ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اہل عرب نے خراج اور اس کے دفاتر اسی طرز پر قائم کئے تھے جیسے کہ وہ اگلی حکومتوں (روم اور فارس) کے عہد میں رہتے چلے آئے تھے مقریزی کے بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اہل عرب خراج کی وصولیابی تعدیل یعنے بٹائی سے کیا کرتے تھے جب دیہات اور بستیاں آباد ہوتیں اور وہاں کے باشندے بکثرت ہو جاتے تو خراج بھی بڑھ جاتا اور وہاں کے باشندوں کی تعداد کم ہو جانے سے اُجاڑ ہو جاتیں تو خراج کو بھی گھٹایا کرتے تھے،

ملک شام کی آمدنی بھی اسی انداز پر وصول کی جاتی تھی، مگر اہل فارس اپنی اراضیات کا خراج مقاسمتہ یا بٹوارے کے ذریعہ سے لیا کرتے تھے یہاں تک کہ اسلام سے قبل فیروز کے بیٹے قباد نے اس کی پیمائش کرائی اور رقبہ کے لحاظ سے خراج اس طرح مقرر کیا کہ ایک جریب (۳۶۰۰ گز) مزروع زمین پر ایک درم نقد اور ایک قفیز جنس پیداوار کی لگان میں وصول کی جائے، اس لگان کے وصول کرنے میں اراضیات کی حالت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا خواہ اس میں پیداوار ہو یا نہ ہو لگان ادا کرنا ضروری ہوتا تھا مسلمانوں نے ان ممالک کو فتح کرنے کے بعد حسب ضرورت وحالت خراج میں تعدیل کی اور تمام ملک میں طرح طرح کی رعائتیں جاری کر دیں اہل اسلام نے اراضیات کی بابت چند عام قانون اور قاعدے بھی بنائے تھے جو حسب مندرجہ ذیل ہیں،

اراضی کی قسمیں اسلامی ممالک میں زمین کی چار قسمیں ہیں (۱) وہ زمین جس کو مسلمانوں نے نئے سرے سے قابل کاشت بنایا ہو یہ زمین عشر (دسویں حصہ) کی ہے امام اس اراضی کی پیداوار کا دسواں حصہ لے گا اور وہ اراضی احیاء اموات کی قسم سے شمار کی جائے گی (۲)، وہ زمین جس کے باشندوں نے اُسی پر قابض ہونے کی حالت میں اسلام قبول کیا ہو اسی لئے یہی لوگ اس کے پانے کے زیادہ مستحق ہیں اور وہ بھی عشر ہی کی زمین

(۳) وہ زمین جسے مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کیا ہے اور وہ اُن کے لئے مال غنیمت ہے اور وہ بھی عشر کی زمین شمار کی جاتی ہے (۴) وہ زمین جس کے باشندوں نے وہاں قابض ہونے کی حالت ہی میں مسلمانوں سے صلح کرلی ہو، یہ زمین خراج کے لئے مخصوص ہوتی تھی، اور اس کا خراج کسی حالت میں باطل نہیں ہوتا تھا خواہ وہاں کے رہنے والے اسلام ہی کیوں نہ قبول کرلیویں ایسی زمین پر اس کے متحمل ہونے کے لحاظ سے مقرر ہوتا تھا یعنے اُس پر اتنا ہی خراج مقرر کیا جاتا تھا جتنا وہ برداشت کرسکے پھر جب ملک عراق فتح ہوا تو عمرؓ نے سواد عراق پر وہی خراج مقرر کیا جو اس پر اہل فارس نے لگا رکھا تھا یعنے فی جریب ایک قفیز اور ایک درم نقد، قفیز جریب کا دسواں حصہ یعنی ۳۶۰ گز مربع ہوتا تھا، عمرؓ نے عراق کے دوسرے حصہ میں اور طریقہ سے اخراج مقرر کیا، یعنے انھوں نے خراج کی مقدار کو پیداوار کی قسم کے تابع کردیا اور عثمان بن حنیف کو وہاں کی پیمائش کا حکم دیا جنہوں نے ان اراضیات کی پیمائش کرکے انگور کی ٹٹیوں اور گھنے درختوں کی ایک جریب پر دس درم اور کھجور کے درختوں کے ایک جریب رقبہ پر آٹھ درم اور جَو کی زمینوں کے ایک جریب رقبہ پر دو درم لگان کیا اور عمرؓ نے اس تشخیص جمع کو قبول فرمالیا،

عراق کی زمین سے خلیفہ منصور کے عہد تک مساحت توظیف یا وظیفہ کی صورتوں میں خراج لیا جاتا رہا، مگر چونکہ منصور عباسی کے زمانہ میں نرخ گھٹ گیا تھا اور پیداوار میں زمین کا لگان ادا کرنے کے لئے کافی نہ ہوتی تھیں سواد کا حصہ بالکل ویران ہوگیا تھا اس لئے خلیفہ مذکور نے مقاسمۃ (بٹائی) کا طریقہ جاری کردیا، جس کی وجہ سے غلہ زیادہ ہوتا تو خراج بھی زیادہ ہوجاتا اور وہ کم تو یہ بھی کم۔ بٹائی کے خراج کی مقدار متعین کرنا خلیفہ کے ذمہ تھا مگر وہ نصف غلہ سے زیادہ اور پانچویں حصہ سے کم نہ ہوتا تھا،

زمین کی ملکیت زمین کی ملکیت اسی حالت پر رہی جس پر آغاز اسلام میں قائم ہوئی تھی یعنے وہ امام کی ملکیت تھی اور لوگ اسے صرف استعمال میں لاتے تھے، حکومت کا ایک حق اس زمین کی پیداوار میں ہوا کرتا تھا اور اس کے علاوہ بعض اراضیاں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں، جن کو "اداسی" اور "رزقہ" وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے تھے اور اُن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے اُنیسوی صدی عیسوی کا آغاز جو مملکت

عثمانی میں سیاسی اصلاحوں کے جاری ہونے کا زمانہ تھا بہت سے مفید تغیرات کا باعث ہوا۔ منجملہ حکومت عثمانیہ کے صوبہ جات کے مصر بھی ایک صوبہ تھا جب وہ گذشتہ صدی کے اوائل میں محمد علی پاشا اعظم کے تصرف میں آیا تو انھوں نے دور اندیشی سے یہ خیال کیا کہ جب تک کاشتکار اپنی زمین کا مالک نہ ہوجائے گا اس وقت تک وہ اس کے تردد کا پورا اہتمام اور اس کی حالت کو درست رکھنے کی فکر نہ کرے گا جس وقت محمد علی پاشا مصر کے گورنر مقرر ہوئے ہیں ملک مصر کی یہ حالت تھی کہ وہاں کی اراضیاں چند ذی مرتبہ اور باثر امرا کے قبضہ میں تھیں یہ لوگ کاشتکاروں کو زمینیں اُٹھا دیا کرتے تھے اور ان کی کاشت کرایا کرتے پیداوار کی آمدنی سے حکومت کا مالیہ (جمع) ادا کرنے کے بعد باقی منافع سے خود فائدہ اُٹھاتے اور عیش و عشرت کی داد دیتے رہتے تھے محمد علی پاشا نے مصر کا ملک کئی مدیریات (کمشنریاں) میں، مدیریات کو مرکزوں میں اور ان کو نواحی میں منقسم کیا اور ان میں انتظام قائم رکھنے کے لئے تنخواہ دار افسروں کا تقرر کیا اور تحصیلدار لوگ مقرر کئے تاکہ وہ لگان اور گورنمنٹ کی جمع کو وصول کریں التزامات (تعلقہ داریوں) کو توڑ دیا اور ہر سمت کی اراضیاں خود وہیں کے باشندوں پر اس طرح سے تقسیم کردیں کہ کاشتکار اس زمین کے حصّہ پر جو اُسے ملا تھا اور دوسرے شخص کے حصّے کے برابر ہوتا کھیتی باڑی کر سکتا تھا۔

مگر سعید پاشا خدیو ہوئے تو انھوں نے اپنی وہ مشہور یادداشت جو ۵ اگست کو صادر کی تھی جاری کرنے کے بعد ملکی باشندوں کے لئے زمین کو پورے طور پر شرعی ملکیت بنا دیا تاکہ وہ نسلاً بعد نسل اُن کے خاندانوں میں منتقل ہوتی رہے اسی وقت سے ملک مصر کی سرزمین مصری باشندوں کی ملک ہوگئی اسی قانون کے مطابق سلطنت عثمانیہ کے بھی تمام ممالک محروسہ میں عمل کیا گیا کیونکہ بابعالی نے سعید پاشا کی یادداشت پر جو اس بارہ پر لکھی گئی تھی، دستخط ہمایونی کے ساتھ تصدیق فرما دی تھی،

خراج کی آمدنی

اس سے وہ رقم مراد ہے جو ہر سال ممالک کے خراج سے جمع ہوا کرتی ہے یہ ایک ایسی بات ہے جس کا متعین کرنا دشوار ہے کیونکہ باختلاف اوقات و مقامات یہ بھی مختلف ہوتی ہے اور اس وجہ سے بھی دقت ہے کہ عرب مورخین اکثر حالتوں میں خراج کی مقدار بیان کرتے ہوئے جزیہ اور خراج دونوں آمدنیوں کو اکٹھا کر لیا

کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خراج کی آمدنی۔ مگر اس سے مراد خراج اور جزیہ دونوں کی آمدنی ہوتی ہے جزیہ خراج سے بہت کم ہوتا تھا اور اُس کے ثبات میں بھی بہ نسبت خراج کے کمی ہوتی تھی کیونکہ ذمی لوگ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اسلام بھی قبول کرتے رہتے تھے اس لئے جزیہ کی مقدار گھٹتی رہتی تھی بسا اوقات عرب مورخوں نے خراج کی آمدنی میں عشر (دہ یک) وغیرہ کی آمدنیاں بھی، داخل کر دی ہیں اور ہم آگے چل کر جو مثالیں دیں گے وہ بنو اُمیہ کے عہد میں وصول جمع کی مثالیں ہیں وہ اُن دنوں اسلامی ممالک میں رائج تھیں۔

عمرؓ کے عہد میں ۲۰ھ کے اندر "سواد" کے خراج کی مجموعی آمدنی ۰۰۰۰۰۰ ۱۲۰ درہم تھی اور ۶۲ھ کے قریب عبید اللہ بن زیاد کے زمانہ میں ۰۰۰۰۰ ۱۳۵ درہم ہوگئی اس کے بعد ۸۵ھ میں حجاج بن یوسف کے عہد میں ۰۰۰۰ ۱۸۸ درہم تک پہنچ گئی مگر ۱۰۱ھ کے اندر خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے وہاں کی توفیر ۰۰۰۰۰۰ ۱۲ درہم کر دی اُن کے بعد ابن ہبیرہ نے فوج کی خوراک اور جنگی لوگوں کے وظائف کے علاوہ ۰۰۰۰۰۰ ۱۰ درہم تک تحصیل کئے پھر یوسف ابن عمر کا زمانہ آیا۔ یہ والی ۰۰۰۰۰۰ ۱۶ درہم سے ۰۰۰۰۰۰۰ ۷ درہم تک دارالخلافت کو بھیجا کرتا تھا اور اپنے ساتھ والے ملک شام کی فوج کے اخراجات میں ۰۰۰۰ ۱۶ درہم اور ڈاک پر ۰۰۰۰۰۰ ۴ درہم طوارق پر ۰۰۰۰۰۰ ۲ درہم صرف کیا کرتا تھا اس کے بعد بھی ۰۰۰۰۰۰ ۱۰ درہم احداث اور عواتق کے گھرانوں پر صرف کرنے کے لئے اس کے پاس باقی رہ جاتے تھے اس حساب سے اس کے عہد میں "سواد" کی تمام جمعبندی تقریباً ۰۰۰۰۰ ۱۰۰ درہم تھی۔

ملک مصر سے عمرو بن العاصؓ نے ۰۰۰۰۰۰ ۱۲ دینار وصول کئے تھے مگر مقریزی کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رقم صرف جزیہ کی آمدنی تھی، جو فی کس دو دینار کے حساب سے واجب الادا سمجھی گئی تھی چنانچہ مقریزی کا قول ہے "اور عمرو بن العاص کے بعد عبداللہ بن ابی سرح نے ملک مصر کا مالیہ ۱۴ ملین دینار تحصیل کیا بنو اُمیہ کے عہد میں مصر کا خراج کم ہوگیا تھا یہاں تک کہ ہشام بن عبدالملک کا عہد (۱۰۵ھ لغایت ۱۲۵ھ) آیا تو اُسے اس کی طرف توجہ ہوئی اور اُس نے اپنے وہاں کے عامل کو فرمان لکھا کہ ملک کی پیمائش کرے، والی مصر نے خود تمام آباد اور ویران، زمینوں کی پیمائش کی تو اس سرزمین کو جسے دریائے نیل کا پانی سیراب کرتا ہے ۰۰۰۰۰ ۳۰

فدان[1] پایا یہ اراضی بنجر اور شور زمینوں کے علاوہ تھی، پھر اُس نے ان اراضیات میں تعدیل کی جس کی وجہ سے اُن پر ...... ۴ دینار قائم ہوئے اور اسی کے ساتھ نرخ ارزاں تھا اور سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ خلافت میں اسامۃ بن زید نے ملک مصر کا لگان ...... ۱۲ درہم وصول کیا تھا اس کے بعد سے مصر کی توفیر کم اور وہاں کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی خصوصا جس وقت خلافت بنی عباس کے ہاتھوں میں آئی اور مرکز خلافت وادی نیل سے بہت دور جا پڑا یہاں تک کہ مصر کا خراج گرتے گرتے ...... ۸ دینار پہ آرہا مگر جس زمانہ ۲۵۷ھ میں ابن طولون والی مصر مقرر ہوا تو اُس نے وہاں کی زیر کاشت زمینوں کی چھان بین کرائی جس کی وجہ سے وہاں کی مالگذاری نرخ غلہ کی ارزانی کے ساتھ ...... ۴۳ دینار تک پہنچ گئی اس زمانہ میں ایک دینار کو دس "اروب" گیہوں آتے تھے اس کے بعد سے برابر بنی عباس کے تمام عہد حکومت میں مصر کا خراج اسی کے قریب رہا،

ملک شام کا خراج عبدالملک بن مروان کے ایام میں ...... ۱۷۰۰ دینار تک پہنچ گیا تھا اور اسی کے ساتھ نرخ بازار بھی بہت ہی ارزاں تھا مذکورہ بالا رقم میں ...... ۱۸۰ "اردن" کی آمدنی سے اور ...... ۳۵ فلسطین کی توفیر سے اور ...... ۴ دمشق کے محاصل سے اور ...... ۸۰ حمص قنسرین اور عواصم کی مالگذاری سے آتے تھے،

خراج کی ضمانت داری

خراج کی ضمانت لینے کی دو قسمیں ہیں

۱، عاملوں گورنروں کو اس کی کمی بیشی کا ضامن ٹھہرانا

اسلامی شریعت میں نادرست ہے۔ اس لئے کہ عامل محض ایک معتمد علیہ اور امانتدار ہوتا ہے جو واجب شدہ لگان جمع کرتا اور حاصل کیا ہوا خراج دربار خلافت میں نذر کرتا ہے اس حیثیت سے وہ مثل ایک وکیل کے ہے جس وقت اُس نے اپنی امانت ادا کردی پھر اُس کے ذمہ کسی امر کی ضمانت نہیں، صدر اسلام میں صحابہؓ اس ضمانتداری کو بہت زور کے ساتھ منع کرتے تھے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص اُن کے پاس آیا جس نے "ابلہ" کو ایک لاکھ درم خراج ادا

---

[1] اس پیمانہ مساحت کا مملکت اسلامیہ کے باب میں ذکر آچکا ہے۔

کرنے کی ضمانت پر اُن سے لینا چاہا ابن عباسؓ نے اس شخص کو سو کوڑے مارے اور دوسروں کو عبرت دلانے کی غرض سے اُسے زندہ دار پر کھینچ دیا مگر جس وقت اسلامی خلافت دنیاوی ملک داری کے لباس میں آگئی تو خلفاء نے اس امر کی جانب سے چشم پوشی اختیار کی وہ لوگ اکثر حالتوں میں اپنے عاملوں کو توفیر خراج کا ضامن بناتے تھے اور اُن کا دستور یہ تھا کہ وہ اپنی ولایتوں اور اعمال کو ایک خراج کی مقدار مقررہ پر حکام اور والیوں کے حوالے کرتے تھے، اور وہ حکام ملک کی مالگذاری کو تحصیل کر کے زائد رقم خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہ ہو خود لے لیا کرتے تھے جیسا کہ برمک کے بیٹے یحییٰ اور اُس کے سوا چند اور شخصوں نے کیا اور خلفاء اسلام نے اس تضمین کے رواج پا جانے کے بعد قاضیوں محتسبوں اور پولیس والوں کی بھی ضمانتیں لینی شروع کر دیں جس کا بیان آگے چل کر آئے گا،

(۲) شکل خراج کی ضمانت لینے کی یہ تھی کہ التزام والوں کو اس کا ضامن بنا دیا جاتا اہل التزام وہ لوگ ہوتے تھے جو مالدار یا صاحب حکومت و مرتبہ ہوتے وہ اراضیوں کو قبول کرتے تھے۔ یعنے اس کی ضمانت لیتے تھے اور متولی خراج سے معاہدہ کر لیتے کہ اس قدر مال پر (جو باہم بڑھا کر بولیاں بولنے سے طے پا جاتا) ہم یہ اراضیاں لیتے ہیں اس طرح پر ایک شخص ایک گاؤں یا ایک شہر (ضلع) یا پرگنہ ضمانت پر لیتا اور اس میں زراعت کرتا یا شکمی کاشت کاروں کو اُٹھا دیتا۔ اس کی پیداوار میں سے اس زمین کا خراج ادا کرنے کے بعد جو باقی بچتا اُسے اپنے تصرف میں لاتا۔ اس طرح پر اراضیات کی ضمانت لینی یا ان کا التزام کرنا کچھ اسلام کی اختراعات میں سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ قاعدہ اہل یونان کے قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے اور رومانی قلمرو میں پوری طرح اس کا رواج تھا انھیں سے اہل عرب نے بھی اس قاعدہ کو اخذ کیا،

اسلامی قلمرو میں اراضی کی تضمین کا دستور اس وقت سے کچھ ہی قبل تک برابر قائم و رائج رہا اور اس طریقہ کے رواج پر کئی دور گذر گئے جن میں اُس نے کئی مختلف انقلابات بھی دیکھے اور اُس کے اندر تغیر و تبدل بھی ہوا اسی قسم کی باتوں میں سے عشر کی آمدنیوں کی ضمانت کرانی ہے جو آج تک سلطنت عثمانیہ میں رائج ہے،

خراج کے توابع

اسلامی عہد حکومت میں مالی آمدنیوں کے اندر اراضی کے خراج اس کے عشروں اور صدقات اور جزیہ کے علاوہ جہازوں کے مال کا دسواں حصہ کانوں کی پیداوار کا خُمس (پانچواں حصہ) دار الضرب ٹکسال، رسد خانوں اور علاقوں کا منافع، آبپاشی کی آمدنی اور چراگاہوں اور جنگلوں اور دریاؤں کے ٹیکس وغیرہ بہت سی قسموں کی دوسری آمدنیاں بھی تھیں جو خراج ہی کی قسم سے شمار ہوتی ہیں۔

جہازوں پر ٹیکس

جہازوں کے عشر اُن جہازوں پر لئے جاتے تھے جو بعض سرحدی مقاموں پر ہو کر گزرتے تھے ایسے جہازوں کے مجموعی بار کردہ مال میں سے دسواں حصہ نقد یا اصل جنس کی صورت میں لیتے تھے یمن کے عامل اس ٹیکس کو ان جہازوں سے وصول کیا کرتے تھے جو ہندوستان سے آتے ہوئے اُن کے سواحل سے گذرتے تھے ان جہازوں پر طرح طرح کی خوشبودار لکڑیاں مثلاً عود اور صندل اور مشک کافور عنبر اور دار چینی وغیرہ اشیاء بار ہوتی تھیں اسی لئے حکام یمن ایسے جہازوں کا ٹیکس اصل جنس کی صورت میں لیا کرتے تھے چنانچہ واثق باللہ عباسی کے عہد میں جہازوں کی عشر کی آمدنی سے بڑی بیش قرار رقم حاصل ہوئی تھی۔

فرنگی جہازوں پر ٹیکس

اُندلس کے مسلمان حکمران اُن جہازوں سے ٹیکس وصول کیا کرتے تھے جو آبنائے جبل طارق کی طرف سے ہو کر آمد و رفت رکھتے تھے اہل فرنگ وغیرہ جس وقت اس آبنائے میں ہو کر اپنے جہاز لے جاتے تو ایک شہر میں پہنچ کر جو جنوبی سمت میں مملکت اُندلس کا آخری سرحدی مقام ہے اور اس وقت میں اس کا نام "طریف" تھا اس ٹیکس کو ادا کیا کرتے تھے آج کل اس شہر کا نام طریفہ (Tarifa) ہے اور اہل فرنگ لفظ (Tarrif) کے بارہ میں (جو اُن کے یہاں درآمد و برآمد مال کے محصولوں پر دلالت کرتا ہے یا اس تحریر پر دال ہے جس میں وصول کردہ ٹیکس کی تفصیل ہوتی ہے اور جس کو "رونہ" کہتے ہیں یا مال کی بیجک پر دلالت کرتا ہے)، یہ کہتے ہیں کہ وہ اسی مقام مذکورہ بالا (طریف) کی بگڑی ہوئی شکل ہے کیونکہ فرنگستان والے جہازوں کی جن رسوم کو ادا کیا کرتے تھے، اُنھیں "رسوم الطریف" کے نام سے موسوم کرتے تھے اس

کے بعد پہلا لفظ (رسوم) ترک ہو کر صرف دوسرا لفظ باقی رہ گیا اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ عربی زبان میں (تعریفہ) کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو یورپین زبان میں (طریفہ) کے معنے لئے جاتے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ افرنجی لفظ عربی زبان کے لفظ "تعریفہ" سے منقول ہو یا جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے لفظ "طریف" کی تحریف ہو،

معاون کا خمس معاون کے خمس میں وہ آمدنیاں آتی تھیں جن کو اہل اسلام زمین کے اندر سے نکلنے والی معدنی اشیاء یا اُن کے مثل اور چیزوں پر بطور ٹیکس کے وصول کیا کرتے تھے۔ معدنی چیزوں کی دو قسمیں ہیں ظاہری معاون اور باطنی معاون۔ ظاہری معدنی پیداواریں، مثلاً سرمہ، نمک، قیر اور نفط ہیں یہ معاون وہی حکم رکھتی ہیں جو دریاؤں کے بہتے ہوئے پانی کا ہے یعنی اُن کا استعمال اسلامی شریعت میں مباح ہے ان چیزوں کا احتکار جائز نہیں ان میں تمام آدمیوں کا حق یکساں ہے۔ جو اُن کے قریب پہنچ جائے وہ اُن میں سے بے تامل حسب مرضی یہ چیزیں سے لے، باقی رہے وہ معاون جو اندرونی ہیں یعنے جن کا جوہر زمین کے اندر قرار پذیر ہے اور وہ بلا کیمیائی عمل کے نکل نہیں سکتے، مثلاً چاندی سونے پیتل لوہے اور سیسے کی کانیں ان معاون کا اجارہ ایسے لوگوں کو دے دیا جاتا تھا جو اُن کے نکالنے کا کام کیا کرتے تھے اور اُن پر یہ شرط لگا دی جاتی تھی کہ حاصل شدہ مال کا پانچواں حصہ بیت المال کو ادا کرتے رہیں۔

ٹکسال کی آمدنی ٹکسال کی آمدنی اس قسم کی ہوتی تھی کہ وہاں بننے والے سکّوں پر فی صدی کے حساب سے کچھ محصول لیا جاتا تھا جسے ہم اسی کتاب میں ٹکسال کا ذکر کرتے ہوئے بیان کر آئے ہیں اسی دار الضرب کی آمدنی اندلس کے حکمران بنی مروان کے عہد میں ایک سال کے اندر ..... ۲ تک پہنچ گئی تھی۔

چنگی جس قسم کے ٹیکس اسلامی عہد حکومت میں لئے جاتے تھے منجملہ ان کے ایک قسم کا نام "مکوس" تھا جس کا واحد "مکس" ہے۔ یہ ٹیکس اجناس تجارت پر لیا جاتا تھا جس طرح موجودہ زمانہ میں "چنگی یا فروہ" وغیرہ طرح طرح کے محصول لئے جاتے ہیں "مکس" یا "مقس" زمانہ جاہلیت میں بھی رائج تھا اور "مدینہ" میں قبطی اور فارسی سوداگروں سے ان

کے مال تجارت کا دسواں حصہ لیا جاتا تھا۔ اسلام کا ظہور ہوا تو عمر بن الخطاب نے اس کو برقرار رکھا یہ محصول تاجروں سے صرف اُسی وقت لیا جاتا تھا جبکہ وہ اپنے ملک سے باہر کسی دوسرے ملک کو جانا چاہتے اس وجہ سے اگر ایک شامی تاجر تمام ملک شام میں اپنا مال لئے پھرتا تو اس سے کوئی عشر یا مکس کا طالب نہیں ہوتا تھا لیکن جب وہ مصر یا عراق کو جانا چاہتا تو اس سے فوراً مکس وصول کر لیا جاتا۔ عمرؓ کے مقرر کرنے کے اعتبار پر مکس کے تین درجے تھے، ذمی لوگوں (نصاریٰ اور یہود) سے عشر کا آدھا یعنے بیسواں حصہ لیا جاتا تھا اور مسلمانوں سے عشر کا چہارم یعنے چالیسواں حصہ (ہر چالیس درم میں سے ایک درم) لیا جاتا۔ مگر دو سو درہموں سے کم پر کچھ نہیں لیا جاتا اور اُن عرب لوگوں سے جو رعایا میں داخل نہیں تھے پورا دسواں حصہ وصول کیا جاتا۔ مکس کا رواج عہد اسلام میں نہیں ہو سکا، کیونکہ پرہیزگار اور خدا ترس لوگ اُسے بُرا سمجھتے تھے اسی انداز پر باقی ٹیکسوں کو بھی سمجھ لینا چاہیئے۔

اقطاع جاگیریں جو اموال خراج کے ساتھ ملحق تھے منجملہ اُن کے ایک رقم جاگیروں کی آمدنی سے بھی حاصل ہوتی تھی جاگیروں کا دستور سلطنتوں میں قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے اس کی اصل یہ تھی کہ جس وقت بادشاہ کسی ملک کو فتح کرتا اور اُسے یہ منظور ہوتا کہ اس مفتوحہ ملک کو اپنے قبضہ میں رہنے دے۔ یا اس کی آمدنی سے نفع اُٹھائے تو وہ اسے اپنے سپہ سالاروں کے مابین ان کی سرفروشی و جانبازی کے صلہ میں تقسیم کر دیا کرتا گویا کہ آن کی اُجرت ملتی تھی اس امر کی تائیدیوں اور بھی ہوتی ہے کہ افرنجی زبان میں اصل لفظ اقطاع کے معنے اُجرت ہی کے ہیں۔ سپہ سالار لوگ اپنے حصہ کی اراضیوں کو اپنے ماتحت افسروں میں تقسیم کر دیتے اور وہ لوگ عام فوجی سپاہیوں پر بانٹ دیا کرتے یا اُن کے قائم مقاموں کو دے دیتے جس وقت بادشاہ اپنے سپہ سالاروں کو جاگیریں عطا فرماتا تو اُن پر مشروط کر دیتا کہ وہ لوگ امن اور جنگ دونوں حالتوں میں اس کے مددگار رہیں گے اسی لئے جس وقت اُن سرداروں میں سے کوئی شخص بددیانتی اور عہد شکنی کرتا تو زمین اپنے ہبہ کرنے والے کو واپس مل جاتی (یعنے شاہی ملک ہو جاتی) اور اگر کوئی ادنے درجہ کا فوجی سپاہی بددیانتی کا مرتکب ہوتا تو اس کی اراضی ضابطہ (کپتان) کو مل جاتی اور ماتحت افسر بغاوت یا عہد شکنی کا مرتکب ہوتا تو اس کی

جاگیر سپہ سالار ضبط کرلیتا، اسی طرح سپہ سالاروں کی جاگیر کو خلاف ورزئ معاہدہ کی صورت میں شاہی ملکیت بنالیا جاتا تھا۔ بہر حال اس آغاز کا انجام یہ تھا کہ مختلف شرطوں اور ڈھنگوں سے جنہیں اس غرض کے لئے وضع کیا تھا ملک کی زمین بادشاہ کے قبضہ میں رہے مگر چونکہ اُن قواعد اور قانون کا بیان کرنا اس موقعہ پر ضروری نہیں اس لئے ہم انھیں چھوڑے دیتے ہیں لیکن اس بات کا بیان کردینا ضروری ہے۔ کہ انھیں قوانین کا مقتضا تھا کہ بادشاہ اسکی رعایا اور اس کی فوج یہ سب لوگ متفق۔ یکدل اور ملک کو بیرونی دشمنوں کے حملوں سے بچانے پر تیار رہتے تھے کیونکہ اس ملک میں اس سبھوں کی ضرورتیں مشترک تھیں اور تبادلۂ خیالات کا سلسلہ اُن کے مابین قائم رہتا تھا، یہی جاگیروں کا طریقہ یورپ کے ملکوں میں بھی پھیلا اور اسی نے وہاں کے رہنے والوں پر رومانی لوگوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرنے پر قوی بنادیا۔

جاگیروں کا طریقہ

مگر اسلام میں جاگیروں کی کچھ اور ہی کیفیت تھی امام یوسف نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ جو اراضیاں اس قسم کی تھیں کہ ان کا کوئی مالک یا طلب گار اور دعویدار نہ تھا مثلاً وہ زمینیں جو قبل مفتوح ہونے کے حاکم ملک یا ایسے شخص کی ملکیت تھیں جو جنگ میں قتل کردیا گیا یا ترائی وغیرہ کی اراضیاں تھیں اور یہ سب اقسام اراضی مسلمانوں کے ہاتھ لگیں تو اُن کے مالک خلفائے راشدین ہوتے تھے اور وہ جس کو چاہتے بطور انعام کے ایسی اراضیوں میں سے جاگیریں دیتے ہوئے یہ شرط لگادیتے تھے کہ ان کی آمدنی کا عشر یا کچھ کم وبیش جیسا خلیفہ کو مناسب معلوم ہوتا بیت المال کو ادا کرتے رہیں۔ عمرؓ کے ایام میں سواد کے ملک کی ایسی اراضیوں کا خراج ...... ۷ درہم تک پہنچ گیا تھا اور اُن سے بعد کے خلفاء اور امراء بھی اسی اصول پر قائم رہے عثمانؓ کے عہد میں ان اراضیوں کی آمدنی ...... ۵ درہم ہوگئی تھی اور ۸۲ھ میں جسے "جماجم" کا سال کہتے ہیں عبد الرحمن بن اشعث کے فتنہ کے دوران میں خراج کا دفتر باغیوں کے ہاتھوں جل گیا اس وجہ سے ہر ایک گروہ نے اپنی مقبوضہ اراضیوں پر مالکانہ قبضہ کر بیٹھا۔

بنو اُمیہ اور بنو عباس کا یہ بھی دستور تھا کہ وہ اپنے بعض کنبہ والوں اور خاص لوگوں کو بہت سی اراضیاں جاگیر میں دے کر اُن کا خراج نہ لیتے تھے، فوج کی تنخواہیں اور تمام اخراجات خراج کی

آمدنی میں سے وضع ہونے کے بعد جس قدر رقم باقی بچتی وہ بیت المال میں داخل کردی جاتی۔ اور جاگیریں اُن کے مالکوں کے ہی قبضہ میں رہتیں؛

جاگیرداری نظام

مگر جب حکومت کی باگ خلفاء کے قابو سے نکل کر سلجوقی سلاطین کے قبضہ میں چلی گئی تو انہوں نے جیساکہ پہلے بھی فوج کی تنخواہوں کے ذکر میں بیان ہوچکا ہے نظام الملک طوسی اپنے وزیر کے ہاتھوں میں جاگیریں دینے کے تمام اختیارات دے دیئے اور اُن کے بعد میں آنے والے سلاطین نے اسی نظام الملک کے قاعدہ کی پیروی کی جن میں کردی خاندان کے حکمراں یعنے ملک مصر کے حکام بنی ایوب بھی داخل ہیں کیونکہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے تمام ممالک اپنے اُمراء اور اہل فوج کو جاگیروں میں دے ڈالے تھے خاص کر مصر کا ملک تو بالکل جاگیروں ہی میں تقسیم ہوگیا تھا اس کے بعد جاگیروں میں تعدیل کی گئی اور اس قاعدہ کو تبدیل کردیا گیا یعنے ملکی الاراضیاں تین قسموں پر تقسیم ہوگئیں کچھ اراضیاں جاگیروں میں دی جاتی تھیں اور کچھ فروخت ہوجاتی تھیں اور بعض موقوف ہوتی تھیں مقریزی نے اپنے زمانہ (نویں صدی ہجری) میں سر زمین مصر کا حال یوں بیان کیا ہے؛

مصر کی اراضی

مصر کی اراضی سات قسموں پر منقسم تھی (۱) جو شاہی دیوان میں اجرا باقی تھی یعنے نزول کی اراضی (۲) جو اُمراء اور فوجی لوگوں کو جاگیروں میں دیدی گئی تھی (۳) جو جامع مسجدوں۔ مدرسوں۔ خانقاہوں اور وقف کرنے والوں کی ذرّیات کے لئے وقف تھی، (۴) اس قسم کی اراضی تھی کہ کچھ لوگ جو کسی مسجد وغیرہ کے کاروبار کو انجام دیتے تھے وہ اس کی آمدنی سے متمتع ہوتے رہتے اس قسم کی اراضیوں کا نام "اجاس" تھا (۵) ایسی اراضی جو ملک خاص ہوکر خرید فروخت میراث اور ہبہ کی قابل ہوگئی ہو کیونکہ وہ بیت المال سے بقیمت خرید لی جاتی تھی، (۶) اراضی ناقابل زراعت (۷) وہ اراضی جو دریائے نیل سے سیراب نہ ہوتی تھی یہ زمین غیر آباد (اوسر) کہلاتی تھی" جاگیروں کی بھی دو قسمیں تھیں (۱)[1] اقطاع استغلال (۲)[2] اقطاع تملیک؛

---

[1] ایسی جاگیریں جن کی آمدنی سے جاگیردار نفع اُٹھاتے اور شاہی مالگذاری ادا کرتے تھے گویا کہ وہ زمینیں بادشاہ کی ملک ہوتی تھیں جاگیردار کو ان اراضیوں کے انتقال کا حق نہیں ہوتا تھا۔ [2] وہ جاگیریں جو جاگیردار کی کامل ملکیت ہوتی تھیں اور اسے اُن کے انتقال ربیع وغیرہ کے بھی حقوق حاصل ہوتے۔

ان ہر دو اقسام جاگیر کی نوعیت، آبادی و سرسبزی زمین، اور حالت جنگ وصلح کے تغیر و تبدل کے ساتھ بدلتی رہتی تھی اور ان تمام امور کا خلیفہ کی رائے پر دارومدار تھا؛

اسلامی دولت کی تحصیل ملکی خراج ومحاصل کی مقدار جو عباسیوں کے زمانہ میں تھی نیز اس آمدنی کا وہ علاقہ جو اسی سلطنت کی ثروت کے ساتھ تھا ہم انشاء اللہ کتاب ہذا کے حصہ دوم میں سلطنت اسلامی کی دولتمندی کا بیان کرتے ہوئے مفصل لکھیں گے،

ڈاک برید

اسلامی عہد حکومت میں "برید" کے جو معنے لئے جاتے تھے وہ آج کل کے استعمال ومحاورہ سے بالکل جداگانہ تھے اس زمانہ میں "صاحب البرید یا "صاحب الخبر" خفیہ پولیس یا حکام ملک کے نگراں اور پرچہ نویس لوگوں کے افسر سے ملتا جلتا ہوا کرتا تھا یا اس سے وہ شخص مراد ہوتا جو خلیفہ یا امیر کا جاسوس یا اس کی وہ آنکھ اور تیز سننے والا کان ہوتا جو اس کے عاملوں کی خبریں اور اس کے دشمنوں کی چالیں اس سے بیان کرتا رہتا اس طرح کا "برید" آج کل کے صیغۂ جنگ کے محکمۂ خبررسانی سے بہت کچھ مشابہ کہا جا سکتا ہے،

خلیفہ لوگ برید کی خدمت ان لوگوں کے سوائے اور کسی کو نہیں دیتے تھے جو بہت سمجھدار اور معاملہ فہم ہونے کے علاوہ اُن کے معتمد الیہ بھی ہوتے کیونکہ جیسی خبریں وہ لوگ پہنچاتے انھیں پر خلفا کے اپنے عاملوں اور ہمعصر حکمرانوں سے تعلقات قائم رکھنے کا دارومدار ہوتا تھا اور کسریٰ شاہ فارس تو برید کی خدمت پر اپنے بیٹوں کے سوا کسی اور کو مقرر ہی نہ کرتا تھا؛

برید کی مصلحت (ضرورت) خبر رسانی کی ضرورت قدیم الایام سے تمام حکومتوں میں پائی جاتی ہے رومی اور فارسی سلطنتوں میں اس کا پورا محکمہ قائم تھا۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے جس حکمراں نے اس صیغہ کو اخذ کیا وہ معاویہؓ بن سفیان تھے اس بارہ میں اُنھوں نے اپنے سے قبل گزرے ہوئے فرمانروایان شام

کی پیروی کی تھی یا اُن کے ان عاملوں نے جو ملک عراق میں متعین تھے ان کو یہ صیغہ قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا پہلے پہل اس محکمہ کے وضع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ خلیفہ اور اُن کے ان عاملوں کے مابین جو ممالک مصر عراق اور فارس پر متعین تھے۔ تیزی کے ساتھ خبر رسانی کا سلسلہ قائم رہ سکے اس کے بعد اس صیغہ میں توسیع کرتے کرتے آئے اس حد تک پہنچا دیا گیا کہ وہ خلیفہ کے عاملوں اور اُس کے رازدار لوگوں پر نگرانی کا محکمہ بن گیا۔ کیونکہ "طاہر ذی الیمنین" گورنر خراسان نے جس وقت اپنے صوبہ میں خلیفہ مامون الرشید کا خطبہ ممبروں پر پڑھا جانا بند کر دیا تو صیغہ خبر رسانی کے افسر نے اسے اس بات سے متنبہ کیا اور ملامت کی، پہلے تو طاہر نے یہ عذر پیش کیا کہ میں نے بھول کر خلیفہ کا خطبہ نہیں پڑھا تم اس کی اطلاع دربار خلافت میں نہ کر دینا مگر جب تین دفعہ ایسا ہی ہوا اور ہر بار طاہر صیغہ خبر رسانی (پرچہ نویس) کے افسر سے یہی درخواست کرتا رہا کہ خلیفہ کو اس بات کی اطلاع نہ دے تو آخر کار پرچہ نویس نے اس سے کہا۔ تاجروں کے خطوط بغداد آتے جاتے رہتے ہیں اس لئے اگر کسی غیر نے یہ خبر امیر المومنین کو پہنچا دی تو مجھ کو اپنی ملازمت سے برطرف ہو جانے اور جان سے ہاتھ دھونے کا خوف ہے" طاہر نے اس بات کو سن کر جواب دیا کہ اچھا" لکھ دے" اس وقت پرچہ نویس نے دربار خلافت کو تمام واقعہ لکھ بھیجا۔

برید کا مقصد برید۔ (پرچہ نویسی کا محکمہ) خلیفہ اور اس کے ملکی حکام کے مابین تعلق قائم رکھنے کا ذریعہ تھا خلفاء کے احکام گورنروں کو اور گورنروں کی خبریں خلفاء کے دربار میں پہنچانا اسی محکمہ کا فرض تھا پرچہ نویس لوگ گورنمنٹ کی جانب سے خبروں کی تفتیش اور حکام کے چال چلن کی نگرانی کا کام بھی انجام دیتے تھے وہ لوگ فوج اور مال وغیرہ امور مملکت کے حالات مفصل لکھ لکھ کر دربار خلافت میں ارسال کرتے تھے اس لئے جس وقت خلیفہ اور اس کے کسی عامل (گورنر) کے مابین تعلقات میں کدورت پیدا ہوتی اور عامل اس بات کا ارادہ کرتا کہ سرکشی کر کے خود مختار حکمران بن جائے تو وہ خلیفہ کے پاس خبر رسانی کا انتظام بند کر دیتا تھا جس کی نظیر مامون عباسی کا فعل ہے کیونکہ جس وقت مامون خراسان کا گورنر تھا اور اُسے یہ خبر ملی کہ اس کے بھائی "امین" نے اس کی بیعت توڑ دی ہے اور بجائے اس کے اپنے بیٹے "موسیٰ" کو ولیعہد بنا لیا ہے تو مامون نے طراز میں سے "امین" کا نام نکال ڈالا اور خبر رسانی کا سلسلہ بند کر دیا۔

عباسی دور میں خبر رسانی کا طریقہ

صیغۂ خبر رسانی (برید) کے معاملہ میں بنی عباس کی توجہ سب سے زیادہ تھی، انھوں نے اس محکمہ سے بہت بڑا کام لیا کہ ان میں سے بعض حکمرانوں کی نسبت یہ بھی سنا جاتا ہے کہ انھوں نے خاص اپنی ذات سے یہ کام کیا تاکہ اپنے عاملوں نوابوں اور رعایا کے حالات سے پوری واقفیت بہم پہنچائیں اور لیسا اوقات اس طریقہ سے ان کو عوام اور خاص شخصوں کے خفیہ حالات سے آگاہی بھی مل گئی خلفاء علانیہ اس قسم کے لوگ ہر ایک حاکم کے ساتھ مقرر کر دیتے تھے ایک معتبر مخبر وزیر کے ساتھ مقرر کیا جو دربار خلافت کے تمام حالات پوست کندہ خلیفہ کے حضور میں پہنچایا کرتا تھا اور وزیر بغیر اس شخص کی موجودگی کے کسی کے ساتھ کوئی سلوک نہ کر سکتا تھا اور نہ دربار کر سکتا۔ اسی طرح سے قاضی نائب اور دوسرے حاکموں کے ساتھ بھی ایک ایک نگراں تعینات کئے تھے خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی کہا کرتا تھا کہ مجھ کو اس بات سے زیادہ کسی چیز کی احتیاج نہیں ہے کہ میرے در دولت پر چار شخص اس طرح کے ہوں جن کے بالمقابل میرے درباریوں میں کوئی شخص زیادہ پرہیزگار یا کبار نہ ہو اور وہی چار شخص ارکان دولت ہیں کہ ان کے بغیر ملک کی اصلاح نہیں ہو سکتی ان چار شخصوں میں ایک شخص ایسا قاضی ہو جس پر خدا کے حکم جاری کرنے میں کسی کی ملامت یا بدگوئی کا اثر نہ ہو۔ دوسرا پولیس کا افسر جو کمزور کو زور آور کے مقابلہ میں اپنے انصاف سے قوی بنا دے اور تیسرا وہ خراج وصول کرنے والا افسر جو تشخیص جمع میں ملک کی اصلی آمدنی کا سراغ لگائے اور رعایا پر ظلم نہ کرے اس کے بعد منصور نے اپنی کلمہ کی انگلی کو تین مرتبہ دانتوں سے کاٹا اور ہر بار وہ آہ! آہ!! کا لفظ کہتا تھا۔ لوگوں نے دریافت کیا: اے امیر المومنین وہ کون ہے جس کے وجود سے آپ مایوس ہو رہے ہیں منصور نے کہا۔ ایسا پرچہ نویس جو ان (مذکورہ بالا) حکام کی خبریں سچائی کے ساتھ مجھ کو لکھے۔

جاسوسی کا محکمہ

لہٰذا اس موقعہ پر خبر دینے والے لوگوں سے آج کے جاسوس مراد ہیں اور صاحب برید (پرچہ نویس افسر) اور خلیفہ یا سلطان کے مابین کوئی واسطہ نہ ہوتا تھا، بلکہ یہ بلا واسطہ مل سکتے تھے چنانچہ جس وقت پرچہ نویسوں کا افسر کوئی خبر لاتا تو خلیفہ سے پہلے کسی شخص کو اس پر مطلع نہیں کرتا تھا تاکہ خود خلیفہ ہی اس خبر کو یا تو عام طور پر فاش کرے یا مخفی رکھے جیسا چاہے کرے اکثر حالتوں میں بادشاہوں اور امیروں کا قاعدہ تھا

کہ وہ اپنے اور اپنے پرچہ نویس کے مابین کوئی خاص علامت رازداری کے لئے قرار دیدیتے تھے۔
اس لئے جب تک وہ علامت موجود نہ ہوتی اُن کو پرچہ نویس کی اس تحریر پر اعتماد نہیں ہوتا تھا اگرچہ وہ خاص اس پرچہ نویس ہی کے ہاتھ کی لکھی اور اس کی مہر سے مختوم کیوں نہ ہو اس لئے کہ ممکن تھا کہ وہ کسی مجبوری یا دباؤ میں آکر ایسا کرنے پر آمادہ ہوگیا ہو اس کی ایک مثال ابو مُسلم خراسانی کا یہ قصہ ہے کہ جس وقت خلیفہ منصور نے اس کو اپنے حضور میں طلب کیا تو وہ انجام بینی کے لحاظ سے اپنی جان کا خوف کر کے ابا نصر مالک بن الہیثم کو اپنی فوج کا افسر بنا کر اسے حسب ذیل ہدایت کر گیا تھا، تم اس وقت تک ٹھہرے رہنا جب تک کہ تمہارے پاس میرا خط آئے اگر وہ خط آدھی مہر سے مختوم ہو تو سمجھنا کہ میری خاص تحریر ہے اور میں نے اس پر مُہر لگائی ہے لیکن اگر پوری مہر چسپاں دیکھو تو جاننا کہ میں نے اسے مختوم نہیں کیا اور تم اس کی تعمیل ہرگز نہ کرنا" یہ حکم دے کر ابو مُسلم بغداد کی جانب روانہ ہوگیا اور جس وقت وہ "مدائن" میں پہنچا تو اس کے قتل کا جو واقعہ پیش آیا، اُس سے تمام لوگ واقف ہیں، ابو مسلم کو قتل کرا دینے کے بعد منصور نے اس کی طرف سے "ابی نصر" کو ایک تحریر لکھوائی جس میں یہ حکم تھا کہ جس قدر مال و اسباب اُس نے تمہارے پاس چھوڑا ہے اُس کے ہمراہ لے کر دربار خلافت میں حاضر ہو۔ پھر اس تحریر کو ابی مُسلم کی مُہر سے مختوم کرایا اور روانہ کر دیا ابو نصر نے پوری مہر چسپاں دیکھ کر معلوم کر لیا کہ اس تحریر کا لکھنے والا خود ابو مسلم نہیں ہے۔

صاحب البرید کے فرائض

خبر رسانی کا صیغہ ایک بھاری عہدہ ہے اس کا افسر بہت سے ماتحتوں اور بیش قرار اخراجات کا حاجتمند ہوتا ہے تاکہ اپنے ماتحتوں کو بھاری بھاری تنخواہیں اور انعام دے کر انھیں راضی اور امانت داری پر قائم رکھ سکے۔ "صاحب البرید" کے فرائض میں یہ بات بھی داخل تھی کہ وہ راستوں کی حفاظت رکھے اور اُن کو چوروں لٹیروں اور دشمنوں کے حملوں سے بچائے اور خشکی و تری میں مخالفین کے جاسوسوں کا آنا بند کرے سرحدی مقامات کے افسروں اور اطراف ممالک کے حاکموں کے تمام خطوط "صاحب البرید" ہی کے پاس آیا کرتے اور وہ ان خطوں کو جس قدر ممکن ہوتا قریب ترین راستوں اور تیز رو سواریوں کے ذریعہ خلیفہ کے حضور میں پہنچاتا تھا۔

برید (ڈاک) کے راستے

ڈاک کے چند خاص راستے تھے جو مرکز خلافت سے اطراف سلطنت تک ہر چہار جانب پھیلے ہوئے تھے، یہاں تک کہ وہ غیر ملکوں کے راستوں سے جا ملتے تھے، ان میں سے ہر ایک راستہ چند منزلوں پر اور ہر منزل چند دم لینے کی جگہوں یعنے چوکیوں پر منقسم ہوتی تھی، اور ہر ایک چوکی پر تازہ دم گھوڑے یا اونٹ تیار رہا کرتے تھے ڈاک کے ہلکارے ان چوکیوں پر اپنے تھکے ہوئے گھوڑوں کو تازہ دم گھوڑوں سے بدل لیا کرتے تھے تاکہ راستہ تیزی کے ساتھ طے ہو سکے اہل عرب کے یہاں تو گمان غالب یہ ہے کہ ڈاک کی سواریوں میں اونٹ مستعمل ہوتے رہے ہوں مگر فارس والے اپنے یہاں گھوڑوں کا استعمال کرتے تھے۔ عباسی حکومت کی ترقی کے زمانہ میں ڈاک کے راستوں کی تعداد ترانوے تک پہنچ گئی تھی اور جانوروں کی قیمتیں ان کا خرچ خوراک اور ملازمین کی تنخواہ وغیرہ کے تمام مصارف سال ۱۵۹۱۰۰ دینار تک ہوتے تھے۔

ہم نے جس مقام پر ملک "سواد" کے اس خراج کی حالت بیان کی ہے جو بنو اُمیہ کے زمانہ میں وہاں سے حاصل ہوتا تھا اسی جگہ یہ بھی دکھایا ہے کہ بنو امیہ ڈاک کے انتظام پر چار ملین درم یعنے قریب قریب بنو عباس کے اخراجات سے دُگنی رقم صرف کرتے تھے اور یہ بات ہمارے اس قول کی تائید کرتی ہے جو ہم بنو اُمیہ کے اپنی حکومت کو زور آور بنانے کے غرض سے بے دریغ مال و دولت صرف کرنے کے بارہ میں کئی بار لکھ آئے ہیں۔

ڈاک کا ہر ایک راستہ ایک گھوڑے سے بڑھتے بڑھتے چالیس پچاس جانوروں تک ترتیب پاتا اور اکثر حالتوں میں ڈاک کے گھوڑوں کو بعض لوگوں کے جلد لانے کے واسطے اور اُنہیں خلیفہ یا امیر کے روبرو عجلت کے ساتھ حاضر کرنے کے لئے بھی استعمال کرتے تھے، ڈاک کی تیز روی راستوں اور سواری کی قسموں کے اختلاف کے ساتھ مختلف ہوا کرتی تھی، یہ سواریاں اونٹ اور گھوڑوں ہی کی ہوتی تھیں اور ان جانوروں کے گلوں میں زنجیریں یا گھنٹیاں لٹکا دی جاتی تھیں۔ جب چلنے سے ان کو جنبش ہوتی تو دور تک آواز سنائی دیتی اور اس آواز کو ان کے محاورہ میں "لقبقعۃ البرید" کہتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ڈاک کی روانگی دریائی راہ سے کشتیوں پر عمل میں آتی۔

پیدل ہرکارے ڈاک کے ذریعہ خبر بھیجنے میں علاوہ اس کے کہ جانوروں یا کشتیوں پر خطوط کے تھیلے روانہ ہوں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ پیدل ہرکاروں کی معرفت جن کو "سعادۃ" کہتے تھے۔ ڈاک روانہ کی جاتی تھی، یہ ہرکارے ایسے لوگ ہوتے تھے جو چھریرے بدن والے اور تین تین منزلوں کی ایک ہی منزل کرنے کے عادی ہوجاتے تھے عموماً جنگلوں کے رہنے والے اس کام کے لئے زیادہ مستعد پائے جاتے تھے سب سے پہلے جس شخص نے "سعاۃ" کا گروہ قائم کیا وہ معزالدولہ تھا اُس نے عباسی حکومت میں بغداد کے اندر اس جماعت کو تیار کیا اور اس کی غرض یہ تھی کہ اپنے بھائی رُکن الدولہ کو بہت جلد جلد حالات کی اطلاع دیتا رہے، "معزالدولہ" کے عہد میں دو "ساعی" بہت نامور نکلے جن میں سے ایک کا نام "فضل" تھا اور دوسرے کا "مرعوش" یہ دونوں تمام دوسرے "سعاۃ" پر سبقت لے گئے تھے ان دونوں میں سے ہر شخص ایک دن میں چالیس سے بھی زیادہ "فرسخ" یعنی تقریباً (۱۴۰) میل راہ طے کر لیتا تھا۔

ایک صورت خبر رسانی کی نامہ بر کبوتروں کا استعمال بھی تھا، اہل عرب اس صیغہ کو بہت کارآمد خیال کرتے اور اس کا اہتمام بڑی توجہ سے کیا کرتے تھے، کبوتروں کے ذریعہ سے پیغام رسانی کا کام نکالنا قدیم اقوام میں بہت دنوں سے رائج چلا آتا تھا۔ مگر مسلمان لوگ اس بارہ میں اور تمام لوگوں سے زیادہ سرگرم پائے گئے اور ہم نے سال دوہم کے الہلال نمبر سات میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے ۔

مراسلت کا طریقہ مسلمانوں کے یہاں مراسلت کے جو طریقے مستعمل تھے، منجملہ اُن کے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ کاغذ کا ورق لکھ کر ایک بانس کے پچھڑے میں لٹکا دیا جاتا اور وہ ایک گھاس کے گٹھے میں گاڑ کر گٹھے کو پانی میں ڈال دیا جاتا گھاس بہتی ہوئی نہر کے بہاؤ پر چلی جاتی یہاں تک کہ وہ شخص جس کے پاس پیام بھیجا جاتا وہ اسے دیکھتا اور نکال لیتا ایک قاعدہ یہ بھی تھا کہ تیروں کی پیکان پر خبریں لکھ کر اُنھیں مقام مقصود کی جانب پھینکا جاتا تھا مگر اس صورت کی بابت گمان غالب یہ ہے کہ حصار اور راستوں کے بند ہوجانے کی حالت میں مستعمل ہوتی تھی۔

ڈاک کے ملازموں میں "سعاۃ" کے علاوہ ایک قسم کے ملازم "شعوذی" ہوا کرتے تھے

یہ امیروں کے قاصد ہوتے جو ڈاک پر روانہ کئے جاتے تھے اور ایک دوسری قسم کے ملازم "کوہبانی" ہوتے تھے یہ ایسے مخبر ہوتے جو تجسس حالات کی غرض سے روانہ کئے جاتے تھے، بعض وہ ملازم تھے جو خلفاء کے روبرو ڈاک کے تھیلے کھولتے تھے یہ تھیلے عمدہ کپڑوں یا چمڑے کے بنے ہوئے ہوتے تھے جن میں خطوط رکھ کر اوپر بھیجنے والے کی مہر لگادی جاتی تھی اور مرسل الیہ کے پاس پہنچنے پر وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کی مہر کھولتا تھا یا جو اس خدمت پر مامور ہوتا اُس کے حکم سے وہ کھولا کرتا۔

محکمہ قضاء

قاضیوں کی تاریخ

اسلام سے قبل قضاء کی کیا حالت تھی

قضاء (جس سے لوگوں کے مابین واقع ہونے والے جھگڑوں کا فیصل کرنا مراد ہے) نہایت قدیم صیغہ ہے کیونکہ انسان اپنے وجود میں آنے کے اوّل زمانہ سے ہی اس بات کا محتاج پایا گیا ہے کہ اس کے قضایا کوئی شخص فیصل کرے تمام قبیلوں اور گھرانوں کے قاضی ان میں کے معزز اور عقلمند لوگ ہوا کرتے تھے اور وہی لوگ ان قبائل کے حکمران اور امیر بھی ہوتے تھے جب کوئی شخص جسمانی اور دماغی قوتوں میں نامور ہوتا تو وہی اپنے قبیلہ کی امارت اور اس کے قضایا فیصل کرنے کا ذمہ دار ٹھیرتا فطرت انسانی کے مطابق زمانہ "بدو" (وحشت) کی یہی حالت تھی اہل عرب بھی ایام جاہلیت میں اسی طریقہ پر قائم تھے ان کا دستور تھا کہ اپنی قوم کے وجیہہ اور عقلمند لوگوں سے اپنے معاملات کا فیصل کرایا کرتے اسلام سے قبل کے قاضیوں کی ایک بڑی جماعت مشہور رہے جن میں سے ہر شخص اپنے قبیلہ میں فیصلۂ معاملات کا کام انجام دیا کرتا تھا، چنانچہ قبیلہ تمیم میں سے "حاجب بن زرارہ" اور "اقرع بن حابس" اور "ربیعۃ بن مخاشن" اور قبیلہ ثقیف میں سے "غیلان بن مسلمہ" اور خاندان قریش میں سے "ہاشم بن عبدالمناف" "عبدالمطلب بن ہاشم" اور ابوطالب بن عبدالمطلب

بنی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے چچا اور" عاص بن وائل" بنی اسد میں سے۔" ربیعۃ بن خدار" اور کنانہ میں سے" سلمہ بن نوفل" وغیرہ اشخاص تمام قبائل میں مشہور ہو گزرے ہیں، قضا کا کام کرتے تھے جیسے اکثم بن صیفی اور عامر بن الضرب وغیرہ اور اہل عرب کاہنوں اور عریفوں سے بھی اپنے معاملات فیصل کراتے تھے،

قضاء کا عہدہ اسلام میں

اسلام میں سب سے پہلے قضاء کے اختیارات خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم صاحب شریعت اسلامیہ کو بہ نفس نفیس حاصل رہے اور آن کے بعد خلفائے راشدین اس منصب پر قائم رہے کیونکہ قضاء کا عہدہ بھی کاروبار خلافت کے تحت میں داخل ہے صدر اسلام میں خود خلفائے راشدین بذات خاص اس فرض کو انجام دیا کرتے تھے اور اپنے سوا کسی کو یہ کام سپرد نہ فرماتے تھے مگر جب وہ وقت آیا کہ اسلامی قلمرو کا دائرہ وسیع ہوا نئے نئے ممالک فتح ہوئے اور خلفاء کے فرائض منصبی روز بروز بڑھنے لگے، تو وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ خاص دار الخلافت اور بیرونی ممالک میں اپنے قائم مقام قاضی مقرر کریں، خلفائے راشدین میں سے سب سے اول جنہوں نے اس کام کو کیا وہ عمر بن الخطابؓ خلیفہ دوم تھے انھوں نے مدینہ میں اپنے ساتھ" ابی الدردا" کو قاضی بنایا اور" شریح" کو بصرہ میں اور" ابوموسیٰ اشعریؓ" کو کوفہ کا قاضی مقرر فرمایا اور انھیں ابی موسیٰ کے نام ایک فرمان لکھا جو اسلامی فقہ کا دستور العمل ہے اور اسی کے محور پر آج تک قاضیوں کے احکام دورہ کرتے ہیں، اس فرمان کی عبارت مشہور ہے

مصر میں قاضیوں کا تقرر

عمر بن الخطاب کا قصد یہ تھا کہ جس طرح انھوں نے مدینہ اور بصرہ میں قاضی مقرر کئے ویسے ہی ملک مصر میں بھی قاضی کا تقرر کریں، کیونکہ ملک مصر میں منصب قضا پر کسی شخص کا تقرر وہیں کے والی (گورنر) کے قبضہ میں تھا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عمر بن الخطاب نے مصر کے امیر عمرو بن العاص کو لکھا کہ وہ" کعب بن یسار بن غنہ" کو مصر کا قاضی مقرر کر دیں شخص مذکور آن لوگوں میں سے تھا جنہوں نے جاہلیت کے عہد میں قضا کا کام انجام دیا تھا" کعب" نے اس عہدہ کے قبول سے انکار کرتے ہوئے کہا میں نے جاہلیت کے زمانہ میں قضا کا فرض انجام دیا ہے اور اسلام میں اب پھر دوبارہ اس کام کو نہ کروں گا" امیر عمرو بن العاصؓ نے اسے منکر پاکر" عثمان بن قیس بن ابی العاصی" کو قاضی مصر

مقرر کر دیا اُس کے بعد سے اس وقت تک مصر کے امیروں ہی کو قاضیوں کے تقرر کا اختیار حاصل رہا اور جب بنی عباس کی حکومت کا دور شروع ہوا تو انھوں نے ملک مصر پر اپنا پورا قبضہ جمانے کی نیت سے وہاں کی قضاء کا منصب کسی کے حوالہ کرنا اپنے اختیار میں لے لیا سب سے پہلا ملک مصر کا قاضی جو خلفاء کی جانب سے مقرر ہوا وہ "عبداللہ بن لھیعۃ حضری ہے" اس کو ابوجعفر منصور عباسی نے ۱۵۵ھ میں مصر کا قاضی بنایا اور اس کے بعد سے قاضی مصر کا تقرر خلفاء کے اختیار میں چلا گیا اور آج تک برابر یہی دستور جاری ہے،

تعداد میں اضافہ

ابتداءً ہر ایک اقلیم میں ایک ہی قاضی ہوا کرتا تھا۔ مگر جبکہ اسلامی مملکت کی آبادی اور وسعت کا دائرہ بڑھ گیا تو قاضیوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی یہاں تک کہ یہ نوبت آپہنچی کہ بڑے بڑے شہروں میں کئی کئی قاضی مقرر کئے جاتے تھے یعنے شہر کی ہر ایک جانب (حصہ) میں ایک قاضی ہوتا تھا اور خود خلیفہ بذات خاص ان کا تقرر کیا کرتا۔ خلیفہ رشید عباسی کے عہد سے قبل تک یہی طریقہ رائج رہا۔ مگر رشید کے عہد میں بغداد کی وسعت ترقی پذیر ہوئی اور مشہور قاضی ابو یوسفؒ ان دنوں میں بہت نامور اور متبحر قاضی ہوئے۔ رشید ان کی بہت عزت اور تکریم کیا کرتا تھا اس لئے اُس نے اُن کو "قاضی القضاۃ" کا لقب عطا کیا اور یہ پہلے قاضی القضاۃ ہیں۔ قاضی ابو یوسفؒ بڑے عالی ہمت شخص تھے انھوں نے اس منصب کے فرائض نمایاں کامیابی کے ساتھ ادا کئے اور علماء کے گروہ ....

.... کو ایک خاص لباس سے امتیاز بخشا ورنہ اس سے پہلے وہ بھی عام آدمیوں کا سا لباس پہنتے تھے، قاضی ابو یوسفؒ کے بعد قاضی القضاۃ کو شہر بغداد کے ماتحت قاضیوں کے تقرر کا اختیار حاصل ہو گیا اور اُس کے بعد اقلیموں کے قاضیوں کا عزل و نصب بھی اسی کے قبضہ و تصرف میں آگیا مصر اور اندلس کے اُن خلفاء نے جو عباسی خلفاء کے معاصر تھے اُنھیں کی پیروی کی اور وہ بھی قاضی القضاۃ کو مقرر کر کے اُسے ماتحت قاضیوں کے تقرر کا اختیار دینے لگے۔

قاضیوں کے فرائض میں توسیع

صدر اسلام میں قاضی کا فرض منصبی صرف لوگوں کی خصومتوں کا فیصلہ کرنا تھا۔ مگر بعد مقتضیات احوال کے مطابق یا خلفاء کے دیگر اشغال سیاسی میں مصروف رہنے کی وجہ سے بعض

اور امور بھی ان لوگوں کے ہاتھوں میں آنے لگے چنانچہ قاضی کے اصلی فرائض منصبی کے علاوہ مسلمانوں کے بعض عام حقوق کا ادا کرنا بھی اُن کے ذمہ آپڑا۔ مثلاً دیوانوں، یتیموں، مفلسوں، اور اہل سفاہت کے مال جو حکومت کے زیر نگرانی (بطور کورٹ آف وارڈس) رہتے تھے اُن کی نگرانی؛ مسلمانوں کی وصیتوں اور اوقاف کا جاری کرنا اور جب کوئی ولی نہ ہو تو یتیموں کا نکاح بیاہ کرا دینا۔ اس کے بعد ان کے اختیارات کا دائرہ راستوں کے مصالح، تعمیرات کی ضرورتوں، گواہوں امینوں کے اور نائبوں کے تصفیح (یعنے جستجوئے حالات اور اُن کے چال چلن کی دیکھ بھال) تک وسیع ہو گیا اور اُن کو حق مل گیا کہ عدالت اور جرح کے ساتھ ان کا علم و تجربہ حاصل کریں بعض خلفاء نے ان اختیارات کو اور بھی وسعت دی یہاں تک کہ "صوائف" کی فوجوں میں جہاد کی افسری بھی انہی کے حوالہ کر دی منجملہ ایسے قاضیوں کے ایک قاضی یحییٰ ابن اکثم بھی تھے جو "مامون" کے عہد میں "صیفی" مجاہدوں کے ہمراہ ممالک روم پر حملہ آور ہوا کرتے تھے، اسی طرح عبد الرحمن الناصر اموی حکمران اندلس کے قاضی منذر بن سعید کو بھی اختیارات وسیع حاصل تھے عزیز باللہ فاطمی (خلیفہ) نے "علی بن نعمان" کو مصر کا قاضی مقرر کر کے شام مغرب، حرمین اور تمام مملکت کا عہدۂ قضا اس پر اضافہ کر دیا۔ نیز خطابت امامت اور سونے چاندی کے کھوٹے کھرے کی پرکھ ترازوؤں اور پیمانوں کی کمی بیشی کا اندازہ اور جانچ یہ سب امور بھی اسی کے حوالہ کر دیئے حاکم بامر اللہ کا عہد آیا تو ۳۹۴ھ میں "ابو محمد بازوری" قاضی کے منصب پر مامور ہوا اور اس پر عہدہ وزارت کا بھی اضافہ کیا گیا وہ پہلا قاضی تھا جسے حکومت کے دو جلیل مناصب کا باہم جمع کرنا نصیب ہوا اگرچہ اس کے بعد اوروں کو بھی ایسے موقعے ملے؛

اختیارات کی کمی

پس بیانات بالا سے صاف عیاں ہے کہ قضاء کا منصب بے حد وسیع ہے مگر وہ ہر ایک زمانہ میں اتنا ہی وسیع نہیں رہا بلکہ حکومتوں کے اختلاف اور تغیر و تبدل کے ساتھ ادلتا بدلتا رہا اور اس کے اختیارات میں رفتہ رفتہ وسعت پیدا ہوتی گئی، جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اوائل اسلام میں خلفائے راشدین محض انہیں لوگوں کو قاضی کے منصب پر مامور کیا کرتے تھے جو اُن کے عصبہ (ہم خاندان) اہل عرب میں سے ہوں یا حلف یا رق (غلامی سے آزاد ہونے کے بعد) یا دیگر وجوہ سے ان کے

گہرے دوست ہوں اور وہ ان پر کفایت اور رشوت لینے سے بے پرواہ ہونیکی بابت کامل اعتبار رکھتے ہوں لیکن جب اسلامی خلافت دینی رنگ سے بدل کر سیاسی رنگ میں رنگی گئی اور حکومت کا معاملہ شاہی حالت میں آگیا تو یہ شرط کمزور ہو گئی اس کے بعد حکمرانی کی باگیں عجمی النسل لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں اور رفتہ رفتہ قاضی کے فرائض کم ہوتے ہوتے محض مقدمات کے فیصل کرنے اور شخصی حالات کا فیصلہ کرنے تک ہی محدود رہ گئے اور بعد ازاں محض شرعی امور میں شخصی حالات کی بنا پر حکم دینا ہی ان کا کام باقی رہ گیا جس طرح آج کل کے زمانہ میں دیکھا جاتا ہے۔

اہل علم کا قاضی بننے سے انکار

قاضی لوگ مسجدوں میں بیٹھ کر لوگوں کے معاملات فیصل کیا کرتے تھے اگر متخاصمین اُن کے پاس آتے تو وہ وہیں بیٹھے ہوئے فیصلہ کر دیا کرتے تھے علمائے اسلام اور دیگر پرہیزگار مُسلمان علم وفہم والے لوگ قضا کے منصب کو دینی پہلو کے لحاظ سے ایک امر دشوار وخطیر سمجھا کرتے تھے کیونکہ اس میں قاضی کے خطا کرنے کی صورت میں جب کہ وہ غلطی سے کسی حقدار پر ظلم کر بیٹھے یا خلاف حق فیصلہ کردے تو مستوجب مواخذہ ہونے کا دھڑکا لگا رہتا اسی لئے بہت سے علما اور متقی لوگوں نے اس منصب کے قبول کرنے سے انکار کیا تھا جیسا کہ کعب بن یسار کے معاملہ میں دیکھا جا چکا ہے کہ انھوں نے عمر بن الخطاب کے حکم سے مصر کا قاضی ہونا منظور نہ کیا اور امام اعظم نعمان بن ثابت ابوحنیفہ نے خلیفہ ابوجعفر منصور عباسی کے فرمان سے جبکہ اس نے ان کو قاضی مقرر کرنا چاہا انکار کر دیا اور کہا "خدا سے ڈرو۔ اور اپنی امانت میں اس شخص کو حصہ دو۔ جو خدا سے خوف کھانے والا ہو واللہ میں خداوند پاک کی رضامندی سے بھی بے خطر نہیں ہوں پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس کے غضب سے بے خوف بن جاؤں؟ اگر کوئی موقعہ ایسا آپڑا کہ خود تم پر حکم دینے کی نوبت آئی پھر تم نے مجھ کو یہ دھمکی دی کہ یا تو اپنا حکم بدلو ورنہ میں تجھ کو دریائے فرات میں غرق کرادونگا تو یقین مان لو کہ میں دریا میں ڈوب مرنے کو پسند کروں گا اور تمہارے حاشیہ کے لوگ اس امر کے محتاج ہیں کہ قاضی اُن کی عزت وحرمت کرے میں بیچارہ اس کام کے قابل نہیں ہوں لہذا مجھے معاف ہی رکھو۔ مسلمانوں کا قاعدہ تھا کہ جس وقت کوئی قاضی مقرر کرتے تو اس کو جامع مسجد لے جاکر وہاں بہت بڑے مجمع کے سامنے وہ فرمان پڑھ کر سناتے جو اس شخص کے تقرر کی نسبت

دربار خلافت یا بارگاہ سلطانی سے صادر ہوتا ۔

مصر کے قاضی مصر کے قاضی امام شافعی کا مذہب ظاہر ہونے کے وقت سے اسی مذہب کے پابند ہوا کرتے تھے مگر وہاں کے قاضی کو یہ اختیار حاصل ہوتا تھا کہ اپنے رائے کے مطابق دوسرے مذہبوں کے قاضی بطور نائب کے مقرر کرے چنانچہ ۵۲۵ھ میں قاضی ابو احمد بن افضل نے چار قاضی اپنی نیابت میں مقرر کئے تھے اور یہ سب قاضی چاروں مذہبوں (حنفیؒ ، مالکیؒ ، حنبلیؒ ، شافعیؒ) کے مطابق علیحدہ علیحدہ فیصلے کیا کرتے تھے اس کے بعد سے یہ قاعدہ "ممالک" (غلام خاندان حکمران مصر) کے ایام میں بھی برتا جاتا رہا ،

قاضی کی تنخواہ قاضی کا وظیفہ (تنخواہ) حکومتوں اور زمانوں کے اختلاف کے ساتھ مختلف ہوتا رہا اس مقام کے علاوہ کسی موقعہ پر ہم دکھا چکے ہیں کہ عمر بن الخطاب نے شریح کو بصرہ کا قاضی مقرر کرکے ان کا وظیفہ سو درہم ماہوار نقد اور خرچ خوراک کے لئے کچھ مقدار گیہوں کے بوروں کی قرار دیا تھا خلفائے راشدین کے عہد میں قاضیوں کے وظائف اتنے ہی رہے مگر بنی اُمیہ کے زمانہ میں ان کی تنخواہوں میں ترقی ہوئی اور صرف انہیں کے وظائف نہیں بڑھے بلکہ فوجی اور ملکی عہدہ داروں کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کیا گیا عباسیوں کا زمانہ آیا تو قاضی مصر کا مشاہرہ تیس دینار قرار پایا سب سے پہلے جس شخص کو اس قدر تنخواہ ملی وہ قاضی (ابن لہیعہ) تھے جن کو خلیفہ مذکور نے مقرر کیا تھا اور جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ، پھر خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں قاضیوں کی تنخواہیں بہت بڑھ گئیں ان دنوں مصر کے قاضی "عطا بن سکندر" کی تنخواہ ۴ ہزار درہم یا تقریباً ۲۰۰ دینار تھی۔ جو ایک بیش قرار مشاہرہ ہے شائد خلیفہ مذکور نے اتنی زائد تنخواہ کسی خاص غرض سے مقرر کی ہو کیونکہ اس کے علاوہ خلیفہ نے قاضی مذکور کو ہزار دینار اور بھی بطور جود دیئے تھے۔ اس کے بیس سال سے کچھ عرصہ بعد قاضی مصر کا وظیفہ پھر دوبارہ ایک ہزار دینار سالانہ تک گھٹ گیا اور جس شخص نے سب سے پہلے اس وظیفہ کو منظور کیا وہ "بکار بن قتیبہ" تھا جو احمد بن طولون کے عہد ۲۴۵ھ میں قاضی مصر مقرر ہوا فاطمی حکومت کے دور میں پھر قاضیوں کی تنخواہیں بڑھنے لگیں ان دنوں میں جو شخص قاضی القضاۃ ہوتا تھا اس کو علاوہ مصارف خانگی سامان خورد و نوش اور تحفہ تحائف کے بارہ سو دینار سالانہ ملا کرتے تھے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایوبی خاندان کے

حکمرانوں اور اُن کے بعد آنے والے حکام کے عہد میں یہ وظیفہ اسی حالت پر قائم رہا،
بغداد کے قاضیوں کے وظائف ہم کو معلوم نہیں ہوسکے کہ عباسیوں کے زمانہ میں کس قدر ملتے تھے، مگر ہم نے یہ ضرور دیکھا کہ قضا کا عہدہ التزام میں داخل ہوگیا تھا جس کی وجہ سے قاضی لوگ قضاء کی آمدنی کو خلیفہ یا سلطان وقت سے ایک مقدار مال کے معاوضہ میں جو وہ ادا کرتے رہتے تھے ضمانتہً لیتے تھے۔ پہلا شخص جس نے منصب قضا کی ضمانت کی وہ عبداللہ بن حسن بن ابی الشوارب، تھا اس نے معزالدولہ بن بویہ کے عہد ۳۵۰ھ میں اس بات کی ضمانت کی تھی کہ بغداد کا قاضی القضاۃ ہونے کی حیثیت سے وہ ہر سال ۲۰۰۰۰۰ درم سلطان کو نذر کرتا رہے گا، اس کے بعد سے منصب قضاء کی ضمانت کرنا ایک عام بات ہوگئی اور محتسب اور شرطی (پولیس افسر) کی جگہیں بھی ضمانت میں دی جانے لگیں،

دیوان المظالم

یہ عدالت بھی منصب قضاء کے ماتحت تھی اور جس کو ہم آج کل "مجلس استناف" (عدالت اپیل) کہتے ہیں اس کے ساتھ بہت مشابہ تھی اس محکمہ سے اصل غرض یہ تھی کہ لوگوں کی جو فریادیں قاضیوں وغیرہ کے فیصلہ سے ناراضی میں کی جائیں اُن کو سُن کر دادرسی کی جاسکے اہل عرب زمانہ جاہلیت میں اس بات کی جانب بہت التفات رکھتے تھے اور لوگوں کی فریادیں سُننے کے لئے باہم مخالفت کر لیتے تھے جیسا کہ اسلام سے پہلے قریش کے گھرانے نے کیا تھا یہ واقعہ اس طرح ہوا تھا کہ جس وقت قریش کے گھرانے میں سرداروں کی کثرت اور باہم کشمکش اور ایک دوسرے پر غالب آجانے کی کوشش میں زیادتی ہوئی تو ان کے بطون (گھرانوں) نے باہم جمع ہو کر اس بات پر ایک حلف اُٹھایا کہ ظلموں کو رد کریں اور ظالم سے مظلوم کا انصاف دلائیں اسی حلف کا نام "حلف الفضول" مشہور ہے، جو مکہ میں کیا گیا تھا اور اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۵ سال کی تھی اس اقرار کا موضوع یہ تھا کہ شہر مکہ میں جس شخص پر ظلم ہو اس کا انصاف کردیں اور حق دلادیں خلفائے اربعہ میں سے کسی نے مظالم (فریادیں) سُننے کے لئے کبھی اجلاس نہیں کیا اس لئے کہ اسلام کے صدر اول میں لوگوں کی یہ حالت تھی کہ خود ان کو انصاف پسندی حق بات کی جانب کھینچتی تھی یا وعظ و نصیحت ان کو ظلم سے مانع آیا تھا۔ مگر علیؓ کو اس قسم کا اجلاس کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی کہ وہ زبردست لوگوں کے ظلموں پر خیال کریں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات

بھی تھی کہ اس کام کی نوعیت اس زمانہ میں ایسی نہ تھی جیسی ان کے بعد ہوگئی علاوہ اس کے یہ بات بھی تھی کہ اُنھوں نے فریادیں سُننے کے لئے کوئی دن یا گھنٹہ مقرر نہیں کیا تھا بلکہ جس وقت کوئی شخص فریاد لے کر آجاتا تو فوراً اس کا انصاف کردیتے تھے مگر زمانہ مابعد میں فریادیوں کی باتیں سُننے اور اُن کے قصوں کا تصفیہ کرنے کے لئے ایک خاص دن مقرر کردیا گیا جس شخص نے سب سے پہلے اس شخص کا تعین کیا وہ عبدالملک بن مروان اموی تھا لیکن اس کی حالت یہ تھی کہ جس وقت اس کام میں اُسے کوئی مشکل پیش آجاتی اور یہ ضرورت پڑتی کہ کسی کو اس معاملہ میں حکم بنائے تو وہ مقدمہ اپنے قاضی "ابن ادریس ازدی" کے سپرد کردیا کرتا تھا گویا کہ ابن ادریس کام کرتا تھا اور عبدالملک صرف حکم سنادیا کرتا اور جس شخص نے پہلے پہل بذات خاص لوگوں کی فریادیں سُننے کا کام انجام دیا۔ وہ مشہور عادل خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اموی تھے اُن کے بعد سے عباسی حکومت کے آغاز تک پھر یہ دستور متروک رہا۔ البتہ فرمانروایان بنو عباس نے اس کو دوبارہ جاری کیا چنانچہ عباسیوں میں سے ابتداءً خلیفہ مہدی پھر خلیفہ ہادی پھر رشید اور اس کے بعد مامون نے سماعت مظالم کے لئے اجلاس کئے اور عباسی خاندان میں سب سے آخر میں جس حکمران نے یہ فرض انجام دیا وہ مہتدی بالله محمد بن الواثق تھا خلفاء اس اجلاس میں بڑے بڑے معزز لوگوں مثلاً گورنروں، اور عاملوں، اور خراج وصول کرنے والوں کے ہاتھ سے عام رعایا پر جو زیادتیاں ہو جاتی تھیں اُن کی شکائتیں سُن کر انصاف کیا کرتے تھے ایسے لوگوں میں جن کی شکایت خلفاء کے پاس کی جاتی تھی دفتروں کے عملہ والے اور خود خلفاء کی اولاد بھی داخل تھی، یہ لوگ عام رعایا کے وظائف جاری کرنے میں ان کو دق کرتے یا زبردستی کسی کا مال اُڑا لیتے، زمین غصب کرلیتے تو وہ مظلوم شخص خلیفہ کے پاس جاکر فریادی ہوتا تھا قاضی لوگ معاملات فیصلہ کرنے میں کسی قسم کی زیادتی یا کمی سے کام لیتے تو اس کا مرافعہ بھی خلفاء کے حضور میں کیا جاتا یا جو شخص خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا کسی پر ظلم کرتا تو ان سبھوں کی فریادیں دربار خلافت میں پیش ہوتی تھیں اور اُن پر مناسب منصفانہ احکام صادر ہوتے تھے۔

دیوان المظالم کی اہمیت

ان بات پر نظر کرنے سے خیال کیا جاسکتا ہے کہ دیوان المظالم کا دائرہ عدالت اپیل کی حدود سے بہت زیادہ وسیع تھا اور اس عدالت کی طاقت و قوت سب سے بالاتر تھی، نیز اس کے احکام بہت جلد نافذ

ہو جاتے تھے اس طرح سے جن استغاثوں کو سُنا گیا ہے اور لوگوں کی دادرسی کی گئی ہے۔ اس کی ایک مثال خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اموی کا یہ قصہ ہے کہ وہ ایک دن نماز پڑھنے کو جا رہے تھے یکایک راہ میں ایک یمن کا رہنے والا شخص اُن کے رُوبرو آکر فریادی ہوا۔ خلیفہ نے دریافت کیا کہ تجھ کو کیا شکایت ہے؟ اُس نے عرض کی "ولید بن عبدالملک نے میری اراضی غصب کر لی ہے"۔ عمر بن عبدالعزیز نے یہ سُنتے ہی حکم دیا۔ "مزاحم سے کہو کہ وہ صوافی کا رجسٹر میرے پاس لے آئے"۔ رجسٹر میں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس میں لکھا ہے "عبداللہ بن ولید بن عبدالملک نے فلاں شخص کی زمین ضبط کر لی ہے"۔ یہ بات معلوم کر کے خلیفہ نے حکم دیا کہ اس ضبطی کو دفتر سے نکال دو اور ولید بن عبدالملک کو فرمان لکھ دو کہ اس کی اراضی اُسے واپس دینے کے علاوہ جو اُس کا وظیفہ مقرر تھا اُسے دُگنا کر دے؟

مامون کا انصاف

مامون کا ذکر ہے کہ وہ شنبہ کے دن دربار عدالت منعقد کیا کرتا تھا ایک دن وہ اُس دربار سے اُٹھ کر چلا ہی تھا کہ ایک عورت میلے کچیلے کپڑے پہنے اس کو ملی اور فریاد کرنے لگی کہ آپ کے فرزند عباس نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ خلیفہ نے اپنے بیٹے کو اس کے برابر کھڑا کر کے اس کا انصاف کر دیا اور اس کی شکایت رفع کر دی خلیفہ مہدی کے بعد عباسی خلفاء میں سے پھر کسی خلیفہ نے بذات خاص مظالم کا فیصلہ کرنے کے لئے اجلاس نہیں کیا بلکہ اکثر یہ خدمت اپنے وزراء کے حوالے کر دیا کرتے تھے جس طرح مامون نے اپنے وزیر یحییٰ بن اکثم کو اور معتصم نے احمد بن ابی داؤد کو یہ خدمت سپرد کر دی تھی اور اس کے بعد جب کہ عباسی خلفاء پر سلاطین کا غلبہ ہو گیا تو وہ لوگ اس کام کو انجام دینے لگے؛

احمد بن طولون کی فریادرسی

ملک مصر میں جس شخص نے سب سے پہلے مظالم کے بارہ میں فکر کی وہ احمد بن طولون تھا جبکہ وہ ۲۵۶ھ میں مصر کا مستقل حکمران بن گیا تو ہفتہ میں دو دن اس غرض کے لئے دربار کیا کرتا تھا احمد بن طولون کے بعد اس کے جانشین حکمرانوں نے اس فرض کے ادا کرنے والے عہدہ دار مامور کئے یہاں تک کہ فاطمی خاندان کے حکمرانوں نے ملک مصر کو فتح کر لیا اور شہر "قاہرہ" کی تعمیر کے بعد فاطمی خاندان کے حکام بہت سرگرمی سے اس صیغہ کی جانب متوجہ رہے ان میں سے پہلا حاکم جس نے یہ کام انجام دیا وہ فاطمیوں کا مشہور جنرل "جوہر" فاتح مصر تھا وہ فریادیوں کی درخواستوں پر خاص

اپنے ہاتھ سے حکم لکھتا اور دستخط کیا کرتا تھا مگر جوہر کے بعد والے خلفاء نے یہ خدمت قاضی القضاۃ یا بعض اور بڑے بڑے ملکی عہدہ داروں کے سپرد کرنی شروع کردی فاطمیوں کی حکومت کمزور ہونے سے جب وہاں کے وزیر لوگ حکومت کے کاروبار میں خودسری برتنے لگے، تو مظالم کا صیغہ بھی انھیں کے قابو میں آگیا چنانچہ اس بارہ میں فاطمی خاندان کے وزیروں میں سے "امیرالجیوش" بہت مشہور گذرا ہے وہ بذات خاص استغاثوں کی سماعت کے لئے اجلاس کرتا تھا اور اس کے بعد آنے والے جانشینوں نے بھی اسی کی پیروی کی ان وزیروں کا دستور تھا کہ دربار کے دروازہ پر ایک منادی مقرر کردیتے جو آواز دیا کرتا تھا کہ فریادو! چلو اور اپنی درخواستیں گذرانو" یہ صدا سُن کر وہ لوگ حاضر ہوجاتے اور وزیر ان کے ساتھ انصاف کئے جانے کا حکم دیدیتا،

دارالعدل

حکومت مصر جب ایوبی سلاطین کے گھرانے میں آئی تو انھوں نے سماعت مظالم کے لئے ایک خاص مکان بنوادیا اور اس کا نام " دارالعدل" رکھا ایوبی سلاطین سے پہلے دمشق کے حکمران ملک عادل نورالدین زنگی نے بھی ایک اسی قسم کا دارالعدل بنوایا تھا اور یہ سلطان بھی ایوبیوں کی طرح کردی نژاد تھا ایوبی سلاطین دارالعدل میں صرف مظلوموں کی دادرسی کی غرض سے اجلاس کرتے تھے، غلام سلاطین بھی ایوبیوں کے بعد اسی طریقہ پر چلتے رہے ایوبی خاندان کے حکمرانوں اور غلام خاندان کے سلطانوں کو لوگوں کا انصاف کرنے میں بہت بڑی توجہ تھی وہ لوگ اپنے اس اجلاس کو بھی بہت احترام کرتے تھے جس میں دادرسی فرماتے تخت سلطنت کو خالی چھوڑ کر اسی کے برابر ایک کرسی پر جلوس فرماتے تاکہ ان کے پیر زمین سے سے ملے رہیں چاروں مذہبوں کے قاضی القضاۃ اُن کے داہنے ہاتھ کی جانب بیٹھتے اور بیت المال کا وکیل یا اور لوگ جو دوسرے عہدوں پہ مامور ہوتے اور حرس (سنتریوں کا دستہ) اور خاص درباری لوگ سلطان کے روبرو استادہ ہوتے انھیں لوگوں میں وہ شخص بھی ہوتا جو دادخواہوں کی عرضیاں پڑھ کر سلطان کو سناتا جاتا اور سلطان قاضیوں اور فوجی سرداروں سے جس چیز میں کچھ کہنا سننا ہوتا کہتا سنتا اور آخر میں اپنی رائے سے فیصلہ کردیتا،

مسلم سلاطین کا عدل وانصاف

مُسلمان سلاطین اور اُمرا اپنی رعایا کے مظالم سُننے میں نہایت توجہ کیا کرتے تھے اور

ان کی شکایتوں کے رفعدادمیں پوری کوشش سے کام لیتے خواہ ان کے اپنے ہی بیٹوں نے لوگوں پر ظلم کیا ہو اسلامی تاریخ میں ایسے واقعات کی بہت سی مثالیں موجود ہیں ، رعایا کو بھی اس بات کی عادت پڑگئی تھی کہ مقررہ دنوں میں اپنی شکایتیں اپنے خلفا اور سلاطین کے حضور میں گذرانیں وہ لوگ اسے ایک ضروری فرض خیال کرتے تھے اسی لئے اگر ایک دن یا کئی دن تک خلیفہ اجلاس عدالت نہ کرتا تو وہ رنجیدہ اور بددل ہو جاتے تھے بعض خلفاء کا یہ طریقہ تھا کہ وہ شکایتوں کی سماعت کو کئی حصوں میں تقسیم کردیتے تھے کوئی فرجی لوگوں کی شکایتیں سننے کے لئے مخصوص ہوتا کوئی عاملوں کی بداطواریاں معلوم کرنے کے لئے علیٰ ہذا ہر صیغہ کے افسروں کی شکائتیں باری باری سنی جاتی تھیں ،

محکمۂ احتساب

یہ بھی ایک دینی خدمت اور قضاء کی اقسام میں سے ہے صیغہ کا عہدہ دار یعنی (محتسب) نامشروع باتوں اور حرام چیزوں کا سراغ لگایا کرتا تھا اور اُن کے مرتکبوں اور استعمال کرنے والوں کو واجبی سزا اور تنبیہ کیا کرتا تھا محتسب کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ اہل شہر کو عام مصلحتوں کا پابند بنائے مثلاً راستوں کے تنگ کرنے سے لوگوں کو روکے اور جہازوں اور مزدوروں ...... پر زیادہ بوجھ لادنے سے منع کرے جن لوگوں کے مکانات گرنے کے قریب ہوگئے ہوں ان کو ہدایت کرے کہ وہ بنظر حفظ ماتقدم ان مکانوں کو منہدم کردیں تاکہ راستہ چلنے والوں کو اُن کے اچانک گرنے سے کوئی ضرر نہ پہنچے ، اگر مکتبوں کے معلم شاگردوں کو بہت ماریں تو اُن کے ہاتھوں پر لکڑیاں لگائے محتسب کو کھوٹی چیزوں کے پرکھنے اور ضروریات زندگی کے اندر ملاوٹ کرنے والوں یا ناقص اشیاء بیچنے والوں کو سزا دینے کا بھی اختیار تھا وہ باٹوں اور پیمانوں کو بھی جانچتا رہتا تھا غرض کہ جو امور آج کل (میونسپلٹی) کے فرائض میں داخل ہیں وہ سب محتسب کو حاصل تھے جن باتوں کا ہم نے ذکر کیا ہے دراصل تو وہ قاضی کے فرائض میں داخل ہونی چاہئیں تھیں لیکن انہوں نے قاضی کو بذات خاص ایسی باتوں کی تلاش و جستجو سے بچانے کے لئے یہ ایک مستقل عہدہ نکال دیا تھا اس کے علاوہ اکثر حالتوں میں جبکہ ملک مصر میں بنی فاطمہ کی حکومت تھی جو یہ عہدہ بھی قضا کے اعمال میں داخل رہ چکا تھا اور اندلس کے اموی حکمرانوں نے بھی یہی طریقہ برتا تھا مگر جب کہ سلطان کا منصب خلافت سے علیحدہ ہوگیا اور انتظامی معاملات

کی عام نگرانی اس کے قابو میں آگئی تو یہ محتسب کا وظیفہ ولایت (گورنری) کی خدمات میں داخل ہوگیا،

محتسب کے فرائض

محتسب کا عہدہ کسی مسلمان وجیہہ شخص کے سوا اور کو نہ ملتا تھا۔ کیونکہ یہ ایک دینی خدمت تھی صیغہ احتساب کا افسر تمام اطراف ملک میں اور صوبوں میں اپنی جانب سے نائبوں کا تقرر کیا کرتا تھا اور اس کا اجلاس جامع مسجد میں ہر روز ہوا کرتا تھا اس کے نائب پیشہ وروں اور تاجروں کے ہاں گشت لگایا کرتے تھے جو محتسب کہ ملک مصر میں تھا وہ ایک ایک دن باری باری قاہرہ اور فسطاط کی جامع مسجدوں میں اجلاس کرتا اور اپنے نائبوں کو ہر گلی کوچے میں اس غرض سے بھیجا کرتا تھا کہ وہ گوشت اور پلی ہوئی چیزوں کی جانچ کریں بار برداری کے جانور رکھنے والوں کی نگرانی رکھیں کہ وہ اپنے بے زبان خادموں پر اُن کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ لادنے پائیں۔ سقوں کو حکم دیں کہ وہ اپنی مشکوں کو ہتھیلیوں سے ڈھانک کر رکھیں۔ نیز سقوں کے واسطے ایک پیمانہ بھی مقرر تھا جس کی مقدار ۲۴ ڈول تھی اور ہر ڈول چالیس رطل کا ہوتا تھا ان کو یہ بھی حکم تھا کہ نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پاجامے پہنا کریں جو اُن کے ستر عورت کو بخوبی چھپائے رہیں، یہی محتسب کے نائب مکاتب کے اُستادوں کو ہدایت کیا کرتے تھے کہ بچوں کو سخت سزائے جسمانی نہ دیں اور انہیں اسطرح نہ ماریں کہ کہیں بے جا چوٹ لگنے سے وہ مرجانے کے قریب ہوجائیں اسی طرح عام معلموں کو یہی حکم سنا دیا جاتا تھا کہ وہ بچوں کو ذرا احتیاط سے سزا دیا کریں جو شخص بد معاملہ ہوتا اس کو بدی سے روکتے اور باٹوں، پیمانوں کو جانچتے محتسب کو کسوٹی گھر میں جانچ کرنے کا اختیار ہوتا تھا،

اندلس میں اس عہدہ کا نام "خطۃ الاحتساب" تھا اور اس کا متولی ایک قاضی ہوتا تھا اس ملک میں دستور تھا کہ جو قاضی محتسب ہوتا تھا وہ خود سوار ہو کر بازاروں میں گزرتا اس کے ماتحت سپاہی ہمراہ ہوتے اور ایک سپاہی کے ہاتھ میں وہ ترازو رہتی جس سے بازاری روٹیوں کا کم وبیش وزن جانچا جاتا تھا اسی طرح گوشت کا بھاؤ بھی ایک کاغذ پر لکھا رہتا تھا، قصاب کی مجال کیا تھی کہ مقررہ نرخ سے کم وبیش دے سکے۔ اگر وہ بد دیانتی کرتا تو چھپ نہ سکتی تھی۔ کیونکہ محتسب کسی چھوٹے بچہ کو قصاب کے پاس گوشت خریدنے بھیجتا اور جب وہ گوشت لے آتا تو اُسے تول کر دیکھتا کہ کم تو نہیں دیا اگر کم نکلتا تو اسی پر اندازہ کر لیتا کہ گاہکوں سے یہ ایسا ہی معاملہ کرتا ہوگا محتسب لوگوں کے احتساب

اوضاع میں کچھ خاص قوانین بھی تھے جن کو وہ اسی طرح پڑھتے اور مشق کرتے تھے جس طرح فقہاء احکام فقہ کا درس دیتے ہیں،

شرطہ یعنی پولیس شرطہ کا محکمہ بھی اصل میں فقہا کے تابع تھا کیونکہ اس سررشتہ سے مراد یہ تھی کہ قاضیوں کے احکام نافذ کئے جائیں ثبوت جرائم سے پہلے عبرت کے لئے سزاؤں کا تقرر۔ اور جو شخص جرائم کے ارتکاب سے باز نہ رہے اُسے سزا دینا یا تادیب کرنا وغیرہ بھی اسی صیغہ کے ذریعہ سے عمل میں آسکے اس لحاظ سے شرطہ کا محکمہ قضاء کا خادم تھا اور ملزموں پر جرم ثابت کرنے میں قاضی کی امداد کیا کرتا اور حکومت کو اس کے احکام نافذ کرنے میں مدد دیتا تھا۔ شرطہ کا افسر۔ زنا، اور استعمال مسکرات پر حد شرعی بھی قائم کیا کرتا تھا اور اس کے علاوہ بہت سے ایسے امور شرعی کو بھی انجام دیا کرتا تھا جن کے لئے قاضی کا اجلاس کھلا رہتا تھا اس کے بعد عباسی اندلس کی اموی اور مصر کی فاطمی حکومتوں میں جرائم کی سماعت اور ان کا فیصلہ اور حدود شرعی کا اجراء محکمہ شرطہ کے افسر کا فرض قرار پاکر قاضی کے حدود اختیارات سے نکال لیا گیا اور اس منصب کو بڑے بڑے سرداروں اور خاصہ کے لوگوں میں سے ذی عزت اشخاص کے لئے مخصوص کر دیا گیا اندلس میں شرطہ کی دو شاخیں کردی گئی تھیں، شرطہ صغریٰ اور شرطہ کبریٰ۔ شرطہ کبریٰ کا محکمہ خاص لوگوں سرداران قوم اور اہل مراتب سلطانی کے حلقہ میں اپنے اختیارات برتتا تھا اور استغاثوں میں شاہی خاندان کے لوگوں اور ذی مرتبہ نوابوں اور امیروں کو گرفتار کرنا۔ سزا دینا اسی محکمہ کے سپرد تھا۔ شرطہ صغریٰ۔ عام رعایا اور معمولی لوگوں کے معاملات کا نگراں رہتا تھا۔ شرطہ کبریٰ کے اعلیٰ افسر کے لئے سلطانی دربار کے دروازہ پر کرسی بچھتی تھی اور اس کے ماتحت لوگ بھی وہیں اس کے روبرو اپنے اپنے قرینے سے بیٹھتے تھے اور بلا اس کے حکم کے کوئی کام نہ کرتے تھے، اس افسر کی ولایت (عہدہ) وزارت یا حجابت کا ایک زینہ خیال کی جاتی تھی، مملکت اندلس میں صاحب الشرطہ کا نام حاکم شہر یا صاحب الیل بھی تھا سلاطین کے عہد حکومت میں صاحب شرطہ کو "والی" اور افریقہ کی گورنمنٹوں میں "حاکم" کہتے تھے اصل یہ ہے کہ شرطہ کا وجود عہدۂ قضا کے ساتھ ساتھ تھا۔ مگر بنی اُمیہ کے عہد حکومت میں وہ ایک علیحدہ صیغہ یا ممتاز عہدہ بن گیا، اس سے قبل وہ قضا کے ماتحت تھا،

دیوان الانشاء

کتابت ایام جاہلیت میں بہت تھوڑے اہل عرب لکھنے سے واقفیت رکھتے تھے ان کی کتابت عربی حروف میں نہ ہوتی تھی، جو ان دنوں مروج ہیں بلکہ وہ عبرانی خط میں لکھتے تھے جسے انھوں نے آداب معاشرت وغیرہ کے سلسلہ میں اہل یہود سے اقتباس کر لیا تھا جس شخص نے عبرانی خط میں عربی عبارت تحریر کی وہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی زوجہ بی بی خدیجہؓ کا ماموں زاد بھائی ورقہ بن نوفل تھا یا بعض اہل عرب نبطی خط میں لکھتے تھے جسے انھوں نے ان نبطیوں سے سیکھا تھا جو پہلی دوسری عیسوی صدیوں میں رومن قوم کے ظلم سے دق ہو کر ملک عرب میں بھاگ آئے اور آباد ہو گئے تھے ہمارے خیال میں یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ عربی خط اس نبطی خط سے نکلا ہے جس کی نقل ہم نے اس کتاب کے شروع میں دی اس خط اور عربی خط نسخ کی طرز و انداز میں ایک قسم کا تشابہ بھی پایا جاتا ہے کوفی خط کی نسبت معلوم ہوتا ہے کہ وہ "اشطرنجیلی" طرز تحریر سے نکلا ہے جو سریانی اور کلدانی اقوام عراق اپنی تحریر میں استعمال کیا کرتی تھیں اہل عرب نے جس وقت شروع میں اس خط کو اپنی لغت کی تحریر میں استعمال کیا تو اس کی کشش اور روش میں کچھ تبدیلی پیدا ہو گئی، اور رفتہ رفتہ اس کی یہ صورت ہو گئی جو آج موجود ہے ہمارے اس قول کی تائید یوں اور بھی ہو جائے گی کہ وہ ملک عراق کا خط ہے اور اس کا یہ نام اسلام کے بعد پیدا ہوا ہے کیونکہ کوفہ ان شہروں میں سے ایک مشہور شہر ہے جن کو مسلمانوں نے ملک عراق میں بسایا ہے جب مذہب اسلام کا ظہور ہوا ہے،

کاتبان رسول ان دنوں عربی خط میں لکھنے والے بہت تھوڑے آدمی تھے اور وہ سب نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے صحابی تھے ان میں عمر بن الخطابؓ علی بن ابیطالبؓ طلحہؓ۔ عثمانؓ۔ ابوسفیانؓ، اور ان کے دونوں بیٹے معاویہ اور یزید وغیرہ سب شامل ہیں علیؓ۔ عثمانؓ زیدؓ بن ثابتؓ اور عبداللہ بن ارقم ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں محرری کا کام انجام دیا ہے۔ کیونکہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے لکھا پڑھا کچھ نہ تھا ان

ہی لوگوں نے ان کے حکم سے قرآن شریف کی سورتیں اور وہ خطوط تحریر کیے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہان روئے زمین کے نام دعوت اسلام کی غرض سے ارسال فرمائے تھے بعض وہ اصحاب جو لکھنے سے واقف تھے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتی ضرورتوں میں تحریری کا کام کرتے تھے اور بعض لوگ اہل مدینہ کے خطوط وحسابات تحریر کیا کرتے تھے کچھ لوگ اس قسم کے تھے جو قوم کے بانیوں اور قبیلوں اور انصار کے گھرانوں کے مردوں اور عورتوں میں کتابت کرتے رہتے۔

کاتبان خلافت ابوبکرؓ کی خلافت ہوئی تو عثمان بن عفانؓ ان کے منشی تھے اور عاملوں اور فوج کے سرداروں کو خطوط لکھا کرتے تھے اسی وقت سے محرری بھی مناصب حکومت میں سے ایک ایسا منصب ہوگیا جو کسی حالت میں بغیر پُر ہوئے نہ رہتا تھا عمرؓ کے دور خلافت کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے ان کے کاتب (میر منشی) زید بن ثابت رہے اور ان کے بعد اور لوگ پھر جبکہ بہت سے شہر فتح اور دفاتر مرتب ہوگئے تو عمرؓ نے ہر ایک ولایت میں ایک ایک محرر مقرر فرمادیا جو اس ولایت کے دفتر میں تحریر کا کام کیا کرتا تھا ابتداء میں یہ محرر فوجی دفتر اور بیت المال کا حساب لکھا کرتے تھے، عثمانؓ اور علیؓ کے عہد تک جن کے بعد سے خلفاء راشدین کی خلافت کا خاتمہ ہوگیا ایک ہی محرر ہوا کرتا تھا جو فوجی عطیات کا حساب دفتروں میں درج کرتا، اور ان کے نام رجسٹروں میں مرتب رکھتا اور اس کے ساتھ ہی خطوط و فرامین لکھا کرتا تھا اور بعض اوقات دو بھی ہوگئے جن میں سے ایک بیت المال کا حساب لکھنے پر مامور ہوتا تھا۔ خلافت کا عہدہ بنی اُمیہ کے قابو میں آیا اور کاروبار حکومت بڑھے تو کاتبوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ اور کتابت کی پانچ قسمیں بن گئیں۔ (۱) عاملوں امیروں اور بادشاہوں وغیرہ کے نام خطوط اور فرمان لکھنے والا منشی (۲) محرر خراج، خراج کے داخل خارج کا حساب مرتب رکھتا تھا (۳) فوجی دفتر کا محرر۔ اس کا فرض یہ تھا کہ فوجی سپاہیوں کے نام ان کے چہرے مہرے (حلیے) ان کے درجے اور اُن کی تنخواہیں یا وظیفے اور اسلحہ وغیرہ کے اخراجات سب لکھا کرتا تھا (۴) محکمہ شرطہ کا محرر۔ یہ عقود (اقرار ناموں) اور خون بہائوں وغیرہ کے معاہدے اور بیانات لکھتا تھا۔ (۵) قاضی کا محرر جو شرطوں اور احکام کو قلم بند کیا کرتا تھا۔

دیوان الانشاء

جس کو ہم آج کل سکریٹریٹ آفس سے مشابہ کہہ سکتے ہیں اس دفتر میں متعدد اقسام کے انشاء پرداز (منشی) ملازم رہتے تھے شاہی خطوں اور فرمانوں کا لکھنے والا سب سے مقدم ہوتا تھا اور اس کو "کاتب" (راز نویس) بھی کہتے تھے یہ شخص خلیفہ کا دست و بازو اس کا پرائیویٹ سکرٹری اور اس کے اہم رازوں کا امانت دار رہتا تھا جس طرح ابی بکر صدیقؓ کے میر منشی عمرؓ اور عمرؓ کے "کاتب السر" عثمانؓ تھے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں خلفاء نے اس منصب کے نازک فرائض کو ملحوظ رکھ کر اسے سوا اپنے مخصوص لوگوں یا نہایت قریبی عزیزوں کے کسی اور شخص کے حوالہ نہیں کیا اور بنی عباس کے عہد تک اس امر کا خیال برابر قائم رہا ابتدائی حکومت میں بنو عباس کے کاتب خلیفہ سے اجازت لینے یا اس کے احکام کو نامناسب طرز سے لکھنے میں خیانت برتنے لگے تھے اس لئے آگے چل کر خلفاء عباسیہ نے یہ خدمت بھی وزیروں کے سپرد کر دی۔ مگر وزیر اپنے ہاتھ سے رقعے اور خطوط نہیں لکھتا تھا بلکہ وہ ان پر صرف دستخط کر دیا کرتا تھا جس طرح آج کل پرائیویٹ سکریٹری کیا کرتا ہے اور وزیر دستخط کر دیتا ہے عباسی خاندان کے وزیروں میں سب سے پہلے جس شخص نے فرمانوں اور خطوں پر دستخط کئے وہ یحییٰ بن جعفر برمکی تھا۔ جب خلیفہ رشید نے تمام کاروبار حکومت اس کے قبضۂ اختیار میں دے دیئے تو جس وقت کوئی شخص کوئی استغاثہ یا وظیفہ کی درخواست پیش کرتا یحییٰ اُس پر اپنے ہاتھ سے حکم لکھ دیتا اور یحییٰ کے بعد جس قدر وزیر ہوئے وہ سب رقعوں اور معروضات پر حکم لکھتے رہے، اور ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کوئی وزیر علیحدہ طور پر صرف "دیوان السر" یا دیوان الرسائل" یا انشاء" کی خدمت پر مامور ہوا ہو،

بنی عباس کے آخر عہد حکومت میں کتابت ایک مستقل عہدہ ہو گیا اور وزیروں کے علاوہ اس صیغہ کا ایک جداگانہ افسر متعین ہونے لگا یہ عہدہ دار بغداد ہی میں رہتے اور دارالانشا کے محرر کہلاتے تھے، ان کا افسر رئیس دیوان الانشاء یا صاحب دیوان الانشا یا کاتب السر کہلاتا تھا اور اُسے "دیوان العزیز" بھی کہتے تھے یہی افسر خلفاء کی جانب سے ہمعصر شاہان ممالک غیر کے نام خطوط لکھا کرتا تھا جس کی نظیر ان دنوں میں "نظارت خارجیہ" یا "بالعالی" ہے۔

توقیع

دوائر حکومت اسلامیہ میں آج کل توقیع سے دستخط مراد لی جاتی ہے مگر خلفاء کے عہد میں اس سے وہ عبارت مفہوم ہوتی تھی جو خلفاء درخواستوں یا استغاثوں پر اپنے قلم سے لکھا کرتے تھے جو کسی امر کی طلب یا شکایت سے متعلق ان کے حضور میں پیش ہوا کرتے تھے خلیفہ ان کاغذوں پر کوئی ایسی عبارت لکھ دیا کرتا جس کا اجرا لازم ہوتا یا جو مضمون درخواست کا جواب ہوتی جس کی مثال میں ہم مصری حکومت کی تاشیر" یا" تعلیم" کو پیش کرسکتے ہیں توقیع دیوان الانشا کے افسر کا خاص فرض تھا یا وہ شخص اس کام کو انجام دیتا تھا جو مخصوص طور پر اس کے لئے مامور ہوتا۔ فصل مقدمات کے وقت اور مجالس فرمانروائی میں کاتب (منشی) ہمیشہ خلیفہ یا سلطان کے روبرو حاضر رہتا تھا اور خلیفہ عرضداشتوں اور رقعوں کو دیکھ دیکھ کر اسے اس غرض سے دیتا جاتا تھا کہ وہ ان پر توقیع (حکم) تحریر کرتا جائے اور منشی اپنے امکان بھر نہایت بلیغ عبارتوں میں ان پر احکام لکھتا جاتا۔ توقیع کے واسطے اہل بلاغت اور اُستادانِ سخن کی کوئی عمدہ کتاب بطور نمونہ مقرر ہوتی تھی جس سے عبارت کا مقابلہ اور اُس کی درستی یا نادرستی کا اندازہ کیا جاتا تھا جعفر بن یحییٰ کا قاعدہ تھا کہ وہ خلیفہ رشید عباسی کے حضور میں بیٹھے بیٹھے تمام درخواستوں پر توقیع کرتا اور ان کو ان کے پیش کرنے والوں کی طرف پھینکتا جاتا تھا اور باوجود اس قدر عجلت سے جواب دینے کے اس کی توقیع کی عبارتیں اسالیب بلاغت اور تحصیل فنون میں بڑے بڑے بلیغ لوگوں کو نیچا دکھاتی تھیں یہاں تک کہ ان عبارتوں کی وجہ سے لوگوں کا بیان ہے کہ جعفر کی توقیع کی ہوئی درخواستیں ایک ایک دینار کو بکا کرتی تھیں،

صحیح احکام کے نمونے

صدر اسلام میں خلفاء بذات خاص درخواستوں اور استغاثوں پر توقیع کیا کرتے تھے یا اپنے منشیوں کو اُن کے مکمل اور مرتب کرنے کا حکم دیتے تھے ان کی توقیعات میں اکثر تو کسی آیت، حدیث، یا مشہور حکمت کا اقتباس ہوتا تھا ورنہ کوئی ایسا شعر جس کے معانی حکمت آمیز ہوں اس کی مثال یہ ہے کہ "سعید بن ابی وقاص" عراق کے عامل نے عمر بن الخطاب کو ایک تحریر اس غرض سے بھیجی کہ اُن سے ایک مکان بنوانے کی اجازت لے۔ عمرؓ نے اس تحریر کے نیچے یوں جواب لکھ دیا ابن ما یکنک من الہواجر واذی المطر یعنے ایسا مکان بنوالو جو تم مینہ اور آندھی کی تکلیفوں سے پناہ دے سکے، نیز عمرؓ نے اپنے عامل

عمرو بن العاص کو جو حاکم مصر تھے ان کے ایک خط کے جواب میں یوں لکھا تھا کن لرعیتک کما تحب ان یکون لک امیرک یعنے اپنی رعایا کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو جیسا کہ اپنے امیر سے اپنے واسطے چاہتے ہو کچھ لوگوں نے عثمان بن عفانؓ سے مروان بن حکم کے کسی حکم پر شکایت کی عثمانؓ نے اس درخواست پر تحریر فرمایا "فان عصوک فقل انی بریٔ مما تعملون" یعنے پھر بھی اگر وہ لوگ تیری بات نہ مانیں تو اُن سے کہدے کہ میں تمہارے معاملہ سے الگ ہوں اور اس کے بعد وہ درخواست مروان کے پاس بھجوادی، حضرت علی بن ابیطالب کی توقیعیں مشہور ہیں جن میں سے ایک عبارت یہ ہے جو انہوں نے اپنے فرزند "حسن" کے جواب میں لکھی تھی رای شیخ خیر من جلد غلام یعنے ایک بڈھے کی رائے نوجوان لڑکے کی جوانمردی سے بہتر ہے ایک بار سلمان فارسیؓ نے علیؓ کو لکھ کر دریافت کیا کہ "قیامت میں لوگوں سے حساب کیونکر لیا جائے گا حضرت علیؓ نے اس رقعہ پر لکھدیا "یحاسبون کما یرزقون" (جیسے رزق دیا جاتا ہے ایسے ہی حساب لیا جائے گا) معاویہ بن ابی سفیان کی توقیعیں حسب ذیل ہیں عبداللہ بن عامر نے امیر معاویہ سے بذریعہ تحریر درخواست کی کہ وہ ان کے لئے "طائف" کی آمدنی میں سے کچھ مال مدد خرچ کو مقرر کردیں۔ معاویہ نے اسی کاغذ پر حکم دیا رجباً ترَ عجباً (یعنے جب تک زندہ رہو تو پھر نتیجہ دیکھ لوگے) زیاد بن ابیہ نے معاویہ کو اس امر کی اطلاع دی کہ "عبداللہ بن عباس" تمہاری خلافت میں طعنہ زنی کرتے ہیں اور اس کو برا سمجھتے ہیں اس کے جواب میں معاویہؓ نے یوں لکھا۔ ان ابا سفیان و ابا الفضل کان فی الجاھلیۃ فی مسلاخ واحد و ذالک حلف لایحلہ (یعنے ابوسفیان اور ابو الفضل زمانہ جاہلیت میں ہم مشرب تھے اور یہ ایک ایسی قسم ہے جسے تمہاری بدخیالی نہیں توڑ سکتی) عبدالملک بن مروان نے اس تحریر پر جو حجاج بن یوسف عامل عراق نے اسے بھیجی تھی اور اس میں یہ لکھا تھا کہ اہل عراق بہت سرکشی کرتے ہیں اگر اجازت ہو تو ان کے چند اشراف کو قتل کردیا جائے۔ یہ جواب لکھا تھا۔ ان من یمن السائس ان یتألف بہ المختلفون ومن شومہ ان تختلف المؤتلفون (سیاست والے کی برکت کی یہ ہے کہ پراگندہ جماعت، کو اکٹھا کردے اور اس کی بدقسمتی یہ ہے کہ اکٹھوں کو علیحدہ علیحدہ کردے) اور ایک خط "جو اشعت" کے نام آیا تھا (اشعت وہ شخص تھا جو عبدالملک سے بغاوت پر آمادہ تھا) یہ لکھا:۔

فما بال من اسعیٰ لاجبر عظمۃ حفاظاً وینوی من سفاهتہ کسرہا

(یعنے اس شخص کا کیا حال ہے جو جبراً اپنی عظمت و عزت کا خواہاں ہو۔ حالانکہ کسریٰ شاہ فارس اپنی سفاہت کے باعث اس سے دُم دباتا ہو)

قتیبہ بن مسلم نے سلیمان بن عبد الملک کو خلافت سے معزول کر دینے کی دھمکی لکھی تو سلیمان نے اسی تحریر پر یوں لکھ دیا "زعم الفرزدق ان سیقتل مربعاً ؛ فابشر بطول سلامۃ یا مربع (یعنی کیا فرزدق نے یہ گمان کیا ہے کہ مربع قتل کیا جاوے گا۔ لیکن تو مربع کی سلامتی کی خوش خبری دے کہ اس کی نیک عادت کے باعث کوئی اسے قتل نہیں کر سکتا) اور جبکہ قتیبہ نے دوبارہ اسے دھمکی آمیز تحریر بھیجی تو اس کے اوپر یہ عبارت لکھ دی "وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً" (یعنے اگر تم صبر و تقویٰ سے کام لو تو اُن کے فریب تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے)، عمر بن عبد العزیزؒ کے کسی عامل نے اُن کو ایک عرض داشت بھیجی جس میں ایک شہر کی مرمت کے لئے اجازت طلب کی تھی اس درخواست کے آخر میں عمر بن عبد العزیز نے حسب ذیل توقیع لکھی ابنھا بالعدل ونق طرقھا من الظلم (یعنے شہر کی مرمت عدل سے کرو اور اُن کے رستوں کو ظلم سے پاک صاف کر دو) عمر بن عبد العزیز کے عامل نے جو ملک عراق پر مامور تھا ان کو اس بات کی شکایت لکھی کہ میرے ملک کے باشندے سرکشی کرتے ہیں اس کا جواب یہ دیا، ارض لھم ما ترضی لنفسك وخذ بجرا ئمھم لعد ذالک (یعنی تو ان کے لئے انہیں باتوں سے راضی ہو جن باتوں سے تو اپنے لئے راضی ہوتا ہے اور ان کے بعد بھی جرائم ان کی گرفت کر) عمر بن عبد العزیز کی توقیعیں بکثرت تھیں، یزید بن عبد الملک نے ایک شخص کے رقعہ پر جس نے اس کے کسی عامل کی شکایت کی تھی، لکھا تھا وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ (یعنے جن لوگوں نے ظلم کئے ہیں انھیں عنقریب معلوم ہو جاوے گا کہ کیسی جگہ لوٹ کر ان کو جانا ہے)"

عباسی خلفاء کے مختصر احکام

بنو عباس کی توقیعات کے نمونے ہم ذیل میں دکھاتے ہیں۔

شہر "انبار" کے کچھ لوگوں نے خلیفہ سفاح عباسی کی خدمت میں اس بات کی شکایت لکھی کہ ان مکانات چھین کر اس عمارت میں داخل کر دیئے گئے ہیں جس کی تعمیر کا حکم خلیفہ نے دیا ہے اور اُن

کو ان مکانوں کی قیمتیں نہیں ملیں اس درخواست پر "سفاح" نے حسب ذیل توقیع لکھی تھی "ھذا بناء اسس علی غیر تقوی" یعنی یہ ایسی عمارت ہے جس کی بنیاد پرہیزگاری پر نہیں رکھی گئی ہے اور حکم دیا کہ ان لوگوں کے مکانات کی قیمتیں دے دی جائیں۔ کوفہ کے لوگوں نے ابوجعفر منصور خلیفہ عباسی سے اپنے عامل کی بدمعاملگی کا شکوہ کیا، منصور نے ان کی عرضداشت پر لکھ دیا تھا "کما تکونوا یوم علیکم" جیسے تم ہوگے ویسے ہی تم پر حکومت ہوگی) اور ایک شخص کی درخواست پر جس نے ناداری وافلاس کی شکایت کی تھی یہ لکھا۔ سل اللہ من رزقہ (خدا سے رزق مانگ) منصور کے پاس اس کے ایک عامل کا خط آیا" جو حمص" پر متعین تھا اس خط میں کہیں کچھ لکھنے میں غلطی ہوگئی تھی منصور نے اس کے نیچے یہ عبارت لکھدی، استبدل بکاتبک والا استبدل بک (اپنے محرر کو بدل دے ورنہ میں تجھے بدل دوں گا) آرمینہ کے حاکم نے خلیفہ مہدی کو اپنی رعایا کی سرکشی کی شکایت لکھی مہدی نے اسی عرضداشت پر لکھ دیا خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجاہلین (عفو کی خو اختیار کر امر بالمعروف کرتا رہ اور جاہلوں سے روگردانی کر) کچھ لوگوں نے مہدی سے اس بات کی شکایت کی کہ اس کا وہ عامل جو خراسان میں ہے کام میں سستی کیا کرتا ہے مہدی نے اُن لوگوں کے شکایت نامہ پر لکھ دیا انا ساھر وانت نائم" (یعنے میں جاگتا ہوں اور تو سوتا ہے) اور اسے اس عامل کے پاس بھیج دیا ہارون الرشید عباسی نے اپنے عامل خراسان کو لکھا تھا" داو جرحک لا یتسع" (اپنے زخم کی دوا کرو کہ بڑھنے نہ پائے) اور عامل مصر کو لکھا۔ احذران تخرب خزانتی وخزانتہ اخی یوسف فیاتیک منہ مالا قبل لک بہ ومن اللہ اکثر منہ (خبردار کہیں اپنا اور میرے بھائی یوسف کا خزانہ برباد نہ کر ڈالیو۔ پس اس طرح تجھے اس سے وہ کچھ ملے گا جواب تک نہیں ملا تھا اور اللہ تعالے سے اور بھی زیادہ ملے گا) ابن ہشام نے مامون الرشید خلیفہ کو کسی معاملہ کی شکایت لکھی جس پر مامون نے تحریر کیا من علامۃ الشریف ان یظلم من فوقہ ویظلمہ من فوقہ فای الرجلین انت (شریف کی ایک علامت یہ ہے کہ ظالم بنے اس طرح پر کہ زبردست پر ظلم کرے یا مظلوم بنے اس طرح پر کہ زبردست کا ظلم سہے) پس تو ان دونوں شخصوں میں سے کونسا ہے؟) اسی نمونہ پر خلفاء کی تمام توقیعات کو قیاس کر لینا چاہیے۔

امراء کے فصیح جوابات

اس کے علاوہ توقیع کا دستور صرف خلفاء کے واسطے مخصوص نہ تھا بلکہ امیروں اور بڑے بڑے لوگوں میں بھی اس کا رواج تھا جیسے زیاد بن ابیہ ابی مسلم خراسانی اور جعفر بن یحییٰ برمکی آخر الذکر کی توقیعات بلاغت کے اعتبار سے بہت مشہور اور مقبول ہوتی تھیں، جس کا اوپر بیان ہو چکا ہے اُس نے ایک قیدی کی درخواست پر لکھا تھا، و لکل اجل کتاب اور ایک عرضداشت پر جو کسی عامل کی شکایت میں گذری لکھا تھا لقد کثر شاکوک وقل شاکروک فاما اعتدلت واما اعتزلت (یعنی تیرے شاکی بہت ہیں اور شکر گذار کم پس یا تو اعتدال اختیار کر ورنہ معزول کر دیا جائے گا) اور ایک شخص کے رقعہ پر جس نے سفر حج کی اجازت مانگی تھی یہ لکھا "من سافر الی اللّٰہ انجح" (جو اللہ کی طرف سفر کرے وہ نجات پائے گا) اور ایک شخص کی درخواست پر جو کسی ولایت (گورنری کا) خواہشمند تھا لکھا۔ کلا اولی البعض الظالمین بعضاً (میں ظالموں کو ظالموں پر ولی بنانا نہیں چاہتا) اور ایک شخص کو یہ جواب لکھا تھا۔ جبکہ وہ بارہا اس سے بہت کچھ انعام و عطیات لے چکا تھا اور پھر اس نے طلب کیا دع الضرع یدر لغیرک کما در لک (جب تو نے فائدہ اٹھایا ہے دوسروں کو بھی فائدہ اُٹھانے دے) اور بھی بہت سی قابل قدر عبارتیں ہیں جن کا بیان علاوہ طوالت کے مناسب مقام بھی نہیں ہے اور فضل بن سہل اور طاہر بن حسین وغیرہ کی بھی اسی طرح کی توقیعات موجود ہیں۔

مختصر نویسی

اہل عرب مسلمانوں کو مراسلات لکھتے وقت اختصار کرنے کے بارہ میں عجیب قسم کا شوق تھا جو بلاغت کے لئے ایک قابل تقلید امر ہے اس کی مثال عمر بن الخطابؓ کی وہ تحریر ہے جو انھوں نے اہل مدینہ کے قحط سے تنگ آجانے پر گیہوں اور غلہ کی امداد طلب کرنے کے واسطے عمرو بن العاص عامل مصر کو لکھی تھی انھوں نے لکھا من عبد اللّٰہ امیر المومنین الی العاصی بن العاصی سلام امابعد فلعمری یا عمرو ما تبالی اذا شبعت انت ومن معک ان اھلک انا ومن معی فیا غوثاہ ثم یا غوثاہ (عبد اللہ امیر المومنین کی جانب سے عاصی بن عاصی کو بعد سلام واضح ہو کہ مجھے قسم ہے اپنی زندگی کی اے عمرو کہ تو اور تیرے ساتھی تو شکم سیر ہوں اور میں اور میرے ساتھی جو تیرے اہل ہیں بھوکے رہیں فریاد! فریاد! عمرو بن العاص

نے اس کا جواب یوں دیا۔ لعبد اللہ امیر المؤمنین من عبد اللہ عمرو بن العاص اما بعد فیا لبیک ثم یا لبیک قد بعثت الیک بعیر اولہا عندک و اخرہا عندی والسلام (خدا کے بندے امیر المومنین کو عمرو بن عاص کی جانب سے ہم نے تیری فریاد سنی اور تیری طرف ایک قافلہ اونٹوں کا بھیجا ہے جس کا ایک سرا تیرے پاس ہے اور دوسرا ہمارے پاس) ان کی بہت سی مثالیں ان کے مراسلات میں پائی جاتی ہیں جو ادب کی کتابوں میں تلاش کرنے سے ملیں گی،

اختصار کا یہ طریقہ صرف اُن کے، اور اُن کے عاملوں کے مابین ہونے والی خط و کتابت پر منحصر نہ تھا بلکہ تمام لوگوں سے مراسلت رکھنے میں وہ اسی انداز کے پابند رہتے تھے اس کی مثال میں ہارون الرشید خلیفہ کا وہ جواب پیش کرنا کافی ہے جو اُسے نقفور (نیسوفورس) رومی شاہنشاہ کو دیا تھا قیصر مذکور نے خلیفہ موصوف کے نام ایک نامہ بھیج کر اُسے دھمکی دی تھی اور مطالبہ کیا تھا کہ مجھ سے پہلے جو ملکہ (امپرس) روم کی حکمران تھی اس سے جس قدر خراج تم نے وصول کیا ہے وہ مجھ کو واپس بھیج دو ورنہ تمہاری خیر نہیں خلیفہ رشید اس خط کو پڑھتے ہی غصہ سے کانپنے لگا۔ اور جوش و غضب میں آپے سے باہر ہو کر قلم دوات اُٹھا اسی کی پشت پر لکھا بسم اللہ الرحمن الرحیم من ہرون امیر المؤمنین الی نقفور کلب الروم قد قرأت کتابک یا ابن الکافرۃ والجواب ما تراہ لا ما تسمعہ .... امیر المومنین ہارون کی جانب سے روم کے کتے نقفور کے نام اے کافرہ کے بچے میں نے تیرے خط کو پڑھا اور تیری باتوں کا جواب یہی ہے جو تو دیکھتا ہے نہ کہ وہ جو تو نے سُنا ہوگا) ایسا ہی بلکہ اس سے بھی مختصر جواب مراکش کے حکمران یوسف بن تاشفین نے افرنج تاجدار از فونش کو دیا تھا کیونکہ اُس نے ایک طویل تحریر میں اسے بہت کچھ ڈرایا دھمکایا تھا ملک یوسف نے خط پڑھنے کے بعد اس کی پشت پر لکھ دیا۔ الذی یکون ستراہ یعنے جو کچھ ہونے والا ہے وہ خود تم بہت جلد دیکھ لوگے،

خلفاء کی مکاتبت

خلفاء کی خط و کتابت میں جن قواعد کا لحاظ رکھا جاتا تھا ان میں سے ایک اہم امر یہ تھا کہ وہ لوگ اپنے مخاطب کا ذکر کرنے سے قبل ابتداء اپنے ذکر کے ساتھ کرتے تھے اور جو لوگ ان کے کاتب ہوتے اُن پر فرض ہوتا تھا کہ اس بات کو خوب خیال رکھیں اس کا نمونہ ان تحریروں میں دکھایا جا چکا ہے جو خلیفہ عمر بن الخطاب ؓ اور

عمرو بن العاصؓ عامل مصر کے مابین ہوئیں گویا کہ اس قاعدہ سے خلاف ورزی نا قابل معافی گنا تھا جن اسباب نے منصور عباسی کو ابی مسلم خراسانی کے قتل پر آمادہ کیا بحالیکہ عباسی حکومت جس قدر اس کی زیر بار احسان تھی وہ لوگوں سے مخفی نہیں پھر بھی منجملہ اور امور کے ایک یہ بات بھی تھی کہ ایک مرتبہ اُس نے خلیفہ منصور کو عرضداشت لکھتے ہوئے پہلے اپنا ذکر کر دیا تھا اس لئے اگر بعض مراسلتوں میں اس قاعدے کے خلاف صورت نظر آتی ہو تو اُسے کتاب لکھنے والوں کا سہو سمجھنا چاہیئے۔

بنو لویہ کے اختیارات بڑھنے کے زمانہ تک یہی حالت قائم رہی مگر جب ان لوگوں کی قوت زیادہ ہو جانے سے یہ لوگ خلافت کے کاروبار میں دخیل ہو چلے، اور خلفاء کو دبانے اور مسلوب الاختیارات بنانے لگے۔ تو اس وقت سے خلفاء نے حجاب میں رہنا شروع کر دیا اور اب اُن کی طرف سے سوا فرمان حکومت اور سند سلطنت کے جو دیگر ممالک کے فاتح لوگوں اور حکمرانوں کے نام دربار خلافت سے عطا ہوتی تھی اور کوئی چیز نہ لکھی جاتی تھی خط و کتابت کے اکثر شعبے وزیروں کے حوالہ ہو گئے اور اب یہ صورت قائم ہو گئی کہ جس وقت خلیفہ کے ذکر کی ضرورت پڑتی۔ تو مواقف المقدسہ، مقامات الشریفہ، سدۃ النبویہ، دارا لعزیزہ اور المحل المجید وغیرہ الفاظ سے کنایتہً ان کا ذکر کر دیا جاتا تھا مواقف کے لفظ سے وہ جگہیں مراد ہوتی تھیں جن میں خلیفہ ٹھہرتا یا کھڑا ہوتا اس کے بعد امیروں، اور وزیروں کے لئے مجلس عالی الحضرۃ السامیہ، ایسے ہی اور تعظیمی الفاظ کا رواج ہوتا گیا۔

اشارہ یا رمز مسلمانوں نے مکاتبات میں جو تفنن کئے ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ بات بھی تھی کہ صرف ایک حرف کے ذریعہ سے کسی بڑی عبارت کی جانب اشارہ کیا کرتے تھے، جیسا واقعہ کہ سلطان محمود ابن سبکتگین غزنوی کو پیش آیا، اس سلطان نے مستقل سلطنت قائم کرنے کے بعد خلیفہ بغداد کو ایک نامہ لکھا، جس میں اس بات کی آرزو ظاہر کی کہ خلیفہ اس کے نام کو خطبہ میں داخل کر کے پڑھے اور سکوں پر بھی اس کا نام مضروب کرائے، خلیفہ اس بات سے منکر ہوا تو محمود نے طیش میں آکر اس کو ایک خط لکھا جس میں بہت دھمکیاں دی تھیں منجملہ اور باتوں کے ایک یہ بات بھی لکھی تھی کہ "اگر میں ارادہ کروں کہ بغداد کے پتھروں کو

ہاتھیوں پر لاد کر غزنی میں لے آؤں تو یہ کام کر سکتا ہوں" خلیفہ نے اس طویل الذیل تحریر کے جواب میں جو خط بھیجا وہ محمود کے سامنے آکر کھولا گیا۔ محمود اس بات کو دیکھ کر سخت حیرت زدہ رہ گیا کہ خط میں کوئی عبارت نہیں لکھی، صرف شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے اس کے بعد ایک الف ممدودہ (آ) اور خط کے بیچوں بیچ میں لام (ل)، اور آخر میں میم (م) تحریر ہے' اور اس کے بعد صلوٰۃ و حمد خدا ہے، سلطان اور اُس کی مجلس کے لوگ بہت حیران ہوئے اور اس تحریر کا کچھ مطلب نہ سمجھ سکے یہاں تک کہ علامہ ابوبکر قہستانی جو اس زمانہ کا بڑا ذی علم شخص تھا اور محمود کے دربار کی زینت' دربار میں داخل ہوا اور اُس نے دیر تک خط کو غور سے دیکھ کر آخر کار اس کا مطلب پالیا، ابوبکر نے سلطان سے کہا "میں اس کا مطلب جانتا ہوں" سلطان نے حکم دیا "بیان کرو" اور اس کے صلے میں تم جو مانگو گے ملے گا" ابوبکر نے کہا "تم نے خلیفہ کو جو تحریر لکھی تھی اس میں اس کو دھمکی دی تھی کہ میں تم پر ہاتھی لے کر فوج کشی کروں گا اس کے جواب میں خلیفہ نے یہ خط لکھا ہے اور اس میں الف لام میم تحریر ہے ان حروف مقطعات سے اُس نے خداوند پاک کے ارشاد۔ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ کی جانب اشارہ کیا ہے۔ سلطان اس بات کو سن کر کانپ گیا اور اُسے بدفالی خیال کر کے اپنی حرکت پر نادم ہو گیا اور اس کے بعد حسن سلوک کے سوا کبھی کوئی بدخیال خلیفہ کی بابت دل میں نہ لایا۔

سدید الملک کا قصہ

اسی قبیل کی ایک اور حکایت بھی ہے جو سدید الملک علی بن مقلد" حاکم قلعہ شیرز کو پیش آئی تھی یہ شخص نہایت دلیر جنگجو اور فطانت میں مشہور پانچویں صدی ہجری کے وسط میں گذرا ہے، شخص مذکور قلعہ شیرز کا مالک ہونے سے قبل حلب کو بہت آیا جایا کرتا تھا ان دنوں حلب کا والی تاج الملوک محمد بن صالح تھا اتفاقاً سدید الملک اور تاج الملوک کے مابین کوئی ایسی بات آپڑی جس کی وجہ سے اول الذکر آخر الذکر کی جانب سے خائف ہو گیا اور اسی خوف میں طرابلس شام کی جانب نکل گیا اُس زمانہ میں طرابلس کا حکمران جلال الملک بن عمار تھا۔ سدید الملک اس کے یہاں مقیم ہو گیا تاج الملوک کو یہ خبر ملی تو اُس نے کسی حیلہ سے سدید الملک کو اپنے ہاں بلانے اور اس کے ساتھ فریب کرنے کا قصد دل میں کر کے اپنے کاتب ابی النصر محمد بن الحسین کو اشارہ کیا کہ سدید الملک

کو ایک شوقیہ خط جس میں اس سے ملنے اور اس کے اپنی جانب مائل کرنے پر زور دیا گیا ہو لکھ کر اُسے یہاں بلائے ابوالنصر اصل غرض کو سمجھ گیا اور اُسے معلوم ہو گیا کہ یہ خط کیوں لکھا جاتا ہے چونکہ وہ سدید الملک کا دلی دوست تھا اس لئے وہ دل سے تو خواہاں تھا کہ سدید الملک یہاں نہ آئے مگر حکم سے انکار بھی نہ کر سکتا تھا۔ خط لکھنا ضروری تھا بہر حال اُس نے تاج الملوک کے حکم کی تعمیل کی اور جیسا مضمون اُس نے بتایا تھا ویسا ہی خط لکھ کر تیار کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ لکھتے لکھتے ایک مقام پر "انشاء اللہ تعالےٰ" کے فقرہ تک پہنچا تو اُس نے نون کو تشدید اور فتحہ دیکر "اِنَّ" بنا دیا اور خط روانہ کر دیا سدید الملک کو خط پہنچا تو اُس نے پڑھ کر اُسے ابن عمار حاکم طرابلس کی خدمت میں پیش کیا اُس وقت دربار لگا ہوا تھا، ابن عمار اور اس کے خواص نے خط کی عبارت بہت پسند کی، اور تاج الملوک کا وہ شوق جو اُس نے سدید الملک سے ملنے اور اُسسے تقرب سے سرفراز کرنے کی بابت ظاہر کیا تھا عظمت کی نگاہ سے دیکھا۔ سدید الملک نے ان لوگوں کی بات سن کر کہا میں تو اس خط میں ایک ایسی بات دیکھتا ہوں جو تم کو ہرگز نظر نہیں آتی، اس کے بعد سدید الملک نے موقعہ اور مناسبت کا لحاظ کر کے خط کا جواب لکھ دیا ۔ ۔ ۔ اور جہاں اور باتیں لکھی تھیں ایک فقرہ یہ بھی تحریر کیا "انا الخادم المقر بالانعام" اور انا کے ہمزہ کو کسرہ اور نون کو تشدید و فتحہ دے دیا جس کی وجہ سے یہ لفظ۔ اِنَّا ہو گیا جب یہ خط تاج الملوک کے پاس پہنچا اور ابونصر کاتب اُس پر واقف ہو گیا تو اُسے بہت مسرت ہوئی اُس نے اپنے دوستوں سے تذکرہ کیا کہ مجھ کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ میری تحریر سدید الملک کے سمجھ میں آگئی، ابونصر نے "اِنَّ" کے نون کو مشدد بنا کر اُس سے آئیۃ ان الملاء یاتمرون بک لیقتلوک کی جانب اشارہ کرنے کا قصد کیا تھا جس کے جواب میں سدید الملک نے اسے نون "انا" کو مشدد اور ہمزہ کو کسور کر کے "اِنَّا" لکھا اور اس سے اس آیت انا لن ندخلها ابدا ما داموا فیها کی طرف اشارت کر دی"۔

عضد الدولہ کی تحریر

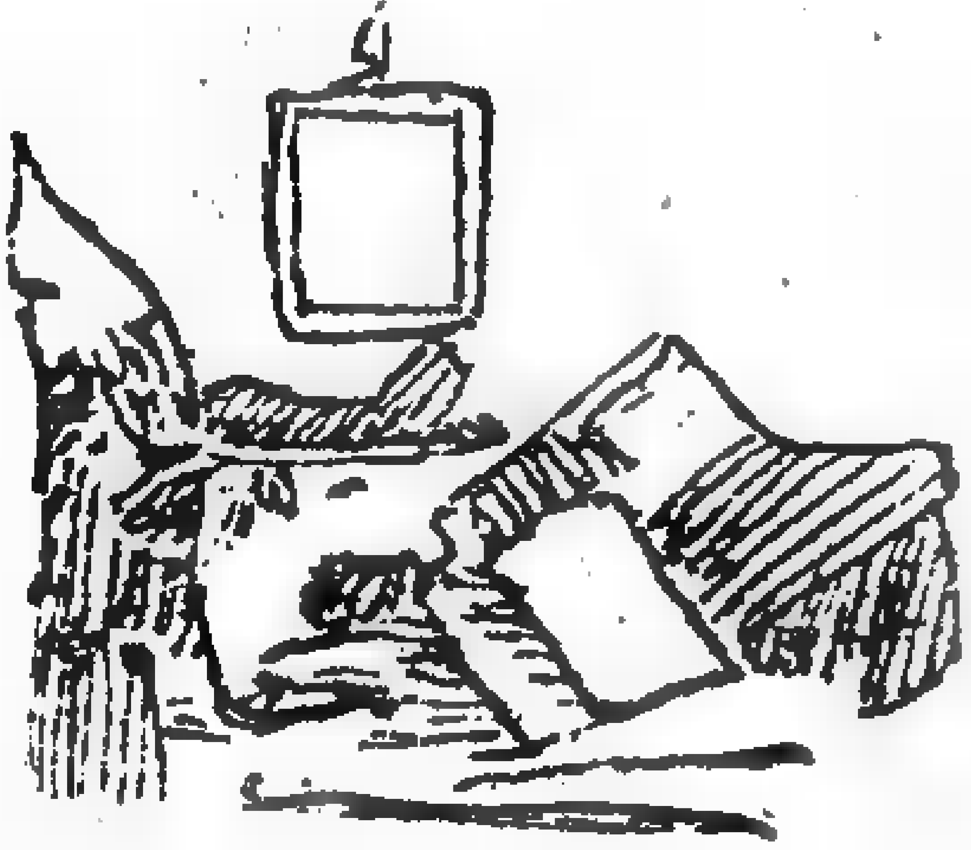
اسی قسم کے تفنن کی ایک اور مثال وہ تحریر ہے جو "عضد الدولہ بویہ" نے "ابی منصور افتکین" والئے دمشق کو بھیجی تھی۔ افتکین نے عضد الدولہ کو لکھ بھیجا تھا کہ شام کا ملک دشمنوں سے صاف ہو چکا اور میرے

قبضہ میں آگیا حکمران مصر کا اب یہاں کوئی اثر باقی نہیں رہا ہے اگر تم مال اور سامان سے مجھ کو مدد دو گے تو میں دشمنوں سے خاص اُن کے ملک میں جا کر لڑنے کے لئے مستعد ہوں گا ۔"

عضد الدولہ نے اس خط کا جواب ایسے متشابہ الخط کلموں میں لکھا جو بلا نقطہ دیئے اور منضبط کرنے کے پڑھے نہ جا سکتے تھے اور اس تحریر کا نمونہ یہ ہے عزك عزك قصار فصار ذالك ذالك فاحش فاحش فعلك فعلك بهذا عضد الدولہ کی اس قسم کی تحریر سے مراد یہ تھی کہ مبادا یہ خط کسی غیر کے ہاتھ میں جا پڑے اور وہ اصل مدعا پر واقف ہو جائے ۔ افتکین اس کے مدعا کو سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہوا ۔

تحریر کے آلات اور سامان

اہل عرب قلم "نے" کا بناتے تھے جس طرح آج کل ہم بناتے ہیں باقی رہی روشنائی سو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی کوئلہ کو باریک پیس کر کاجل سا بنا لیتے تھے جس میں کوئی چپکنے والی شے مثل گوند وغیرہ کے ملا دیتے تھے ۔



کاغذ کے متعلق سب سے قدیم چیز جس کو اہل عرب نے آغاز اسلام سے لکھنے میں استعمال کیا وہ "رِق" یعنے پتلی پتلی کھالوں کے ٹکڑے تھے اور اس کے علاوہ کپڑوں پر بھی لکھا ہے جن میں سب سے زیادہ مشہور ملک مصر کا بنا ہوا "قباطی" نام ایک کپڑا تھا اور اسی کپڑے پر اسلام سے قبل "معلقات سبعہ" لکھے گئے تھے اور جب مذکورہ بالا چیزوں کا ملنا دشوار ہوتا تھا تو وہ لوگ لکڑی کے تختوں، چوڑی ہڈیوں ٹھیکریوں

لہ اہل عرب کی زبان آوری مشہور ہے اسلام سے قبل ان کے نزدیک فخر و مباہات کی صرف دو چیزیں تھیں نسب اور زبان شعر لئے عرب جو قصائد نظم کرتے تھے اور اُنکے بےمثل ہونے کا فیصلہ ہوتا تھا وہ قصیدے لکھ کر خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیئے جاتے تھے ظہور اسلام کے وقت سات قصیدے مشہور شاعروں کے لٹکائے جا چکے تھے، اور وہی قصائد معلقات سبعہ کے نام سے مشہور ہیں ۔

یا پتھروں وغیرہ پر بھی لکھ دیا کرتے تھے"

جب مسلمانوں نے ملک مصر کو فتح کیا تو انھوں نے "بردی" (پابیروس) کو تحریر کے مصرف میں لے لیا چنانچہ اموی خاندان والوں کی اکثر تحریریں پابیروس اور قباطی پر لکھی گئی ہیں قاہرہ میں خدیوی کتب خانہ کے اندر کچھ آثار عربی خط میں لکھے ہوئے موجود ہیں جو قسطر مصری کے بعض اطراف میں دستیاب ہوئے ہیں ان میں ہم نے ایک صفحہ پابیروس کا اور ایک قطعہ قباطی کا دیکھا ہے اگرچہ یہ پرچے پرانے ہونے کے باعث جابجا سے گل گئے ہیں تاہم لکھائی اُن پر صاف ظاہر ہے اس کے علاوہ ہم نے "قحار" کا بھی ایک قطعہ دیکھا جس پر عربی کتابہ موجود ہے ان سب کتابوں میں قدیم سے قدیم تحریر بھی پہلی صدی ہجری کے آخری زمانہ سے قبل کی نہیں ہے اور یہ سب خدیوی کتب خانہ کے بڑے ہال میں لوگوں کے دیکھنے کے لئے لگے ہوئے ہیں"



(عربی تحریر کپڑے پر دوسری صدی ہجری کے اوائل میں لکھی ہوئی)

چنانچہ اکیسویں شکل میں ایک عربی خط دکھایا گیا ہے جس کی بابت گمان ہے کہ دوسری ہجری کے آغاز میں لکھا گیا تھا یہ عبارت کپڑے پر لکھی گئی ہے اور لندن کے برطانی عجائب خانہ میں محفوظ رکھی ہے۔

کاغذ کا استعمال

عباسی حکومت کا دور شروع ہونے کے بعد اہل عرب نے کاغذ کا استعمال شروع کیا فضل بن یحیٰی برمکی نے اس کی جانب رہنمائی کی اور مسلمانوں

نے کاغذ سازی کو رواج دیا، گمان غالب یہ ہے کہ اہل عرب نے کاغذ بنانے میں چینیوں کی شاگردی کی ہے کیونکہ چینی لوگ ولادت مسیح سے قبل کاغذ کی ساخت میں اُستادی کے پایہ پر پہنچ گئے اور مشہور ہو چکے تھے اور یہ صناعت اُن کے ملک میں پھیلی ہوئی تھی مسلمانوں نے سمرقند کا شہر فتح کیا تو وہاں کے لوگوں سے یہ ہنر سیکھا لیکن اس کے فروغ دینے اور کام میں لانے کی طرف عباسی عہد حکومت میں متوجہ ہوئے اور وہ بھی اس وقت جبکہ خطوط مراسلات اور اقرار ناموں وغیرہ کے لکھنے کی کثرت سے کھالوں کا دستیاب ہونا مشکل ہو گیا ایسے وقت میں فضل برمکی نے کاغذ بنانے کا حکم نافذ کیا اور مسلمانوں نے بغداد اور شام وغیرہ مقامات پر اس کے کارخانے کھول دیئے جو کہ ان دنوں اسلامی حکومت کے پایۂ تخت تھے کاغذ بنانے کی صناعت کو دنیا میں پھیلانے کے متعلق مسلمان لوگ گر یکتائی کا دعویٰ کریں تو زیبا ہے اس لئے کہ ان کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں معلوم ہوتا جس نے اس دستکاری کو رواج دیا ہو اور نیز اس بات سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے کہ جس وقت وسطی صدیوں میں اہل یورپ غفلت کی گہری نیند سے بیدار ہوئے تو اُنھوں نے ملک شام کا بنا ہوا کاغذ استعمال کیا جس کا نام ان کی زبان میں تھا۔

کاغذ بنانے کی صنعت یورپ میں اندلس (سپین) کے راستہ سے داخل ہوئی کیونکہ شاطبہ بلنسیہ اور طلیطلہ وغیرہ مقامات میں کاغذ سازی کے بڑے بڑے اسلامی کارخانے موجود تھے، چنانچہ جب اندلس کا ملک افرنجی لوگوں کے قبضہ تصرف میں آیا، تو انھوں نے ان کارخانوں کو قائم رکھا اور اس کے بعد یہ صنعت سپین سے تمام یوروپین ملکوں میں پھیلتی گئی عربی خط میں کاغذ پر لکھی ہوئی چیزوں کا سب سے قدیم نمونہ کتاب "غریب الحدیث" کا ایک نسخہ ہے جو لیڈن کے "مکتبہ جامعہ" میں محفوظ ہے اور گمان کیا جاتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے آغاز میں لکھا گیا تھا اور ایک کتاب "دیوان الادب" برٹش میوزیم لنڈن کے کتب خانہ میں پائی جاتی ہے جو چوتھی صدی ہجری کے شروع میں لکھی گئی ہے"

حجابت

اسلامی حکومتوں کے حاجب سے وہ عہدہ دار مراد ہے جس کو آج کل "تشریفاتی" سے

تعبیر کرتے ہیں اور تشریفاتی آتے کہتے ہیں جو امراء بادشاہوں و سلطانوں کے حضور میں لوگوں کی حاضری کی اجازت حاصل کرتا اور بعد اجازت انھیں ملاقات کے لئے پیش کرتا ہے تو یہی بہت بڑا عہدہ سمجھتے کیونکہ اس عہدہ دار کا ہونا لازمی ہے جس جس طرح سے حکومت مدنیت اور عیش و عشرت میں ترقی کرتی جاتی ہے اسی طرح رفتہ رفتہ اس کے بادشاہ اور رعایا کے مابین گہرے پردے قائم ہو جاتے ہیں خلفائے راشدین کا دستور تھا کہ ان کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے رہتے تھے وہ فقیر اور مالدار کمزور اور زبردست سب سے یکساں بلا کسی حجاب یا وقت کے گفتگو کیا کرتے تھے۔

مگر جب کہ خلافت کا سلسلہ مالگذاری سے بدل گیا تو ہو تی نئی آئین حکومت میں داخل ہوئیں منجملہ ان کے ایک بات حجاب میں دقتیں پیدا کرنا اور لوگوں کو خلفاء کے حضور میں درجوں مرتبوں اور خاندانوں اور نسبوں کے اعتبار سے بار ملنا بھی تھا سب سے پہلے جس خلیفہ نے اس بات کا خیال قائم کیا وہ امیر معاویہ بن ابی سفیان تھے، ان کو زیاد بن ابیہ ان کے مشیر خاص نے اس طرف توجہ دلائی تھی ان کے وقت میں صرف اس قدر امتیاز قائم ہوا تھا کہ خلیفہ کے دربار میں سب سے پہلے اہل بیوتات یعنی بڑے عالی نسب لوگوں کو بار ملتا تھا اور جب باریاب ہونے والوں کے نسب برابر ہوتے تو عمر کو فضیلت دیا کرتے تھے اور سن و سال کی برابری میں علم و ادب کو مایہ الامتیاز ٹھہراتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی چار شخصوں کو عام حکم تھا کہ وہ جس وقت چاہیں، خلیفہ کے پاس چلے آئیں وہ چار شخص حسب ذیل تھے،

بلا اجازت آنے والے

(۱) موذن (۲) رات کو گشت کرنے والا افسر جو کہ عام محافظت کا ذمہ دار تھا (۳) سرحدی افسر کا قاصد اور (۴) خوان سالار دکھانا کھلانے والا شخص جو خلیفہ کو کھانا دیتا تھا) چنانچہ اسی امر کی تشریح زیاد کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو اس نے اپنے حاجب سے کہا تھا اور وہ یہ ہے۔ میں نے تجھ کو اپنے حاجب کی خدمت حوالہ کی ہے مگر چار شخصوں پر تجھے کوئی اختیار نہیں ایک تو نماز اور فلاح میں خدا کی طرف پکارنے والا اس کو میرے پاس آنے سے نہ روکنا تجھ کو اس پر کوئی حق نہیں اور دوسرے رات کو گشت کرنے والے کو بھی نہ روکنا کیونکہ ضرور وہ کوئی خبر لیکر آیا ہوگا، اگر اچھی خبر،

ہوتی تو ایسے وقت میں نہ آتا اور تیسرے سرحدی قاصد کو نہ روکنا کیونکہ اس کو مجھ تک آنے میں ایک ساعت کی دیر لگنے سے ایک سال کا کام بگڑ جائے گا لہذا اگر میں اپنے لحاف میں بھی ہوں تو اسے میرے پاس بھیج دینا اور چوتھے داروغہ مطبخ کو نہ روکنا۔ کیونکہ جس وقت کھانے کو دوبارہ گرم کیا جاتا ہے تو وہ بگڑ جاتا ہے،

عباسی دور کے حجابات

بنی عباس کی حکومت آئی اور اُس کو ترقی ہوتے ہوتے مشہور عظمت و کامرانی کا دور نصیب ہوا تو ان لوگوں نے رعایا کے خلیفہ سے ملنے جلنے میں اور بھی زیادہ روک ٹوک کی البتہ جب کوئی سخت حاجت یا ضروری کام ہوتا تو اس کی دوسری بات تھی ابن خلدون نے اس حجاب کا نام "حجاب ثانی" رکھا ہے۔ بنو عباس کے عہد میں رعایا اور خلیفہ کے مابین دو دربار قائم ہو گئے ایک تو دربار خاص اور دوسرا دربار عام ہر ایک گروہ حاجب کی رائے اور تجویز کے مطابق ایک دربار میں خلیفہ کی حضوری کا شرف پاتا تھا بنو عباس اپنی حکومت کمزور ہونے کی حالت میں ایک تیسرا حجاب بھی اختیار کیا تھا جو پچھلے دونوں حجابوں کی نسبت کہیں زیادہ پائدار اور گہرا تھا یہ حجاب صرف اسی صورت میں ہوتا تھا جبکہ خلیفہ پر وزیروں اور (سلطانوں) کی جانب سے دباؤ زیادہ پڑنے لگتا تھا اور وہ گویا ایک طرح سے قیدی یا نظر بند کر دیئے جاتے تھے اس کی صورت یہ تھی کہ جس طرح ارکان دولت خاندان خلافت کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو خلیفہ بنا کر ان پر دباؤ ڈالے رکھنا چاہتے تھے تو سب سے پہلے اس بات کا انتظام کرتے تھے کہ ان کے خاندان والے اور اُن کے اولیا اُن سے نہ ملنے نہ پائیں اور اپنی اس غرض کو مخفی رکھنے کے لئے ان کم فہم خلفاء کو یہ پٹی پڑھا دیتے تھے کہ ان لوگوں میں ملنے جلنے میں ہیبت خلافت زائل ہو جائیگی اور اُنکے مؤدب رہنے کی عادت جاتی رہیگی، یہ حالت عباسی دور حکومت میں پیدا ہو گئی تھی اور قاعدہ کی بات ہے کہ ہر سلطنت کے آخری زمانہ میں جب اُسکے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے،

نقابت

نقابتہ جو اشراف کی نقابت ہوتی تھی اس کا نام نقابت اشراف اس لئے رکھا تھا کہ اسکو اشراف مسلمانوں کے

ساتھ تعلق تھا جو کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اہلبیت سے تھے یہ بات یوں تھی کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کنبہ اوائل اسلام میں اس وجہ سے کہ اُن کا زمانہ نبوت سے بہت قریب تھا قابل تعظیم و تکریم مانا جاتا تھا۔ مسلمانوں کا دستور تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کے اہنی افراد میں سے ایک شخص کو رئیس یا سردار بنا دیتے جو اپنے کنبہ کے معاملات کو درست ان کے نسب ناموں کو منضبط اُن کی ولادتوں اور فوتیوں کو مرتب رکھتا اور ادنیٰ پیشوں میں مصروف ہونے سے اُنکو الگ رکھتا تھا بدعادتوں کے اختیار کرنے اور گناہوں کے ارتکاب سے روکتا رہتا تھا اور اُنکے حقوق کا مطالبہ کیا کرتا خود ان لوگوں کو دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی ہدایت کرتا رہتا اور مال غنیمت اور فئی کی آمدنی میں سے ذوی القربیٰ کا جو حصہ نکلا کرتا تھا حکومت سے اس کا مطالبہ کرکے حاصل کرنے کے بعد ان کے مابین تقسیم کردیا کرتا ان کی لڑکیوں کو اس بات سے باز رکھتا کہ وہ ہم کفو کے سوا غیر کفو سے نکاح کریں اسی طرح کی اور باتیں جو ضمانت عامہ سے مشابہ ہوتی تھیں اس کے ذمہ واجب تھیں گویا کہ اشرف کا نقیب اُنکا وصی ہوا کرتا تھا

اشراف کی نقابت نہایت معزز منصب تھا اور بلحاظ شرف کے ان کی شان بعد از خلیفہ سب سے اول تھی اسی وجہ سے اشراف کے نقیب رضی نے ایک قصیدہ میں خلیفہ قادر باللہ عباسی کو مخاطب کرکے یوں کہا ہے۔

عطفا امیر المومنین فاننا	امیرالمومنین ہم پر مہربانی کی نظر رکھئے اسی لئے کہ ہم اور
فی دوحۃ العلیاء لا نتفرق	آپ عالی خاندانی میں جدا جدا نہیں ہیں،
ما بیننا یوم الفخار تفاوت	فخر کرنے کے دن ہم میں اور آپ میں کوئی تفاوت نہیں ہے
ابدا کلانا فی المعالی معرق	ہم دونوں معالی (بلند مرتبوں) میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں،
الا الخلافۃ میزتک فاننی	مگر خلافت نے تجھ کو ممتاز بنا دیا ہے اس لئے کہ بیشک میں
انا عاطل منھا و انت مطوق	اس سے عاری ہوں اور تم کو خلافت کا طوق نصیب ہے،

خلفاء اشراف کے نقیبوں کے لئے ایسے عہدنامے اور فرمان سرداری لکھا کرتے تھے جن کے حرف حرف سے اُنکی جلالت و عظمت مرتبہ کا اظہار ہوا کرتا تھا اور اکثر حج کے زمانے میں آب زمزم پلانے کی خدمت اور دیوان المظالم (عدالت مرافعہ) کے مثل اعلیٰ مناصب اُن کے حوالہ کرتے تھے اسلامی حکومتیں اپنی تواریخ کے تمام دوروں میں نقابہ اشراف کی تعظیم و تکریم کرتی رہیں یہاں تک کہ موجودہ عثمانی (ٹرکی) حکومت بھی اس بات کا پورا لحاظ رکھتی ہے اس حکومت میں نقیب اشراف ہی وہ شخص ہے جو تمام رسمی اعزازوں میں دولت علیہ کے سارے عہدہ داروں پر فوقیت رکھتا ہے یہاں تک کہ اس کا رتبہ وزیر اعظم اور شیخ الاسلام سے بھی بڑھ کر ہے،

صوفیہ طریقوں کے مشائخ

یہ ایک دینی منصب ہے جو وجود صوفیہ کے بعد رائج ہوا ہے اس منصب کا پانے والا صوفیہ کے تمام طریقوں پر کلام کر سکتا ہے صوفیہ کرام کے طریقوں میں یہ دستور ہے کہ ہر طریقہ کا ایک شیخ ہوتا ہے اور دیگر گاؤں اور بستیوں میں اسکے خلفاء ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک خلیفہ کے بہت سے مرید ہوا کرتے ہیں یہ شیخ خلیفہ لوگوں کے معاملات کا انتظام کرتا ہے اور خلفاء عام مریدوں کی دیکھ بھال رکھتے ہیں یعنے انکو ہدایت وارشاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، مراقبہ اور ترتیب کرتے رہتے ہیں بہ شیخ المشائخ جو شخص ہوتا ہے وہ سب کے اوپر والی عام ہونے کا حق رکھتا ہے جس وقت تک صوفیوں میں عام مشیخت کا دستور نہ تھا اس وقت تک ان کا ہر ایک گروہ مستقل بالذات اور اپنی افراد کا حاکم تھا مگر اس کی وجہ سے یہ قباحت آپڑی تھی کہ اس کے مختلف گروہوں میں باہم آتش فتنہ وفساد برپا رہتی تھی کیونکہ کوئی عام شیخ تو تھا نہیں جس کے زیر حکم سب فرقوں کے لوگ ہوں گو مختلف طریقوں سے ایک کام کرتے ہوں، لیکن اصل سب کی ایک ہو جس کے سبب سے کوئی معاملہ متنازعہ فیہ پیش آجانے کے وقت ایک حکم کی جانب کر کے باہمی جنگ وجدل سے باز رہیں لہذا اسکی ضرورت تھی کہ کوئی اعلیٰ پایہ اس طریق میں قائم ہو جس کے سامنے سب کی گردنیں خم رہیں، چنانچہ جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے سعید السعداء کی خانقاہ قائم کی اور اس کا "دویرۃ الصوفیہ" نام رکھا تو وہاں کے شیخ کو دوسرے مشائخ پر مقدم اور افسری کی امتیازی حیثیت دیدی، سلطان صلاح الدین کا دستور تھا کہ سلطنت کے بڑے بڑے رکنوں کے اور کسی کو اس عہدہ پر مامور نہ کیا تھا مثلاً شیخ الشیوخ ابن حمویہ کی اولاد کو جنکو وزارت امارت انتظام سلطنت اور فوجی افسری کے اہم کاموں کی ذمہ داری بھی سپرد تھی چنانچہ دوی الریاستین وزیر صاحب تقی الدین عبدالرحمن بن بنت الاعز وغیرہ کے مثل لوگ اس عہدہ شیخ الشیوخ پر مقرر کئے گئے اور یہ حالت برابر اس وقت تک قائم رہی جبکہ نویں صدی ہجری کے اندر ملک مصر میں صوفیہ کرام کی واحد ریاست قائم ہو گئی اور اسکی ولایت سید محمد شمس الدین بکری کے حوالہ ہوئی جو اپنے زمانہ میں علم اور دین دونوں کے اعتبار سے بڑے کامل تھے شعرانی اُن کے بارے میں یوں لکھتے ہیں۔ کہ اگر میں انکو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا عالم کہوں تو کچھ خلاف نہ کہوں گا، شیخ موصوف کے بعد انکے بیٹے امام شیخ الاسلام مشہور مفسر ابو السرور البکری جانشین ہوئے اور اُن کے بعد یہ منصب انہیں کے گھرانے اور اولاد میں منتقل ہوتا رہا۔ اور آجتک برابر یہ منصب "بکری صدیقی" کے ہی گھرانے میں قائم ہے جو ملک مصر کا مشہور خاندان ہے

تمدنِ اسلام

حصہ اوّل

مترجمہ
محمد حلیم انصاری ردولوی

مصنفہ
علامہ جرجی زیدان

جس میں اسلامی سلطنت کی یوماً فیوماً وسعت پذیر ترقی کے ساتھ انتظامِ ملکی، مالی اور فوجی کی تاریخ اور اسکے تمول تمدن اور شان و شوکت کی تفصیل محققانہ طور سے درج ہے

شیخ شوکت علی اینڈ سنز تاجرانِ کتب
بند روڈ۔ کراچی

قیمت:- آٹھ روپے پچیس پیسے